جنگل اداس ہے
اے حمید

محبت کی خوشبوؤ!
محبت کی مسکراہٹو!
اے سورج کے جلال!
اے تاروں بھری رات کے ملکوتی حسن!
سری لنکا کی بارشو!
ساحل سمندر کے ناریل کے درختو!
مولسری کے پیڑوں میں ہوا کے گیتو!
میں تمہیں الوداع کہتا ہوں

بہار کے موسم میں جب آم کے پیڑوں پر بور آتا ہے اور فضا مولسری اور شہتوت کی میٹھی خوشبوؤں سے لبریز ہو جاتی ہے تو چاندنی رات سچے گلابوں کے کھیت میں نرم پاؤں رکھ کر گذرتی ہے۔ تب ویران حویلیوں میں سنگ مرمر کی جالیوں کے پیچھے

خواب میں دیکھے ہوئے چہرے اپنی جھلک دکھاتے ہیں اور خاموش دالانوں میں گذری ہوئی محبتوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ اس وقت میں ایک باغ کو یاد کرتا ہوں۔ اس باغ کا نام کمپنی باغ تھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی نہر بہتی تھی۔ اس نہر کی ایک جانب آم کے درختوں نے آدھی نہر پر اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ دوسری جانب نشیب میں آلوچوں اور ناشپاتیوں کے باغ تھے۔ بہار کے دن آتے تو آلوچوں کی چھڑیوں ایسی اوپر کو اٹھتی ہوئی شاخیں گلابی پھولوں سے بھر جاتیں۔ یہ آج سے پچاس برس پہلے کے زمانے کے زرد اور سرخ آلوچوں کے پیڑ تھے۔ یہ آلوچے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ ان کے دس بارہ فٹ اونچے درختوں کی ٹہنیاں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور ان پر چھوٹے گلابی پھول لگتے تھے۔ ان درختوں کے پھولوں اور پتوں کو ناک کے بالکل قریب لا کر سونگھیں تو ان میں سے آلوچوں کی کھٹی خوشبو آتی تھی۔ ناشپاتی کے درختوں پر گلابی اور سفید دونوں طرح کے پھول کھلتے تھے۔

گرمیوں کی راتوں میں جب آسمان پر چاند نہیں ہوتا تھا تو اس نہر کا رستا پانی دھندلا نظر آتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر کمپنی باغ میں سناٹا چھایا رہتا تھا۔ میری عمر اس وقت نو دس سال کی تھی۔ کمپنی باغ کے درختوں اور کیاریوں میں کھلے ہوئے گیندے کے بسنتی پھولوں اور ندی کے بہتے پانی کی سرسراہٹیں مجھے اپنے مکان سے کھینچ کر منہ اندھیرے اپنے پاس لے آتیں۔ میں کمپنی باغ والی نہر کے کنارے پتھر کی اس سل پر بیٹھ جاتا جہاں دن کے وقت عورتیں کپڑے دھویا کرتی تھیں۔ نہر پر جھکے ہوئے آم کے درختوں پر بور آیا ہوتا۔ اس میں سے شہد ایسی شیریں خوشبو نکل رہی ہوتی۔ باغ کی طرف سے ہوا آتی تو اس خوشبو میں گلاب مولسری اور موتیے کی خوشبوئیں بھی شامل ہو جاتیں۔ نہر کا پانی خاموشی سے بہہ رہا ہوتا۔ آسمان پر چاندنی کے سائے جیسے جھک کر ندی کی سرگوشیاں سن رہے ہوتے۔ نہر کے پانی کی ایک خاص سرسراہٹ ہوتی تھی۔ یہ صرف اس وجہ سے سنائی دیتی تھی کہ باغ میں بڑی گہری خاموشی چھائی ہوتی تھی۔ نہر کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس کی گیلی خوشبو ہوتی تھی۔ آلوچوں کے باغ کے پیچھے امرودوں کے باغ تھے۔ کسی وقت ان کی طرف سے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا آتی تو مجھے کچے امرودوں کی مہک محسوس ہوتی۔

میں چہرہ اٹھا کر درختوں کی شاخوں میں سے نظر آتے ستاروں کو تکنے لگتا۔ میرا دل خدا کی محبت سے لبریز ہو جاتا۔ جس نے اتنے شان و شوکت والے ستارے، اتنے نر

و نازک گلاب، مولسری اور گیندے کے بسنتی پھول بنائے تھے۔ یہ محبت میں نے خود پیدا نہیں کی تھی۔ یہ محبت بھی اسی خدا نے میرے دل میں پیدا کر دی تھی جس سے میں محبت کرتا تھا۔ کاش! میں نو دس سال کی عمر میں ہی اپنی ساری زندگی گذار دیتا۔ جب میرا معصوم دل جنگلوں، بارشوں، پھولوں، دریاؤں اور سمندروں کی عظمتوں والے اپنے خدا کی محبت میں اتنا لبریز تھا کہ یہ پیمانہ قدم قدم پر چھلک جاتا تھا لیکن انجانی آزمائشیں میرے انتظار میں گھات لگائے بیٹھی تھیں۔ جن لوگوں سے ملنے کا میں کبھی طالب نہیں ہوا تھا۔ جن کے چہرے میں کبھی نہیں دیکھنا چاہتا تھا وہ میری عمر کے ماہ و سال کی ہر منزل پر میری راہ دیکھ رہے تھے۔ مجھے امتحان میں ڈالا گیا۔ میں نے صرف موسموں، بارشوں، درختوں اور چاندنی راتوں کے پچھلے پہر کھلنے والے موتیے، گلاب اور گیندے کے زرد پھولوں کا درس لیا تھا۔ میں نے ناریل، آم اور نیم کے درختوں کی کتابیں پڑھی تھیں لیکن مجھے امتحان کے کمرے میں بٹھا کر میرے آگے دنیا داری کا پرچہ رکھ دیا گیا۔ میں اس امتحان میں فیل ہو گیا لیکن خدا کا شکر ہے کہ خالق کائنات کی محبت کے پرچے میں میری کمپارٹ آ گئی۔ میں اپنے خدا سے بچھڑ ضرور گیا مگر اس کا حسین ترین، روشن ترین اور جلال و جمال والا خیال میں نے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ میرے گناہ اور لوگوں کے ہجوم میرے اور میرے خدا کے درمیان حائل ہو گئے لیکن میں پاکیزہ محبتوں کے جلال و جمال کے خیال کو سینے میں روشن کئے زندگی کے سفر پر رواں رہا۔ اس ہجوم میں کبھی کبھی کوئی حسین نورانی چہرہ اپنی ایک جھلک دکھا کر مجھے خدا کی یاد دلا کر غائب ہو جاتا۔ جیسے کالے سیاہ بادلوں میں بجلی چمک کر غائب ہو جاتی ہے۔ میں ایسے ہی نورانی چہروں اور حسین جذبوں کی کہانی لکھنے بیٹھا ہوں۔ یہ کوئی افسانہ یا افسوں نہیں ہے۔ میں اپنی زندگی کے واقعات بیان کروں گا مگر ان محبتوں کا ذکر لکھوں گا جن کے چہرے بجلی کی طرح چمک چمک کر اندھیرے میں مجھے راہ دکھاتے رہے۔ میں اپنی نفرتوں اور گناہوں کے جہنم کا در نہیں کھولوں گا۔ ان ٹھنڈوں ہواؤں کا ذکر کروں گا جو اس آگ میں مجھے میری فردوس گم گشتہ کی یاد دلاتی رہیں اور یہ خیال میرے دل میں ڈالتی رہیں کہ میرا اصل مقام دوزخ نہیں جنت ہے۔

اگر میں ہوا بن سکتا تو نسیم صبح کے ساتھ جنگلوں، وادیوں میں سے گذرتا اور اپنی داستان کے دردناک گیت بن کر درختوں، پھولوں اور دریاؤں کو سناتا۔ اگر میں درخت ہوتا تو شام کے وقت اپنے جنگلوں کو واپس جانے والی ہوائیں میری داستان غم

سن کر آہیں بھرتی میری شاخوں میں سے گذرتیں لیکن نہ میں ہوا ہوں نہ درخت ہوں۔ میں بیتے ہوئے دنوں کے اداس نغموں کو الفاظ میں ڈھال کر' انہیں کاغذی لباس پہنا کر سطروں کی حوالات میں قید کر رہا ہوں۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔

میں اپنی گم شدہ محبتوں کی داستان ایک پہاڑی کالج میں آتشدان کے پاس بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ آتشدان میں رات کی جلائی ہوئی آگ مدھم پڑ گئی ہے۔ میری پرانی جاپانی چینک میں سری لنکا کی چائے دم ہو رہی ہے۔ خالی پیالی میری میز پر سامنے پڑی ہے۔ میری زندگی کا سارا سرمایہ یہی ایک چینک 'ایک پیالی' کچھ کتابیں اور ایک پرانا پائپ ہی باقی رہ گیا ہے۔ ایک دوست نے مجھے برٹش تمباکو کا ڈبہ دیا تھا۔ اس تمباکو میں سے دیودار کے درختوں کی خوشبو آتی ہے۔ جب میں اسے پائپ میں سلگا کر پیتا ہوں تو دیودار کے گھنے جنگلوں سے آنے والی ہوائیں میرے قریب سے ہو کر گذرتی ہیں۔ میرا پائپ اور ماچس بھی میرے سامنے پڑے ہیں۔ میں جس کھڑکی کے پاس بیٹھا یہ داستان لکھ رہا ہوں اسے میں نے بند کر رکھا ہے۔ پہاڑوں پر یہ ستمبر کے اخیر کے دن ہیں اور خزاں آلود سرد ہوائیں چل رہی ہیں۔ کھڑکی کے شیشے میں سے مجھے چنار کے درختوں میں سے گذرنے والی پہاڑی پگڈنڈی پر درختوں کے زرد اور سرخ پتے گرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ یہ خزاں نصیب پتے خزاں کی سرد ہواؤں کے ساتھ کچھ دور تک اڑتے چلے جاتے ہیں۔ بند کھڑکی میں سے مجھے کسی وقت سرد ہواؤں کا ہلکا ہلکا شور سنائی دیتا ہے۔ یہ شور بلند ہو کر دور چلا جاتا ہے۔ جہاں یہ پہاڑی کالج ہے اس طرف کوئی نہیں آتا۔ یہ پہاڑی کی چوٹی پر ہے۔ میرے سامنے کی جانب چناروں کے تختے' چھوٹے چھوٹے نشیب' گھاٹیاں اور پہاڑی چشمے ہیں۔ کالج کے عقب میں پہاڑی ڈھلان ہے جس پر اگے ہوئے چیڑھ کے درختوں کی قطاریں نیچے وادی تک اترتی چلی گئی ہیں۔ کالج کی دائیں جانب بڑی بڑی چٹانیں ہیں جن کا رنگ بارش' دھوپ اور برفباریوں کی وجہ سے سیاہ پڑ گیا ہے۔ ان چٹانوں کے درمیان چھوٹا سا نیم ہموار میدان ہے۔ یہاں 1857ء کے زمانے میں انگریزوں کا قبرستان ہوا کرتا تھا۔ کچھ ٹوٹی پھوٹی قبریں جھکی ہوئی سیاہ صلیبوں کے ساتھ اب بھی نظر آتی ہیں۔ ان قبروں پر خشک گھاس اگی ہوئی ہے۔ آدھی صلیبیں سرکنڈوں میں چھپ گئی ہیں۔ کبھی صبح اور کبھی شام کے وقت میں قبروں کی طرف نکل آتا ہوں اور ان میں آسودہ خاک میتوں کی مغفرت کے لئے اللہ تعالیٰ کے حضور دعاگو ہوتا ہوں۔ ان قبروں کے کتبے بھی ٹوٹ پھوٹ گئے ہیں۔ انگریزی میں لکھے ہوئے نام بڑی مشکل سے

پڑھے جاتے ہیں۔ صرف ایک قبر پر انگریزی حروف میں لکھا ہوا نام جولیانہ پرکنز صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کے نیچے 1859ء کا سن لکھا ہے۔

مجھے قبرستان میں ہمیشہ ایک اداس رومانیت کا احساس ہوتا ہے۔ قبرستان شاید اسی لئے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ مجھے کسی قبرستان سے کبھی خوف محسوس نہیں ہوا۔ اپنے شہر امرتسر کے قبرستان میں میں رات کے وقت بھی چلا جاتا تھا۔ صرف اس خیال سے کہ شاید کسی مردے کی روح سے میری ملاقات ہو جائے۔ کسی روح سے ملنے کی میری ہمیشہ سے خواہش رہی ہے۔ جس کالج میں میں اپنی زندگی کے ایک خاص پہلو کی یادداشتیں لکھ رہا ہوں یہ ایک کھنڈر بن چکا ہے۔ صرف یہی ایک کمرہ کسی حد تک سلامت رہا ہے جس کو میں نے اپنا ٹھکانہ بنایا ہوا ہے۔ میں اسی کمرے کے فرش پر رات کو سو جاتا ہوں۔ ہفتے میں ایک بار نیچے چھوٹے سے پہاڑی قصبے میں جا کر کھانے پینے کی مختصر چیزیں لے آتا ہوں اور پھر یہاں سے کہیں نہیں جاتا۔ کالج جیسا کہ میں لکھ رہا ہوں پہاڑی کی چوٹی پر ہے اور یہاں سے آگے جانے کا نہ تو کوئی راستہ ہے اور نہ کوئی جگہ ہے۔ دن میں کسی وقت درختوں کے نیچے گری پڑی سوکھی ٹہنیاں اور سوکھے درختوں کے مُڈھ لا کر آتش دان کے پاس اور باہر والے چھوٹے سے برآمدے کی دیوار کے ساتھ لگا دیتا ہوں۔ اخیر ستمبر کے دن ہیں۔ سارا دن سرد ہوائیں چلتی ہیں اور رات کو سردی ہو جاتی ہے۔ میں آتش دان میں تھوڑی سی آگ جلا لیتا ہوں جو ساری رات اور سارا دن کمرے کو کسی حد تک گرم رکھتی ہے۔ اتنا گرم کہ سردی کا احساس نہیں ہوتا۔ میں شہر سے صرف کتابیں' جاپانی چینک اور پرانا پائپ ہی لے کر یہاں آیا تھا۔ ضرورت کے چند برتن میں نے پہاڑی قصبے میں سے خرید لئے تھے۔ کوئی ٹائم پیس یا گھڑی میں نے اپنے پاس نہیں رکھی۔ میں دن کے وقت سورج کو اور رات کے وقت ستاروں کو دیکھ کر وقت کا اندازہ کر لیتا ہوں۔ مجھے صحیح وقت معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔ اگر رات کے دس بجے ہیں تو ٹھیک ہے۔ اگر دن کے آٹھ بجے ہیں تو بھی ٹھیک ہے۔ رات کو تیل کی لالٹین روشن کر لیتا ہوں۔ ایک چھوٹا سا بیٹری کا آڈیو کیسٹ میرے پاس ہے۔ جس میں ریڈیو بھی ہے۔ کبھی کبھی کیسٹ لگا کر اپنی پسند کا کوئی گیت سن لیتا ہوں۔ ریڈیو کی خبریں میں نہیں سنتا۔ کالج کے آگے چنار کے درختوں میں جو پگڈنڈی بن گئی ہے' وہ ایک چھوٹی سی کھلی جگہ پر جا نکلتی ہے۔ یہاں ناشپاتی کے دو درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے ہیں۔ بہار کے موسم میں ان کی ٹہنیاں سفید اور گلابی پھولوں سے بھر جاتی ہیں۔ ناشپاتی کے یہ پیڑ

مجھے میری پہلی محبت کے کمپنی باغ والے ناشپاتی کے باغ کی یاد دلاتے ہیں۔

اب میں اپنی پہلی محبت، بچپن کی محبت کی داستان شروع کرتا ہوں۔ ابھی ابھی میں نے سری لنکا کی چائے پی کر اپنا پائپ سلگایا ہے۔ برٹش تمباکو کی تلخ مہک چائے کی پاکیزہ خوشبو سے ہم آغوش ہو رہی ہے۔ وکٹوریہ عہد کا لٹریچر جنوب مشرقی ایشیا کی پراسرار دیو مالا سے مل رہا ہے اور میں اپنی پہلی محبت کی جنت میں داخل ہو رہا ہوں۔ آٹھ نو برس کی عمر تھی۔ دل شبنم کی طرح بے داغ تھا۔ محبت طلوع ہوتے سورج کی پہلی کرن کی طرح معصوم تھی۔ روشن تھی۔ کمپنی باغ کے درختوں کو دیکھتا تو اپنے بچپن کی محبت کا خیال آ جاتا۔ شبانہ کو دیکھتا تو خیال درختوں، جنگلوں، دریاؤں اور طلوع ہوتے سورج کی طرف نکل جاتا۔ یہ شبانہ کی محبت تھی یا درختوں، پھولوں، دریاؤں کی محبت تھی یا ان سب کے خالق حقیقی کی محبت تھی؟ مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ نورانی محبتوں کی بارش تھی جس میں میں سر سے پاؤں تک شرابور تھا۔

میں نے شبانہ کا نام لکھا ہے۔ یہ اس لڑکی کا اصلی نام نہیں ہے جس سے میں نے پہلی محبت کی۔ اس کا نام کچھ اور تھا۔ میں اس کا اصلی نام نہیں لکھوں گا۔ میں اس گلی کا بھی محل وقوع غلط لکھوں گا جس گلی میں اس کا مکان ہمارے مکان کے سامنے تھا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے پہلی بار شبانہ کو دیکھا تو وہ اپنے مکان کے چھوٹے سے کمرے میں لمبے بالوں میں کنگھی پھیر رہی تھی۔ وہ دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ میں اس کے پاس فرش پر بچھی ہوئی دری پر بیٹھا تھا۔ اس کے پھولے ہوئے بال کمر سے نیچے تک آئے ہوئے تھے۔ بالوں کے سرے بھورے تھے۔ اس وقت میری عمر چھ سات سال کی ہو گی۔ شبانہ عمر میں مجھ سے بڑی تھی۔ میں اس کو بال بناتے دیکھے جا رہا تھا۔ شبانہ کے گندمی رخسار پر ہونٹوں کے قریب ایک کالا تل تھا۔ یہ تل مجھے اچھا لگتا تھا۔ کیوں اچھا لگتا تھا' یہ نہ مجھے اس وقت معلوم تھا نہ اب معلوم ہے۔ اس نے بال بناتے بناتے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"وے چارلی! تم کیا دیکھ رہے ہو؟"

اس زمانے میں ہندوستانی فلموں کے مزاحیہ اداکار چارلی کی بڑی شہرت تھی۔ شبانہ مجھے چارلی کہہ کر بلایا کرتی تھی۔ میں ہنس کر شرما گیا تھا۔ اس کے بعد خواب ٹوٹ جاتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں کہ میں اٹھ کر کس طرف چلا گیا تھا اور شبانہ کس طرف چلی گئی تھی۔

اب ایک اور خواب کا منظر طلوع ہوتا ہے۔ ہمارے آمنے سامنے کے مکانوں کی کچھ عورتیں گرمیوں کے موسم میں صبح صبح منہ اندھیرے کمپنی باغ میں سیر کرنے جاتی تھیں۔ ان میں میری والدہ اور بہنیں اور شبانہ اور اس کی والدہ بھی ہوتی تھیں۔ رات کے دس بجے نلکا چلا جاتا تھا۔ شبانہ کی والدہ دس بجے کے بعد نلکے کو کھول کر اس کے نیچے خالی بالٹی رکھ دیتی تھی۔ صبح چار بجے جب پانی آتا تو بالٹی میں گرتا۔ اس کے شور سے شبانہ اور اس کی والدہ جاگ پڑتیں۔ پھر وہ دوسرے دو چار گھروں کی عورتوں کو جگاتیں۔ میں بھی ساتھ ہو جاتا۔ کیونکہ مجھے صبح کے وقت آسمان پر چمکتے ستارے بڑے اچھے لگتے تھے۔ گلی کی نکڑ پر خواجہ غلام نبی سوداگر پشمینہ کا مکان تھا۔ اس مکان پر خواجہ کے بیٹے خواجہ سعید کو جگاتا۔ وہ اپنے پالتو کتے کو ساتھ لے کر اس قافلے کے آگے آگے چل پڑتا۔

اس وقت کا کمپنی باغ ایسے ہوتا تھا جیسے کسی دلہن نے سبز رنگ کا زرتار سوٹ پہن رکھا ہو اور نیم روشن حجلہ عروسی میں نیم خوابیدگی کے عالم میں ہو اور اس کے سونے چاندی کے زیور کسی کسی وقت چمک جاتے ہوں۔ شہر کے دروازے سے باہر نکلتے ہی میں آسمان کی طرف دیکھتا۔ آسمان پر تارے اس طرح جھلملا رہے ہوتے تھے جیسے یہ دنیا کی پہلی رات ہو اور ستارے پہلی بار چمکنا شروع ہوئے ہیں۔ میں مشرقی افق پر پوری آب و تاب سے دمکتے ہوئے صبح کے ستارے کو محبت اور حیرت سے دیکھتا۔ اس وقت مشرقی آسمان پر ذرا اوپر آ کر سات ستاروں کی چھتری بھی چمک رہی ہوتی تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اسے بنات النعش کہتے ہیں۔ یونانی دیو مالا میں یہ ماتم کرنے والی لڑکیاں ہیں جو میت کے آگے آگے نوحہ خوانی کرتی جاتی ہیں۔ اس وقت مجھے دیو مالا کی کوئی خبر نہیں تھی اور میں سات آٹھ یا نو چھوٹے بڑے چمکیلے ستاروں کی آڑی ترچھی چھتریوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ میں انہیں اس طرح دیکھا کرتا جیسے میں ان کی ٹولی سے زمین پر گرا ہوا ستارہ ہوں یا یہ میری دوست تھیں جو مجھ سے بچھڑ کر آسمان پر چلی گئیں اور ستارے بن کر چمک رہی ہیں۔ ہم کمپنی باغ میں داخل ہوتے تو باغ کی گہری شبنمی سبز خوشبو آنے لگتی۔ یہ کسی ایک پھول کی ،ایک درخت کی خوشبو نہیں تھی۔ یہ سارے باغ کی خوشبو تھی۔ مجھے ایسے لگتا جیسے سارا باغ سانس لے رہا ہے۔ یہ باغ کے سانس کی خوشبو تھی۔ میرا دل سارے باغ، سارے آسمان، سارے ستاروں، ساری دنیا اور اسی دنیا کے خالق کی محبت سے چھلکنے لگتا اور شبانہ کا چہرہ ان ساری چیزوں میں گم ہو جاتا۔

آسمان پر صبح کا نور پھیلا ہوتا۔ ہم اندھیرے میں باغ کے درختوں کے نیچے سے گذرتے تو مجھے ٹہنیوں پر سے شبنم کے قطروں کے ٹپکنے کی آواز آتی۔ اب ہر پلاٹ کے گھاس، ہر درخت اور اندھیرے میں کھلے ہوئے ہر پھول کی خوشبو الگ الگ محسوس ہوتی تھی۔ پھر آم کے درختوں میں بہتی ندی یا نہر آ جاتی۔ گرم رات شب کے پچھلے پہر خاموشی سے کمپنی باغ میں آ کر خنک ہو گئی ہوتی تھی۔ نہر پر آ کر عورتیں برقعے اتار کر کپڑوں سمیت نہر میں نہانے لگتیں۔ میں بھی نہر میں چھلانگ لگا دیتا۔ نہر کا پانی عورتوں کی کمر تک آتا تھا۔ صبح کاذب کے پھیکے اندھیرے میں شبانہ کا بھیگا ہوا چہرہ اور بھیگے ہوئے بال مجھے خواب کی طرف لگتے۔ اس کے جسم کی طرف میرا کبھی خیال نہیں گیا تھا۔ میرے لئے اس کا جسم موجود ہی نہیں تھا۔ وہ مجھے کسی وقت لنکا اور بنگال کے طلسمی جنگلوں میں سے آئی ہوئی کوئی روح لگتی اور کبھی آسمان پر بنات النعش کی ٹولی کی ایک لڑکی لگتی۔ جو دردناک گیت پڑھتی کسی حسین ترین شہزادی کی میت کے آگے آگے چلی جا رہی ہو۔

میری عمر پندرہ سولہ سال کی ہو گئی لیکن میری محبت کی عمر ابھی تک چھ سات برس ہی تھی۔ میری محبت اس عمر میں پہنچ کر رک گئی تھی۔ آج میں اتنی عمر کو پہنچ گیا ہوں لیکن میری محبت کی عمر ایک دن، ایک گھڑی اور ایک سیکنڈ بھی آگے نہیں بڑھی۔ اس سے بڑھ کر میری اور کیا خوش قسمتی ہو گی۔

ایک دن میں نے شبانہ کے نام ایک محبت بھرا رقعہ لکھا اور اسے تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وہ کسی کام سے ہمارے گھر آئی۔ میں چپکے سے سیڑھیوں میں چھپ گیا۔ جب وہ واپس جانے لگی تو میں نے جلدی سے رقعہ اس کے ہاتھ میں زبردستی پکڑا دیا اور گلی میں نکل گیا۔ اب میں اس کے سامنے آتے ہوئے گھبراتا تھا۔ ایک دن گذر گیا۔ رات بھی گذر گئی۔ دوسرے دن ہمارے گھر ساگ مچھلی پکی تھی۔ میری والدہ نے ساگ مچھلی برتن میں ڈالی اسے سرپوش سے ڈھانپا اور مجھے دے کر کہا۔

"جا وزیر خالہ کے گھر دے آ۔"

وزیر خالہ شبانہ کی والدہ کو کہتے تھے۔ میں خوش بھی ہوا اور گھبرا بھی گیا۔ میرا دل ساگ مچھلی کا برتن پکڑتے ہی دھڑکنے لگا۔ شبانہ کے مکان کی ڈیوڑھی میں پہنچ کر دل کی دھڑکن زیادہ تیز ہو گئی۔ میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا۔ اوپر والا دروازہ کھلا تھا۔ دوسری منزل میں صرف ایک ہی چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے آگے کھڑے یا سیلابچے میں تانبے کا حمام پڑا تھا۔ شبانہ چوکی پر بیٹھی منہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر دوپٹے

سے منہ پونچھتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے پاؤں فرش نے جکڑ لئے۔ اس نے ناراض ہو کر کہا۔

"وے چارلی! تم نے خط میں کیا لکھا تھا؟"

میں نے کہا۔

"آپو جی نے ساگ مچھلی بھیجی ہے۔"

اس نے برتن لے کر سالن دوسرے برتن میں ڈالا اور خالی برتن مجھے دیتے ہوئے کہا۔

"وے چارلی! آج رات کو بارہ بجے اوپر مکان کی چھت پر آ جانا۔ میں ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا رکھوں گی۔"

اور وہ ہنستی ہوئی اوپر چلی گئی۔

اس نے مجھے آدھی رات کو چھت پر کیوں بلایا ہے؟ میں اس سے ملنے کیوں جا رہا ہوں؟ ان میں سے ایک بھی سوال میرے ذہن میں پیدا نہیں ہوا تھا۔ مجھے صرف ایک ہی خوشی تھی کہ میں شبانہ کے قریب ہوں گا۔ اس کے رخسار کے سیاہ تل کو قریب سے دیکھوں گا اور وہ کسی اور سے نہیں صرف مجھ سے بات کرے گی۔ ابھی تک ہماری ملاقاتیں، بلکہ میری ملاقاتیں صرف اس طرح ہوتی تھیں کہ وہ سیڑھیاں اتر رہی ہوتی تو میں سیڑھیاں چڑھ رہا ہوتا۔ وہ دوسری عورتوں میں بیٹھی باتیں کر رہی ہوتی تو کبھی کبھی میری طرف بھی دیکھ کر مسکرا دیتی۔ صبح منہ اندھیرے کمپنی باغ کی سیر کرتے ہوئے وہ دوسری عورتوں کے ساتھ نسواری برقعہ اوڑھے آگے آگے جا رہی ہوتی تو میں پیچھے سے اس کا برقعہ کھینچ دیتا۔ اس رات میں اس کے پاس بیٹھا ہوں گا۔ ہم دونوں اکیلے ہوں گے۔ ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی نہیں ہو گا۔ میں اس سے باتیں کروں گا۔ اس کی باتیں سنوں گا۔ میں بہت خوش تھا۔ میرے پاس کوئی گھڑی نہیں تھی۔ ہمارے گھر میں بھی کوئی ٹائم بتانے والا کلاک نہیں تھا۔

میں رات کو دوسرا شو دیکھنے ریالٹو سینما چلا گیا۔ ریالٹو سینما میں نیو تھیٹرز کی فلم لگی ہوئی تھی۔ اس میں ایک گانا تھا۔

پیا ملن کو جانا

جب وہ گانا آیا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے فلم کے سین میں ایک عورت کو اپنے محل سے نکل کر جنگل کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ جنگل میں اپنے

محبوب سے ملنے جا رہی تھی۔ یہ عورت اس محل کی شہزادی تھی۔ راجکماری تھی۔ رات اندھیری تھی۔ وہ ہر قدم پر رک کر پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تھی۔ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ کہیں اس کی بدنامی نہ ہو جائے۔ اس وقت مجھے خیال آیا۔ میں بھی آدھی رات کو دوسروں کے مکان کی چھت پر چوری چھپے جا رہا ہوں۔ اگر ان لوگوں میں سے کوئی جاگ پڑا تو کیا ہو گا۔ شبانہ کی بڑی بدنامی ہو گی۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ پکڑ کر مارنا شروع کر دیں۔ سارے محلے والے جاگ پڑیں۔ ساتھ ساتھ لگے ہوئے تو مکان تھے۔ یہ خیال تھوڑی دیر کے لئے میرے دل میں آیا اور گانا ختم ہوا تو یہ بھی میرے دل سے ختم ہو گیا۔ انٹرول کے وقت میں نے کسی سے وقت پوچھا۔ اس نے بتایا کہ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ میں وہیں سے واپس اپنے مکان پر آگیا۔ شروع سردیوں کی راتیں تھیں۔ لوگوں نے کمروں میں سونا شروع کر دیا تھا۔ میں بھی اپنے مکان میں آکر اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ سب سو رہے تھے۔ میں جاگ رہا تھا۔ نیند بھاپ بن کر اڑ چکی تھی۔ شبانہ کے گھر کی دیوار پر بڑا سا کلاک لگا ہوا تھا۔ میں نے سوچا وہ اس کلاک سے ٹائم دیکھ کر چھت پر آ جائے گی۔ اس کے گھر والے بھی سو گئے ہوں گے اور وہ جاگ رہی ہو گی یا اس نے بھی میری طرح سونے کا بہانہ بنا لیا ہو گا۔ میں حساب لگانے لگا۔ ریالٹو سینما سے پیدل چل کر آیا ہوں۔ دس پندرہ منٹ ضرور گذر گئے ہوں گے۔ اب مزید دو منٹ گذر گئے ہوں۔ اب بارہ بجنے میں دس منٹ رہ گئے ہوں گے۔ اب دو منٹ رہ گئے ہوں گے۔ بس اب بارہ بج گئے ہوں گے۔ مجھے اٹھ کر چل پڑنا چاہئے۔ میں اس طرح رینگ کر چارپائی سے نیچے اترا کہ چارپائی کی آواز پیدا نہ ہو۔ کمرے کا دروازہ رک رک کر کھولا کہ اس کی بھی آواز نہ آئے۔ باہر دالان میں ستاروں کی دھندلی دھندلی ٹھنڈی روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے شبانہ کے مکان کی طرف دیکھا۔ اس نے مجھے کہا تھا کہ میں چھت پر ماچس جلا کر بجھا دوں گی۔ میری نگاہیں اس کے مکان کی چھت پر لگی تھیں۔ چھت پر اچانک ماچس کی تیلی روشن ہو کر بجھ گئی۔

میں دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر گلی میں آگیا۔ ہمارے مکان اور شبانہ کے مکان کے دروازے کے درمیان صرف گلی حائل تھی۔ نیک نامی اور بدنامی کے درمیان صرف پانچ قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ ایک بار شبانہ کے مکان میں داخل ہو گیا تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ بڑی بدنامی ہو گی۔ شبانہ کے بھائی مجھے چھت پر سے نیچے پھینک دیں گے۔ میرے ماں باپ، بہن بھائی میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔ سب کی بدنامی ہو گی۔ یہ

خیال دل میں ایک طرف سے آ رہے تھے اور دوسری طرف سے نکل رہے تھے۔

گلی رات کے وقت خالی پڑی تھی۔ میں اپنے مکان کے باہر تھڑے پر کھڑا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر سامنے شبانہ کے مکان کا دروازہ تھا جو بند تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شبانہ نے دروازے کی کنڈی اندر سے کھول رکھی ہو گی۔ میں دوڑ کر شبانہ کے مکان کے پاس آ گیا۔ میں نے دروازے کو آہستہ سے اندر کو دھکیلا۔ دروازہ کھل گیا۔ ڈیوڑھی میں سے جو زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا وہی زینہ دوسری منزل کے دروازے کے سامنے سے ہو کر اوپر چھت پر چلا جاتا تھا۔ سیڑھیوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں دیوار کو ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیاں چڑھتا ہوا پہلی منزل کے بند دروازے کے قریب سے ہوتا ہوا اوپر چھت پر آ گیا۔ رات سرد تھی۔ آسمان پر تارے سونے چاندی کے زیوروں کی طرح چمک رہے تھے۔ میں کونے میں منڈیر کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ منڈیر میرے کندھے تک آتی تھی۔ میں نے منڈیر کو ہاتھ سے چھوا۔ منڈیر شبنم میں گیلی ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا۔ یہی وہ منڈیر ہے جس کے ساتھ لگ کر شبانہ مجھے گلی میں سے گذرتے دیکھا کرتی ہے۔ اتنے میں چھت کے دروازے پر ایک انسانی سایہ نمودار ہوا۔ یہ شبانہ تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتی میرے پاس آگئی۔ مجھے یاد ہے اس نے پشمینے کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ پشمینے کی گرم چادریں ہمارے امرتسر کے کشمیری گھرانوں میں بڑی عام ہوا کرتی تھیں۔ ہم امرتسری کشمیری ان کو چادریں کبھی نہیں کہتے تھے۔ ہم انہیں فرد یا فردیں یا رفل اور رفلیں کہا کرتے تھے۔ شبانہ نے پشمینے کی چادر کا ایک پلو میرے کندھے پر کر دیا۔ اس کی چادر میں سے حنا کی گرم خوشبو آ رہی تھی۔ ہم منڈیر کے ساتھ لگ کر نیچے گلی میں جھانک کر دیکھنے لگے۔ پھر اس نے ہمارے مکان کی چھت کی طرف دیکھا اور بولی۔

"وے چارلی! آپو جی کو تو پتہ نہیں چلا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں"۔

مکان کی دوسری طرف نیچے گلی کی مسجد کا صحن تھا۔ صحن رات کے اندھیرے میں خالی اور خاموش تھا۔ شبانہ کہنے لگی۔

"وے کیا تم سچ مچ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہو؟"

مجھے کچھ یاد نہیں کہ میں نے کیا جواب دیا تھا۔ ہمارے اوپر ستارے چمک رہے تھے۔ اس زمانے کا آلودگی کے بغیر نیلا شفاف آسمان تھا۔ چھوٹے بڑے ستارے تھے۔ کسی میں سے نیلی، کسی میں سے سفید اور کسی میں سے گلابی رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔

میں ان تاروں کو دیکھ رہا تھا اور شبانہ کی پشمینے کی چادر میں سے آنے والی حنا کی گرم خوشبو مجھے آسمان پر پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ستاروں کے باغ میں اڑائے لئے پھر رہی تھی۔ آسمان آلودگی سے پاک تھا۔ میرا ذہن آلودگی سے پاک تھا۔ نہ آسمان پر جلے ہوئے پٹرول کا دھواں تھا نہ میرے ذہن میں کسی جلے ہوئے خیال کا دھواں تھا۔ آسمان بھی شفاف تھا۔ میرا ذہن بھی شفاف تھا۔ آسمان پر بھی ستارے چمک رہے تھے۔ میرے دل میں بھی ستارے چمک رہے تھے۔ میرے دل سے آسمان تک ستاروں کی نورانی روشنی کا سفر جاری و ساری تھا۔

شبانہ نے میرے کاندھے پر سے پشمینے کی چادر سمیٹتے ہوئے کہا۔

"وے چارلی! اب تم چلے جاؤ۔ کوئی جاگ نہ پڑے۔ سیڑھیوں میں آہستہ پاؤں رکھ کر جانا۔"

وہ سرگوشیوں میں بات کر رہی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ہسپانیہ کے مہندی کے درختوں کے جنگل میں آگیا ہوں اور حنا کی خوشبو مجھ سے ہمکلام ہے۔ آہ! بچپن کی معصوم محبتیں! شبنم میں بھیگے ہوئے کنول کے پھولوں کی طرف پاک محبتیں! طلوع ہوتے ہوئے سورج کی پہلی کرنوں سے بھی زیادہ شفاف' زیادہ نورانی محبتیں! جب انسان کا جسم ٹرانسپرنٹ ہو جاتا ہے۔ شفاف ہو جاتا ہے اور پاکیزہ ترین خیال بن کر اپنے خدا کی طرف محو پرواز ہو جاتا ہے۔ جس طرح برائی اپنا ایک نتیجہ نکالتی ہے اسی طرح نیک خیالی اور پاکیزگی بھی ہمیں زندگی کے ایک مقام تک ضرور لے جاتی ہے۔ دل و دماغ کی پاکیزگی 'بے داغ خیالات کی خوشبوئیں۔ یہ انسانی زندگی کے موسم بہار کی نشانیاں ہیں۔ جب انسان کے بدن میں پاکیزہ خیالوں کے سچے گلابوں کی ہوائیں چلنے لگتی ہیں تو معبود حقیقی کی طرف' اپنی تخلیق کے واحد اور اعلیٰ ترین مقاصد کی طرف اس کا مقدس سفر شروع ہو جاتا ہے۔ پھر ہمارا جسم ایک عبادت گاہ بن جاتا ہے۔ خالق حقیقی کی حمد و ثناء کی مقدس عبادت گاہ۔ پھر کوئی بھی خیال صرف سورج کی کرن بن کر ہی ہمارے جسم کی عبادت گاہ میں داخل ہو سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ میری اس پاکیزہ خیالی کی خواہش کو بیوقوفی کہیں گے۔ ایسے لوگ اس زمانے میں بھی تھے جب میں آدھی رات کو چھپ کر ایک لڑکی کو اس کے مکان کی چھت پر اس طرح ملا تھا جس طرح مولسری کی خوشبو اپنے بچھڑے ہوئے پھول سے ملتی ہے اور ایسے لوگ آج کے زمانے میں بھی ہیں جو میری ان باتوں کا مضحکہ اڑائیں گے اور انہیں میری حماقت اور بے وقوفی پر محمول

کریں گے لیکن میں انہیں کہوں گا کہ خدا کی قسم پاکیزہ خیالی کی بے وقوفی کا صرف ایک لمحہ حاصل کرنے کے لئے میں دنیا داری کی ساری عقل مندیوں کو قربان کر دینے کو تیار ہوں۔ یہ وہ متاع بے بہا ہے جو ملتی ہے تو مفت ملتی ہے۔ نہیں تو کسی قیمت پر نہیں ملتی۔

وہ ستاروں کی چھاؤں میں چھت پر سے ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔ میں دبے پاؤں چل کر دروازے تک آیا اور سانس روکے دونوں منزلوں کی سیڑھیاں اتر گیا۔ گلی اسی طرح خالی تھی۔ میں دوڑ کر اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔

میری بڑی ہمشیرہ کی شادی کی تقریب تھی۔ تیل مہندی کی رات تھی۔ گھر میں ڈھولک بج رہی تھی۔ چولہے پر سبز چائے کا بڑا دیگچہ چڑھا ہوا تھا۔ گلی میں نائی دیگ پکا رہا تھا۔ اینٹوں کے اوپر رکھے گیس روشن تھے۔ عورتیں سرخی پاؤڈر لگائے رنگ برنگ ریشمی کپڑے پہنے گھر میں چل پھر رہی تھیں۔ سردیوں کا موسم تھا۔ عطر کی خوشبوؤں سے فضا بوجھل ہو رہی تھی مگر مجھے یہ فضا بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ اسی فضا میں ساری زندگی کا آخری سانس بھی لوں۔ چولہے کے پاس میری نانی اور خالہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ نانی تھوڑی دیر بعد سبز چائے کے دیگچے میں کفگیر ہلانے لگتی تھی۔ میری نانی کشمیری زبان روانی سے بولتی تھی۔ بہت بوڑھی ہو گئی تھی مگر ہرنی کی طرح چاق و چوبند تھی۔ ہماری والدہ اور خالہ کشمیری سمجھ لیتی تھیں مگر روانی سے بول نہیں سکتی تھیں۔ میں نے دو گھوڑا بوسکی کی قمیض اور پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ پاؤں میں کلکتے کے کالے سلیپر تھے۔ کندھوں پر میں نے عنابی رنگ کی پشمینے کی فرد ڈال رکھی تھی۔ اس زمانے میں دو گھوڑا بوسکی عام ملتی تھی۔ وہ بوسکیوں اور پشمینوں کا زمانہ تھا۔ اب گھوڑے بہت ہو گئے ہیں۔ بوسکی غائب ہو گئی ہے۔ میں بار بار اس کمرے میں جاتا جہاں عورتیں ڈھولک بجا رہی تھیں۔ ان میں زیادہ تر ہماری رشتہ دار خواتین تھیں مگر میں ان کے لئے نہیں بلکہ شبانہ کے لئے جاتا تھا جو گھٹنے جوڑے گردن ایک طرف کئے ڈھولک بجا رہی تھی اور پنجابی کا گیت گا رہی تھی جو اس زمانے میں بیاہ شادیوں والے گھروں میں ضرور گایا جاتا تھا۔

ادھی راتیں چڑھن کھتیاں
لکھاں میں لال ول چھٹیاں
لکھاں سدھیاں ہوون پٹھیاں
خدا جانے یہ کیا ہوسی

سجن مل سی کہ نہ مل سی
تساں نوں مان وطناں دا
تسی او یار پردیسی

میں جب بھی یہ گیت سنتا تو میری آنکھوں کے سامنے سردیوں کی رات کا منظر آ جاتا اور میں آسمان پر چمکتی دمکتی بنات النعش دیکھتا مگر اس وقت میں شبانہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بیاہ شادیوں والے سرخ کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ وہ ڈھولک بجاتے ہوئے گیت گا رہی تھی۔ اس کے چہرے کے آگے بالوں کی ایک لٹ جھول رہی تھی اور گیس کی روشنی میں اس کے ناک میں پڑا ہوا سرخ موتی بار بار چمک اٹھتا تھا۔

میں گھر سے بھاگ کر بمبئی جانے لگا تو میں نے شبانہ کو ایک بچے کے ہاتھ رقعہ لکھ بھیجا کہ میں ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ تم سے آخری بار ملنا چاہتا ہوں۔ ہم کبھی کبھار ہی ایک دوسرے کو رقعہ لکھتے تھے۔ اس لیے کہ دن میں کئی بار ایک دوسرے کو دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا اور ایک دوسرے کو دیکھ لینا ہی محبت کا منتہائے مقصود تھا۔

ہم رقعے کے اوپر اور نیچے ایک دوسرے کا نام نہیں لکھتے تھے۔ رقعہ بھی بڑا مختصر ہوتا تھا جیسے کسی کو ٹیلی گرام دیتے ہیں۔ اس نے جواب میں لکھا کہ میں بڑی خالہ کے زنانہ سٹور میں دوپہر کو جاؤں گی تم سٹور والی گلی کے کونے پر میرا انتظار کرنا۔ کچھ لوگوں نے بلکہ کچھ عورتوں نے اپنے گھروں کے دیوان خانوں میں زنانہ سٹور کھول رکھے تھے۔ جہاں عورتیں آ کر اپنی پسند کی چیزیں خریدتی تھیں۔ شبانہ کی بڑی خالہ نے بھی اپنے مکان کے نیچے ایک زنانہ سٹور کھول رکھا تھا۔ گرمیوں کی دوپہر تھی۔ لو چل رہی تھی۔ سڑکیں تپ رہی تھیں۔ گلیاں ٹھنڈی تھیں۔ میں گلیوں گلی ہوتا زنانہ سٹور والی گلی کی نکڑ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے شبانہ نظر آئی۔ میں نے اسے برقعے میں اس کی چال سے دور ہی سے پہچان لیا۔ اس نے نقابِ ڈال رکھا تھا۔ میرے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا۔

"درگاہ پر آ جاؤ۔"

یہ درگاہ شریف قبرستان میں تھی اور کوئی بزرگ وہاں آسودہ خاک تھے۔ وہ بازار پار کر کے سامنے والی گلی میں چلی گئی۔ تھوڑا وقفہ ڈال کر میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ یہ گلی شہر کی فصیل کے باہر بازار میں جا نکلتی تھی۔ یہاں سے آگے چند قدموں کے فاصلے پر قبرستان تھا۔ شبانہ دبلی پتلی تھی اور بڑی تیز تیز چلتی تھی۔ وہ مجھے گلی میں

کہیں نظر نہ آئی۔ میں بازار میں آیا تو وہاں بھی نہیں تھی۔ میں نے قبرستان میں آ کر درگاہ کے دروازے کی جانب دیکھا۔ شبانہ اندر مزار پر فاتحہ پڑھ رہی تھی۔ میں ایک طرف ہٹ کر درختوں کے پیچھے کھڑا رہا۔ فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ درگاہ سے نکلی اور پیچھے جو قبریں بنی ہوئی تھیں ان کی طرف چلی گئی۔ میں بھی اوپر سے ہو کر وہاں آ گیا۔ وہ ایک قبر کے پاس تھڑے پر بیٹھی تھی۔ اس نے برقعے کا نقاب الٹ رکھا تھا۔ اس کا چہرہ گرمی اور لو کی تپش سے تانبے کی طرح دمک رہا تھا۔

میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اس وقت ہمیں کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ان کا کوئی مر گیا ہے اور یہ اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئے ہیں۔ میرے بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔

"وے تم بمبئی کیوں جا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"بس اب میرا دل یہاں نہیں لگتا۔"

"واپس نہیں آؤ گے۔"

"نہیں۔"

"مجھے یاد کیا کرو گے؟"

"ہاں۔"

اس نے اپنی کلائی کی ایک چوڑی اتار کر مجھے دی اور کہا۔

"یہ میری نشانی اپنے پاس رکھنا۔"

میں نے چوڑی لے کر جیب میں رکھ لی۔ مجھے بڑا خیال آ رہا تھا کہ اس نے ایک بار بھی مجھے نہیں کہا کہ بمبئی نہ جاؤ۔ میں تمہارے بغیر اداس ہو جاؤں گی۔ ہمارے درمیان دو تین کچی قبریں تھیں۔ قبرستان میں گرمیوں کی دوپہر کا سناٹا تھا۔ ایک کوا درخت پر زور سے بولا۔ شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"واپس چلو' کوئی دیکھ لے گا۔"

میں بھی اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ چلنے لگا تو اس نے مجھے بازو سے پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔

"پہلے مجھے جا لینے دو' پھر تم آنا۔"

وہ دو قدم چل کر رک گئی۔ واپس آئی اور کہا۔

"وے بمبئی جا کر مجھے خط نہ لکھنا۔ خبردار سب کو پتہ چل جائے گا۔ ماموں مجھے

مار ڈالیں گے۔"

وہ اپنے سخت طبیعت والے ماموں سے بڑا ڈرتی تھی۔ میں نے کہا۔ "نہیں لکھوں گا۔"

وہ چلی گئی۔ جب میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں بھی قبروں کے درمیان چلنے لگا۔ راستے میں امرود کا باغ آتا تھا۔ گرم دوپہر میں لو کے ساتھ باغ میں سے کچے امرودوں کی خوشبو آئی تو میں وہیں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ مجھے بڑا غصہ آ رہا تھا کہ شبانہ نے مجھے بمبئی جانے سے روکا کیوں نہیں۔ اس نے ایک بار بھی نہیں کہا کہ بمبئی مت جاؤ۔ میں تمہارے بغیر اداس ہو جاؤں گی۔ میں خاموش اداس بیٹھا تھا۔ امرود کا باغ بھی خاموش اور اداس تھا۔ ساری دوپہر خاموش اور اداس تھی۔ اس اداس خاموشی میں کتنا کتھارسز اور کتنی گہری رومانیت تھی۔ یہ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا۔ اس لئے معلوم نہیں تھا کہ میرا اس کیفیت سے الگ کوئی وجود نہیں تھا۔ میں خود ہی اداس تھا۔ خود ہی خاموش تھا۔

اس زمانے میں امرتسر سے پنجاب میل یا کوئی اور ایکسپریس گاڑی دن کے نو بجے کے قریب بمبئی کے لئے روانہ ہوتی تھی۔ میں نے سکول کی کتابوں کا کہہ کر بڑی بہن سے کچھ روپے لئے اور تین کپڑوں میں ریلوے سٹیشن پر آگیا۔ بمبئی کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا۔ گاڑی آئی تو اس میں سوار ہو کر بمبئی کی طرف روانہ ہوگیا۔ یہ میری آوارہ گردیوں کے دور کا بمبئی کا دوسرا پھیرا تھا۔ پہلے بھی وہاں خوار ہو کر واپس آیا تھا۔ اس بار بھی بڑا خوار ہوا۔ خیال تھا کہ بمبئی میں کسی سینما ہاؤس میں گیٹ کیپر ہو جاؤں گا۔ اس طرح فلمیں دیکھنے کا موقع مل جائے گا اور وہاں رہنے اور فلم سٹوڈیو میں جا کر ایکٹر ایکٹرسوں کو دیکھتے رہنے کا سبب بھی بن جائے گا مگر بمبئی نے دوسری بار بھی مجھے منہ نہ لگایا۔ جاتے ہی اوپر تلے دس بارہ فلمیں دیکھ لیں۔ پیسے ختم ہو گئے۔

کسی سینما ہاؤس کی گیٹ کیپری نہ ملی۔ وہاں میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ میری نوعمری کا زمانہ تھا۔ دو دن کا فاقہ آگیا۔ دوسرے دن شام کو نقاہت کے عالم میں چوپاٹی سمندر کے کنارے دیوار پر بیٹھا تھا کہ ایک اللہ کا نیک بندہ مل گیا۔ اس نے مجھے ایرانی ہوٹل میں کھانا کھلایا۔ کہنے لگا۔

"پنجاب سے سب لڑکے یہاں ہیرو بننے آ جاتے ہیں اور فاقے کرتے ہیں۔ رات کے نو بجے بوری بندر کے سٹیشن سے پنجاب میل چلتی ہے۔ اس میں بیٹھ کر اپنے

گھر واپس چلے جاؤ۔"

اس نے مجھے دس روپے دیئے۔

"میرے پاس یہی کچھ ہے اس وقت۔"

میں نے وہاں سے بس پکڑی اور سیدھا بمبئی کے دوسرے بڑے سٹیشن بوری بند آگیا۔ بچپن سے ہی مجھے ریل گاڑیوں میں بغیر ٹکٹ سفر کرنے کا شوق بھی تھا اور تجربہ بھی ہوگیا تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کا ٹکٹ خریدا اور اس پلیٹ فارم پر آگیا جہاں سے پنجاب ایکسپریس کو روانہ ہونا تھا۔ گاڑی کے چلنے میں ابھی کافی وقت تھا۔ میں نے ٹی سٹال پر کھڑے ہو کر چائے پی۔ پیسٹری کھائی اور پان سگریٹ کے سٹال پر پلیئرز کے سگرٹوں کا کالے رنگ کا چوڑا پیکٹ خرید لیا۔ یہ اس زمانے میں بڑے اعلیٰ کوالٹی کے سگریٹ تھے۔ دیوار کے ساتھ لگے بنچ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھنے لگا۔ دل میں اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ میں شبانہ کے پاس جا رہا ہوں۔ ایک بار پھر اسے برقعہ سمیٹ کر گلی میں سے گذرتے، عورتوں میں بیٹھی باتیں کرتی اور چھت پر گیلے کپڑے ڈالتی دیکھ سکوں گا۔ پنجاب میل یا پنجاب ایکسپریس جو بھی اس کا نام تھا آ کر پلیٹ فارم پر لگ گئی۔ مسافروں نے ہلہ بول دیا۔ میں تین کپڑوں میں تھا۔ میرے پاس سوائے پلیئر کے پیکٹ کے اور کوئی سامان نہیں تھا۔ میں بھی ایک ڈبے میں گھس کر بیٹھ گیا لیکن اپنے تجربے کی روشنی میں ایسی جگہ پر بیٹھا جہاں دروازہ قریب ہی تھا اور میں ٹی ٹی کو آتا دیکھ کر ڈبے میں سے اتر سکتا تھا۔ میں چلتی ٹرین سے بھی اتر جایا کرتا تھا۔ میرا مطلب ہے ٹرین زیادہ تیز نہ ہوئی ہو۔ ٹرین چل پڑی۔ ساری رات چلتی رہی۔ کوئی ٹی ٹی نہ آیا۔

دوسرے دن ٹرین جنگلوں میں سے گذر رہی تھی۔ کبھی کسی دریا کا پل آ جاتا۔ کبھی ہرے بھرے کھیتوں اور تاڑ کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اچانک ہمارے ڈبے میں ٹی ٹی آگیا۔ وہ ایک ڈبے کے دروازے میں سے دوسرے ڈبے کے دروازے کو پکڑ کر چلتی گاڑی میں آگیا تھا۔ اس کو دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن قدرتی طور پر تیز ہو گئی۔ دروازے سے باہر اترنے کا مقام نہیں تھا۔ میں دروازے کے قریب ہی چار پانچ مسافر چھوڑ کر کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے بھی باہر نہیں کود سکتا تھا۔ اتنے میں ٹکٹ چیک کرتے کرتے ٹی ٹی میرے پاس بھی آگیا۔ اس نے مجھ سے ٹکٹ مانگا۔ میں نے اوپر برتھ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"ٹکٹ میرے دوست کے پاس ہے۔ وہ اوپر بیٹھا ہے۔"

ٹی ٹی نے اوپر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے مسافر سے میرا ٹکٹ مانگا تو اس نے حیرانی سے نیچے مجھے دیکھا اور بولا۔

"اس کا ٹکٹ میرے پاس کہاں سے آگیا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

میں نے فوراً" کہا۔

"میرے خیال میں میرا دوست دوسرے ڈبے میں ہے۔"

ٹی ٹی نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور بولا۔

"فرخ آباد کا ہوں۔ میری ٹرین میں کوئی ود آؤٹ ٹکٹ سفر نہیں کر سکتا۔"

اس ٹی ٹی کے یہ الفاظ پورے کے پورے آج بھی مجھے یاد ہیں۔ اسکی شکل تھوڑی تھوڑی یاد رہ گئی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میرے پاس صرف چھ سات روپے ہی ہیں تو بولا۔

"تم ابھی چھوٹے ہو۔ تمہیں حوالات میں بند نہیں کروں گا۔ بس اگلے سٹیشن پر نیچے اتار دوں گا۔"

اس نے مجھے اگلے سٹیشن پر گاڑی سے اتار دیا۔ میں پلیٹ فارم پر ہی رہ گیا اور گاڑی چلی گئی۔ یہ برہان پور کا سٹیشن تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ 43-1942ء کا زمانہ تھا۔ برہان پور ایک پلیٹ فارم کا سٹیشن تھا۔ سٹیشن کے پیچھے ایک طرف اونچی پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ میں پلیٹ فارم کے آخری سرے پر جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے پتہ کر لیا تھا کہ پنجاب کی طرف جانے والی گاڑی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد آئے گی۔ میں اس گاڑی میں بھی بغیر ٹکٹ ہی سفر کرنے والا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اس دفعہ ٹرین کے آخری ڈبے میں بیٹھوں گا۔ وہاں تک ٹی ٹی نہیں آتا۔

میں کس طرح بغیر ٹکٹ پنجاب یعنی اپنے شہر امرتسر پہنچا۔ راستے میں کہاں کہاں ٹی ٹی سے چھپ کر اترنا اور پھر دوڑ کر چلتی ٹرین میں چڑھنا پڑا۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہرحال میں امرتسر پہنچ گیا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی میں نے اس کے مکان کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی پر چق پڑی ہوئی تھی۔ شبانہ کو میرے واپس آنے کا پتہ چلا تو وہ تھوڑی سی چینی یا نمک مانگنے کے بہانے ہمارے گھر میں آئی - وہ میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرا رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔

"آ گئے ہو خیر سے۔"

میں اس کو دیکھ کر خوش بھی ہو رہا تھا اور شرمندہ بھی۔ والد صاحب نے پہلے تو

مجھے خوب مارا پیٹا۔ پھر اعلان کر دیا کہ اس کی پڑھائی بند۔ میں اسے پہلوان بناؤں گا۔ والد صاحب کا تعلق امرتسر کے کشمیری پہلوانوں سے تھا۔ وہ شروع ہی سے میرے پہلوان بنانے کے حق میں تھے اور میں ابھی بہت چھوٹا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ منہ اندھیرے شیخ چلی کے اکھاڑے میں لے جا کر زور کرایا کرتے تھے۔ مجھے تیرنا بھی انہوں نے ہی سکھایا تھا لیکن میری والدہ مجھے پڑھانا چاہتی تھی۔ اب والد صاحب نے اعلان کر دیا کہ یہ پہلوان بنے گا' بس!

والد صاحب نے میری ٹنڈ کرا دی۔ منہ اندھیرے مجھے کان سے پکڑ کر بستر سے اٹھاتے اور شیخ چلی کے اکھاڑے میں لے جا کر میرے بدن پر تیل کی مالش کرتے۔ اکھاڑے کی مٹی میرے اوپر ڈالتے اور اپنی ٹانگ آگے کر کے کہتے۔

"گراؤ مجھے۔"

اس زمانے میں والد صاحب کا جسم بڑا سڈول اور خوبصورت تھا۔ میں یونہی ان کی ٹانگ سے لپٹ کر زور لگانا شروع کر دیتا۔ پھر والد صاحب مجھے دھول مار کر دوسری طرف گرا دیتے۔ اکھاڑے کے باہر بیٹھے ایک بزرگ پہلوان کو میں نے یہ کہتے سنا تھا۔

"کہتے ہیں پہلوانوں میں عقل نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہر پہلوان میں اکھاڑے میں اترنے سے پہلے عقل ہوتی ہے لیکن جب اسے ایک طرف سے دھول پڑتی ہے تو عقل بھاگ کر دوسری طرف چلی جاتی ہے۔ جب دوسری طرف سے دھول پڑتی ہے تو عقل دوڑ کر واپس آ جاتی ہے۔ جب تیسری دھول پڑتی ہے تو عقل دماغ سے دوڑ لگا دیتی ہے۔"

میں اپنی عقل کو دماغ سے باہر نہیں نکلنے دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں ایک بار پھر گھر سے پیسے چرا کر بھاگ گیا۔ اس دفعہ میں بمبئی کی بجائے کلکتے کی طرف بھاگا۔ کلکتے کے بھی اس سے پہلے اپنے پھوپھا کے ساتھ ایک دو پھیرے لگا چکا تھا۔ ہمارے پھوپھا امرتسر کے لوہ گڑھ محلے میں رہتے تھے اور امرتسر سے پشمینے کی شالوں کی بدھیں لے کر کلکتے جایا کرتے تھے۔ کلکتے میں لوئر چیت پور سٹریٹ کے پاس زکریا سٹریٹ ہے۔ امرتسر کے کشمیری سوداگر اسی علاقے میں اپنے ڈیرے لگاتے تھے۔ یہاں ان کی دکانیں بھی تھیں جہاں شالیں فروخت ہوتی تھیں۔ شالوں کی دھلائی ہوتی تھی۔ شالوں کو چرخ چڑھایا جاتا تھا۔ شالوں' قالینوں اور گرم کپڑوں کی رفوگری کا کام بھی ہوتا تھا۔ ایک بار میں گھر سے بھاگ کر زکریا سٹریٹ اپنے رشتے داروں کے پاس گیا تو انہوں نے مجھے وہیں پکڑ کر بٹھا لیا

اور پیچھے والد صاحب کو خط لکھ دیا کہ لڑکے کو ہم نے پکڑ لیا ہے۔ کوئی اعتباری آدمی بھیج کر اسے منگوا لیں۔ اس دفعہ میں بھاگ کر کلکتے گیا تو زکریا سٹریٹ سے دور دور ہی رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس طرف گیا تو میرے رشتے دار مجھے وہیں دبوچ لیں گے اور والد صاحب کو خط لکھ دیں گے کہ کوئی اعتباری آدمی بھیج کر لڑکے کو منگوا لیں۔

کلکتے میں مجھ پر کیا گزری؟ میں کلکتے کی گلیوں بازاروں' پارکوں اور باغوں میں کہاں کہاں آوارہ گردی کرتا پھرا؟ کون کون سے ننگے فٹ پاتھوں پر راتیں بسر کیں؟ کیسے کیسے خوبصورت معصوم چہرے دیکھے؟ کس طرح بنگال کے خطرناک جنگلوں کی طرف نکل گیا؟ ان باتوں کا براہ راست میری زندگی کے ان رومانیت والے واقعات سے کوئی تعلق نہیں ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ آخر یہاں سے بھی خجل خوار ہو کر میں واپس اپنے شہر کی طرف چل پڑا۔ میں نے میٹرک کا امتحان دیا ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ لکھنؤ کے ریلوے سٹیشن پر میں نے لاہور سے چھپنے والے انگریزی کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ میں اپنے امتحان کا نتیجہ دیکھا تھا۔ میرا رول نمبر چھپا ہوا تھا۔ میں پاس ہو گیا تھا۔ اس دفعہ گھر پہنچا تو میرے پاس ہونے کی خوشی میں کسی نے مجھے کچھ نہ کہا۔ والدہ صاحبہ بہت خوش تھیں۔ والد صاحب بھی خوش تھے مگر انہوں نے یہ ضرور کہا۔

"بس آگے پڑھائی بند۔ میں اسے میٹرک پاس پہلوان بناؤں گا۔"

اگرچہ میری اور شبانہ کی محبت معصوم محبت تھی۔ دور دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھار سیڑھیوں میں یا مکان کی ڈیوڑھی میں آمنا سامنا ہو جاتا تو ایک دوسرے سے بچ کر نکل جاتے۔ چھپ چھپ کر ملنا تو بڑی دور کی بات تھی۔ ہم ایک دوسرے سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے کہ کوئی سن نہ لے۔ اس کے باوجود شبانہ کے گھر والوں کو ہماری محبت کا علم ہو گیا۔ شریف وضع دار لوگ تھے۔ انہوں نے شبانہ کی شادی ایک جگہ طے کر دی۔ مجھے پتہ چلا تو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے چپ سی لگ گئی۔ کمپنی باغ کی طرف نکل گیا۔ آموں کے ان درختوں کے پاس جا کر بہت رویا جنہوں نے ہمیں منہ اندھیرے کے نورانی دھندلکے میں نہر میں چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ واپس اس گلی میں آنے کا حوصلہ نہ پڑا جس گلی میں میرا اور شبانہ کا مکان تھا۔ وہیں سے مسلم ہائی اسکول کی طرف چلا گیا۔ وہاں نندہ بس سروس کا لاری اڈا تھا۔ جہاں سے لاہور کی طرف لاریاں چلتی تھیں۔ ایک لاری میں بیٹھا اور لاہور اپنی سب سے بڑی ہمشیرہ کے پاس آ گیا۔ انہوں نے میری شکل دیکھ کر کہا۔

"وے تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہارا رنگ اتنا زرد کیوں ہے؟"

میں اس وقت اپنے آپ کو نیو تھیٹرز کی رومانی فلموں کا ہیرو سمجھ رہا تھا' جو اپنی محبوباؤں کی محبت میں ناکام ہونے کے بعد چپ ہو جاتے ہیں اور آنکھوں میں آنسو لئے ایک طرف نکل جاتے ہیں۔ میں ایک ہفتہ لاہور کی سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ جس روز امرتسر واپس آیا اس روز شبانہ کی برات آنے والی تھی۔ گلی میں درختوں کے پتوں کی جھنڈیاں لگی تھیں۔ کیلے کے درختوں کا دروازہ بنا ہوا تھا۔ اس کے درمیان گیندے کے پھولوں کے ہار لٹک رہے تھے۔ شبانہ کے مکان کے آگے خالی دیگیں گرم پانی سے دھوئی جا رہی تھیں۔ میں وہیں سے واپس ہو گیا۔ مرزے والی گلی میں میرا ایک دوست رہتا تھا۔ میں اس کے مکان پر چلا گیا۔ وہ میرا راز دار تھا۔ جب اسے شبانہ کی شادی کا پتہ چلا تو وہ بھی پریشان ہو گیا اور مجھے تسلیاں دینے لگا۔ میں نے کہا۔

"وہ گانا لگاؤ۔ سہگل کا گانا۔"

میرے دوست نے اسی وقت الماری سے ہزماسٹرز وائس کا گراموفون نکالا۔ سے چابی دی۔ ڈبے میں سے سہگل کے گانے کا ریکارڈ نکال کر گول چکر پر رکھا۔ ساؤنڈ بکس میں نئی سوئی لگائی۔ گراموفون اون کیا اور ساؤنڈ بکس کی سوئی گھومتے ہوئے ریکارڈ پر رکھ دی۔ سہگل کی درد بھری آواز ابھری۔

نہ کوئی پریم کا روگ لگائے
پریمی کے اس پگلے پن پر
سب دنیا مسکائے
روپ کے چتر کو من میں رکھ کر
آگ سے آگ بجھائے
گلی گلی ساجن کو ڈھونڈے
جگ سے آنکھ بچائے
من میں روئے جی بھر بھر کے
اکھین میں مسکائے
نہ کوئی پریم کا روگ لگائے

یہ نیو تھیٹرز کی فلم "پریذیڈنٹ" کا گانا تھا اور اسے آرزو لکھنوی نے لکھا تھا۔ بڑی دیر سہگل گاتا رہا میں اپنے دوست کے کاندھے پر سر رکھے آنسو بہاتا رہا۔ آج اتنے

برس گذر جانے کے بعد جب میں اس منظر کو یاد کرتا ہوں تو ایک لمحے کے لئے بھی مجھے یہ
خیال نہیں آتا کہ وہ میرا بچپنا تھا۔ میں ناسمجھی میں احمقوں کی طرح آنسو بہا رہا تھا بلکہ مجھے
ان آنسوؤں پر رشک آتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ آج میرے اور میرے پہلی محبت
کے ان آنسوؤں کے درمیان نفرتوں، خود غرضیوں اور گناہوں کی دیوار حائل ہو گئی
ہے۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہ دیوار درمیان سے اٹھ جائے گی اور میری
بچھڑی ہوئی محبتیں، مجھ سے بچھڑے ہوئے آنسوؤں کے موتی، ان موتیوں کے سمندر،
ان سمندروں کے سرسبز جزیرے اور ان جزیروں کے جنگل اور ان جنگلوں کی بارشیں
ایک بار پھر مجھ سے آن ملیں گی۔ پھر چھپ چھپ کر ملاقاتیں نہیں ہوں گی۔ کوئی دوسرا
دیکھنے والا نہیں ہوگا۔ کوئی دوسرا مجھے سننے والا نہیں ہوگا۔ میں خود ہی بولوں گا اور خود ہی
اپنی آواز سنوں گا۔ خود ہی سامنے آؤں گا اور خود ہی اپنے آپ کو دیکھوں گا۔ میں ہی
جنگل ہوں گا اور میں ہی اس جنگل کی بارش، پھول، سمندر، طلوع آفتاب اور آفتاب کی
سنہری کرنوں میں چمکتے ہوئے سرسبز زمردیں جزیرے!

آج اتنے برس گذر جانے کے بعد جب میں اس ویران کاٹج میں تنہا بیٹھا
اپنی داستان قلم بند کر رہا ہوں اور اپنی پہلی محبت سے جدائی کے سوگوار لمحات کو یاد کر
رہا ہوں تو شیلے کی ایک نظم کے یہ شعر بے اختیار میری زبان پر آ رہے ہیں۔

THEN WILL I SEEK MY LOVE,
THEN WILL I CHEER HER,
THEN MY ESTEEM WILL PROVE,
WHEN NO FRIEND IS NEAR HER

ON HER GRAVE I WILL LIE,
WHEN LIFE IS PARTED,
ON HER GRAVE I WILL DIE

اس کے بعد بھی ایک لائن تھی جو مجھے اس وقت یاد نہیں آ رہی۔ میں شام
ہونے تک اپنے دوست کے مکان کی بیٹھک میں سہگل، کانن اور پنکج ملک کے
داس گیت سنتا رہا اور اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ شبانہ کی ڈولی
رات کے پچھلے پہر رخصت ہو گئی۔ میں اس وقت ساتھ والی گلی میں ایک بند دکان
کے پھٹے پر پاؤں لٹکائے خاموش بت بنا بیٹھا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر میں اپنے
مکان پر گیا۔ اپنی گلی میں گیا جہاں شبانہ کی بارات بیٹھی ہے تو میں مر جاؤں گا۔ مجھے
بانہ کی بارات کے باجوں کی آواز سنائی دی۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں
یب خودرفتگی کے عالم میں وہاں سے اٹھا اور شہر کی فصیل والے دروازے کی طرف
لنے لگا۔ باجوں کی آواز رات کے پچھلے پہر کے سناٹے میں شگاف ڈال رہی تھی۔ میں

دروازے سے نکل کر شریف پور کی طرف چلا جا رہا تھا۔ میں نے آسمان کی طرف چہ
اٹھا کر دیکھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ ستارے دھندلے نظر آ رہے تھے۔
باجوں کی آواز دور ہوتی جا رہی تھی اور میرا کمپنی باغ قریب آتا جا رہا تھا۔ مجھے کچھ
یاد نہیں میں کب شریف پورے کی آبادی کے قریب سے گذر گیا۔ کب میں نے
ریلوے پھاٹک عبور کیا اور کب کمپنی باغ نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

رات بڑی سرد تھی۔ کہرا پڑ رہا تھا مگر میں سردی اور کہرے کے احساس سے
بے خبر تھا۔ میں سیدھا اس نہر پر آگیا جس کے اوپر جھکے ہوئے آم کے درختوں نے
ہم دونوں کو اکٹھے ہنستے کھیلتے اور نہر میں چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ نہر خاموشی سے بہہ
رہی تھی۔ آم کے درختوں پر سے اوس ٹپک رہی تھی۔ اس کی ٹہنیاں نہر پر جھکی
ہوئی تھیں۔ میں نے ایک درخت کے تنے پر اپنا ہاتھ رکھا تو مجھے توانائی کی ایک گرم
رو درخت سے نکل کر اپنے جسم میں داخل ہوتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنا چہرہ
درخت کے ساتھ لگا دیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری محبت نے، میری محبتوں کی
محبت نے مجھے اپنے ساتھ لگا لیا ہو۔ مجھے ایک عجیب سی طاقت اور سکون کا احساس
ہوا۔ اگر میں گوتم بدھ ہوتا تو وہ گھڑی میرے گیان حاصل کرنے کی گھڑی تھی مگر میر
گوتم بدھ نہیں تھا۔ مجھ میں اور گوتم بدھ میں اس وقت زمین آسمان کا فرق تھا۔ گوتم
بدھ نے دوسروں کو دکھ میں مبتلا دیکھ کر شاہی محل کا عیش و آرام چھوڑ کر جنگلو
میں بسیرا کیا تھا اور میں صرف اپنی محبت کا دکھ لے کر کمپنی باغ میں آگیا تھا لیکن
محبت کسی رنگ میں بھی ہو وہ آخر محبت ہی ہوتی ہے اور اگر محبت بے غرض ہو تو و
جدائی کا دکھ دے کر بھی محبت کرنے والے کی روح کو طاقت عطا کر جاتی ہے۔

میں آم کے درختوں سے جدا ہو کر ناشپاتی کے باغ میں آگیا۔ رات ـ
اندھیرے اور ستاروں کی ٹھٹھرتی ہوئی دھندلی نیلی روشنی میں ناشپاتی کی بے برگ
بار سیاہ ٹہنیاں آسمان کی طرف شاخیں اٹھائے ساکت تھیں۔ مجھے ایک طرف ـ
گیندے کی خوشبو آئی۔ گیندے کی خوشبو بہت لطیف ہوتی ہے۔ جس طرح میں پھو
کو تلاش کرکے اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔ اسی طرح پھول کی خوشبو بھی مجھے تلا
کرکے میرے پاس پہنچ جاتی ہے۔ پھول خود چل کر میرے پاس نہیں آ سکتا لیکن
اپنی خوشبو کو میرے پاس بھیج دیتا ہے۔ ایسی خوشبوئیں بھی میرے پاس پہنچ جاتی
جن کے پھول مجھ سے ہزاروں میل دور کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ا

خوشبوئیں بھی میرے پاس آ جاتی ہیں جن کے پھول ابھی کھلے ہی نہیں ہوتے۔ جن
کے پھول ابھی بیج کی تاریکیوں میں سو رہے ہوتے ہیں۔ ابھی خداؑ کے حکم سے ان
میں خوشبو کی روح پھونکی جانے والی ہوتی ہے۔

مجھے گیندے کی خوشبو پچھلے پہر کے اندھیرے میں ساتھ والے باغیچے میں لے
گئی۔ یہاں ایک کیاری میں گیندے کے بڑے بڑے زرد پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہ
شبنم میں بھیگ رہے تھے۔ یہ سرد راتوں کی شبنم تھی جو پچھلے پہر ٹھنڈے سیال موتی
بن کر پھولوں پر گرتی ہے۔ مجھے گیندے کے سارے پھول مراقبے میں گم نظر آئے۔
میں وہاں سے نکل کر کمپنی باغ کے ان سنگ مرمر کے تالابوں کے پاس آگیا جن میں
سنہری مچھلیاں تیرا کرتی تھیں۔ ان تالابوں کے درمیان ایک قطعے میں گل داؤدی کی
نمائش لگی ہوئی تھی۔ رات کے وقت وہاں سوائے میرے اور داؤدی کے پھولوں کے
اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے بے اختیاری کے عالم میں جھک کر ایک پھول کو اپنی
آنکھوں سے لگا لیا۔ پھول پاکیزہ شبنم میں شرابور تھا۔ میری گرم آنکھیں ٹھنڈی ہو
گئیں۔ میرا ٹھنڈا چہرہ گرم ہوگیا۔ میں نے لمبا سانس لیا۔ ایک گہری' لطیف اور
موہوم سی خوشبو میرے ساتھ سانس لیتی ہوئی میری رگ و پے میں اترتی چلی گئی۔
انتہائی یک سوئی اور مراقبے کے عالم میں محسوس کی جانے والی یہ خوشبو جیسے زمین کی
گہرائیوں کی گہرائی میں بند نافوں کی چٹانوں کو توڑ کر اوپر آ رہی تھی۔ میرا چہرہ داؤدی
کے پھول میں چھپا ہوا تھا اور میں اس اکیلے پھول کے جنگل میں چھپ گیا تھا' گم ہو
گیا تھا اور ہیرے جواہرات سے جگمگاتے راستوں پر اپنے سے گریزاں خوشبو کے پیچھے
پیچھے اڑتا چلا جا رہا تھا۔

جب میں اس پھول کے جنگل سے باہر نکلا تو آسمان پر صبح کا نور جھلکنے لگا تھا۔
اس نور کے آگے ستاروں کا نور ماند پڑتا جا رہا تھا۔ میں کمپنی باغ والی نہر کے کنارے
کنارے چلتا چالیس کھوہ کے سرسوں کے کھلے کھیتوں میں نکل آیا۔ اس وقت
مشرقی افق کے کنارے طلوع ہونے والے سورج کی سرخی سے لال ہو رہے تھے۔ یہ
سرخی دیکھتے دیکھتے سنہری ہو گئی اور پھر سیال سونے کا چمکتا' دمکتا۔ لرزتا ہوا سورج
طلوع ہوا۔ اس وقت سورج نے اپنا دیدار عام کر رکھا تھا۔ اسے کوئی بھی کھلی آنکھ
سے دیکھ سکتا تھا۔ وہ سونے کا بہت بڑا تھال لگ رہا تھا جو اپنے پگھلے ہوئے سونے کو
سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو۔ جیسے جیسے وہ اوپر آ رہا تھا اس کا جلال اس کی تابناکی

بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ سارے کا سارا سفید اور روشن ہوگیا۔ اب اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اس نے میری روح، میرے جسم کے تاریک کونوں کو روشن کر دیا تھا۔ میں طلوع ہوتے سورج کی روشنی اور طاقت کو اپنی روح میں سمیٹے وہاں سے واپس اپنے گھر آگیا۔ اس وقت میں سورج نہیں تھا مگر سورج سے ہاتھ ملا کر آیا تھا اور سورج سے ہاتھ ملانے کے بعد میرا جسم اس طرح روشن ہو گیا تھا جیسے ایک چھوٹا سا سورج میرے اندر بھی طلوع ہو رہا ہو۔

"اے جنگل کے پھولو!
جو اپنے نازک چہرے سورج کی طرف موڑتے ہو
روشنی سے ابدی مسرت اور خوشبودار سانس حاصل
کرنے کے لئے
تم اپنی ارغوانی پوشاکوں کے لئے خدا کے شکر گزار ہو
تم میں سے کوئی بھی مکمل زندگی سے محروم نہیں رہتا
اور کوئی بھی اپنے حسن کو برباد نہیں کرتا
جنوبی سمندروں کی ہواؤں میں لہرانے والے
ناریل کے درختو!
سدا مسکراتے رہو"

اگر میں ناریل کا درخت ہوتا تو جنوبی سمندروں کی ہواؤں اور بارشوں میں سدا مسکراتا رہتا لیکن میں ناریل کا درخت نہیں تھا۔ معمولی انسان تھا۔ تمام کمزوریوں، تمام طاقتوں، تمام ثوابوں، تمام گناہوں والا انسان۔ دل میں ایک خیال سورج بن کر طلوع ہوتا۔ ایک چکا چوند کر دینے والی روشنی پھیل جاتی اور دوسرے لمحے تاریک گھٹائیں امڈ آتیں اور اندھیرا چھا جاتا۔

گھر میں جی نہیں لگتا تھا۔ شبانہ کے مکان کی طرف نگاہ جاتی تو دل بوجھل ہو جاتا۔ کیا اب کبھی اپنی محبت کا معصوم چہرہ نہ دیکھ سکوں گا؟ میں نے فیصلہ کر لیا کہ شبانہ سے ضرور ملوں گا۔ شبانہ کو اس کا خاوند بیاہ کر دلی لے گیا تھا۔ دلی میں اس کی ملازمت تھی۔ میں نے کسی نہ کسی طرح شبانہ کا دلی کا ایڈریس معلوم کر لیا۔ پاؤں میں چکر تو پہلے ہی موجود تھا۔ ایک روز ٹرین میں بیٹھا اور دلی پہنچ گیا۔ اس سے پہلے میں بھائی جان کے ساتھ دلی آ چکا تھا۔ ہم مشہور شاعر ن م راشد کے ہاں ٹھہرے تھے۔ بھائی جان کی راشد صاحب سے دوستی تھی۔ راشد صاحب ان دنوں آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر پروگرام تھے۔ وہ علی پور روڈ پر ایک پرانی کوٹھی میں رہائش پذیر تھے۔ میں ان دنوں آٹھویں یا نویں یا ناویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کے بعد بھائی جان بھی آل انڈیا ریڈیو دلی سے وابستہ ہو گئے اور تیس ہزاری کے کواٹروں میں رہنے لگے۔ جب دل میں شبانہ سے ملاقات کرنے کا خطرناک خیال لئے بلکہ ارادہ کئے دلی پہنچا تو بھائی جان کی رہائش تیس ہزاری میں ہی تھی۔ میں سیدھا ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ کیا میں گھر سے بھاگ کر آیا ہوں؟

میں نے جھوٹ بولا اور کہا۔

"نہیں۔ میں تو سب کو بتا کر آیا ہوں۔"

رات میں نے کسی نہ کسی طرح کاٹی اور اگلے دن شبانہ کے مکان کی طرف چل پڑا۔ یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ میرے اس اقدام سے نہ صرف مجھے پولیس کے حوالے کیا جا سکتا تھا بلکہ شبانہ کی زندگی بھی تباہ ہو سکتی تھی مگر میری آنکھوں پر خود غرضی کے پردے گرے ہوئے تھے یا پردے پڑے ہوئے تھے یا اسے دیکھنے کا شوق دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ جو کام مجھے کسی حالت میں، کسی صورت میں نہیں کرنا چاہئے تھا وہی کام کرنے کشاں کشاں چلا جا رہا تھا۔ دلی میں چاندنی چوک کے قریب ایک سینما ہاؤس ہوتا تھا جس کا نام جگت ٹاکیز تھا۔ شبانہ اس سینما ہاؤس کے پیچھے اپنے

خاوند کے ساتھ رہتی تھی۔ مکان کا نمبر بھی میرے پاس لکھا ہوا موجود تھا۔ میں چاندنی چوک میں سے ہوتا ہوا بے دھڑک اس کے محلے میں داخل ہوگیا۔ ایک دکاندار سے مکان کا پوچھا۔ اس نے دو مکان چھوڑ کر ایک مکان کی دوسری منزل کی جانب اشارہ کر کے کہا۔

"وہ اوپر والا کوارٹر ہے۔"

یہ کوئی الگ مکان نہیں تھا۔ اوپر نیچے دس بارہ کوارٹر ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ایک زینہ دوسری منزل کو جاتا تھا۔ دوسری منزل کا ایک کوارٹر شبانہ کے خاوند نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ میں بے دھڑک ہو کر زینہ چڑھ گیا۔ آج میں اس لمحے کا تصور کرتا ہوں تو سر پکڑ لیتا ہوں کہ یہ میں کیا حماقت کرنے والا تھا۔ زینہ ختم ہوا تو دوسری منزل پر آگیا۔ یہاں ساتھ ساتھ بنے ہوئے کوارٹروں کے دروازے تھے۔ آگے تنگ راہداری تھی۔ کوارٹر کا نمبر مجھے زبانی یاد ہوگیا تھا۔ میرا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ اس خیال سے نہیں کہ کہیں میں پکڑا نہ جاؤں۔ کہیں میں حوالات میں نہ بند کر دیا جاؤں یا یہ کہ کہیں شبانہ بدنام نہ ہو جائے بلکہ اس خیال سے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی کہ میں شبانہ کو شادی کے بعد پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے دلہنوں والا لباس پہنا ہوا ہوگا۔ ایک کوارٹر کا دروازہ گذر گیا۔ دوسرے کوارٹر کا دروازہ گذر گیا۔ تیسرا کوارٹر شبانہ کا تھا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی عقل سے کام نہ لیا اور دروازے کے سامنے آگیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ جیسے ہی میں نے اندر نگاہ ڈالی سامنے شبانہ دکھائی دی۔ اب مجھے یاد نہیں رہا کہ اس وقت وہ کیا کر رہی تھی۔ اس کی شکل پوری یاد ہے۔ اس نے مجھے دیکھا تو ششدر ہو کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کا تحیر میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہ میں کیا حماقت کر بیٹھا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت شبانہ کا خاوند وہاں نہیں تھا۔ شبانہ نے جھڑکنے کے انداز میں زور زور سے ہاتھ ہلا کر مجھے وہاں سے چلے جانے کو کہا۔ میں فوراً واپس مڑا اور تیز تیز چلتا زینے سے اتر کر بازار میں آگیا۔ میرا سانس اس طرح پھولا ہوا تھا جیسے میں دو میل کی دوڑ لگا کر آیا ہوں۔ اس وقت مجھ پر عجیب ملامت کا عالم طاری تھا۔ مجھے محسوس ہوگیا تھا کہ میں بڑی خطرناک غلطی کر بیٹھا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شبانہ کے خلاف دل میں غصہ بھی تھا کہ وہ تو شادی کر کے بڑے آرام سے بیٹھی ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی میرے بغیر سخت اداس ہوگی۔ اس

کے چہرے پر غم و اندوہ کے بادل چھائے ہوئے ہوں گے لیکن اس کا چہرہ مجھے پہلے سے زیادہ صحت مند نظر آیا تھا۔ اس نے سرخی پاؤڈر بھی لگایا ہوا تھا۔

میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب شبانہ سے کبھی نہیں ملوں گا۔ اگر وہ مجھے بھول گئی ہے تو میں بھی اسے بھلا دوں گا۔ اپنے دل سے اس کی یاد نکال دوں گا۔ میں غم زدہ دل لئے جگت ٹاکیز کے پہلو سے ہوکر چاندنی چوک میں آگیا۔ یہاں سے ٹرام کار میں بیٹھا اور فتح پوری والی مسجد کے چوک میں اتر گیا۔ وہاں سے پیدل چل کر کشمیری دروازے آیا۔ کشمیری دروازے سے نکل کر علی پور روڈ پر ہو گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے سٹوڈیوز اور دفاتر اسی سڑک پر کافی آگے جا کر تھے۔ میں فٹ پاتھ پر اداس اداس چلا جا رہا تھا۔ سڑک پر دونوں جانب نیم کے گھنے درخت تھے۔ خزاں کا موسم تھا۔ ذرا ہوا چلتی تو درختوں پر سے نیم کے خشک پتے گرنے لگتے۔ کافی دور جانے کے بعد بائیں جانب ایک چھوٹی سی گلی مڑتی تھی۔ یہاں آمنے سامنے پرانی کوٹھیاں تھیں۔ ایک کوٹھی میں آل انڈیا ریڈیو کے سٹوڈیوز تھے۔ مجھے معلوم تھا بھائی جان اس وقت وہیں ہوں گے۔ ریڈیو سٹیشن کے صحن میں ریڈیو کی کنٹین تھی۔ دھریک کے درخت کے نیچے لکڑی کی لمبی میز اور پرانی کرسیاں پڑی تھی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا' چائے منگوائی۔ چائے پینے لگا۔ آنکھوں کے آگے شبانہ کا صحت مند اور سرخی پاؤڈر والا چہرہ آگیا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہونٹوں سے ایک سرد آہ نکل گئی۔

اس زمانے میں دلی ریڈیو کے ساتھ ن م راشد کے علاوہ اردو کے کئی دوسرے مشہور ادیب شاعر وابستہ تھے۔ ان میں راجہ مہدی علی خاں' سعادت حسن منٹو' کرشن چندر' مظفر ہاشمی بھی تھے۔ میں کنٹین سے اٹھ کر راشد صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔ بھائی جان سے ملنے کو اب دل نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھے امرتسر واپس جا کر اپنی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کرنے کو کہیں گے اور میرا امرتسر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ میں دلی میں ہی رہ جانا چاہتا تھا۔ تاکہ جس فضا میں شبانہ سانس لے رہی ہے میں بھی اسی فضا میں سانس لیتا رہوں۔ ن م راشد صاحب کا چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار کے ساتھ صوفہ لگا تھا۔ میں نے اندر جا کر سلام کیا اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ راشد صاحب کام میں مصروف تھے۔ عینک کے پیچھے سے آنکھیں جھپکا کر میری طرف دیکھا اور اپنی خاص شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ

پنجابی میں پوچھا۔

"کیوں پہلوان؟ کیا بات ہے۔ چپ چپ سے کیوں ہو؟"

میں بچپن اور لڑکپن میں ذرا موٹا ہوا کرتا تھا۔ راشد صاحب مجھے پہلوان کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں راشد صاحب۔"

"گھر یاد آ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں، بالکل نہیں۔"

راشد صاحب مسکرائے اور اپنے کام میں لگ گئے۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھا شبانہ کو یاد کرتا رہا۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ میرا کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ اصل میں وہاں میرا کوئی غمگسار، میرا ہم عمر نہیں تھا۔ اچانک مجھے احمد کا خیال آ گیا۔ احمد امرتسر میں میرا دوست بنا تھا۔ وہ اپنے والد کے ساتھ دلی سے امرتسر آیا تھا اور ہمارے محلے میں آ کر رہا تھا۔ وہ میرا ہم عمر تھا۔ وہ نماز پڑھنے کے لئے بوڑ والی مسجد میں جایا کرتا تھا اور مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ اس طرح ہم آپس میں بڑی جلدی ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ دلی جاتے ہوئے اس نے مجھے اپنے گھر کا پورا پتہ زبانی یاد کرا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا۔

"بس دلی کے محلے چتلی قبر میں آ کر کسی سے محمد خاں پٹے باز کا نام پوچھ لینا۔"

محمد خان میرے دوست احمد کے والد کا نام تھا۔ راشد صاحب کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے سوچا کہ اپنے دوست احمد کے پاس چلنا چاہئے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ چتلی قبر کا محلہ کہاں ہے۔ چائے کی کنٹین میں کام کرنے والے ایک لڑکے سے پوچھا تو اس نے کہا۔

"جامع مسجد کے چوک میں چلے جاؤ۔ چتلی قبر قریب ہی ہے۔"

میں جامع مسجد کی طرف روانہ ہو گیا۔ کشمیری دروازے کے باہر قدسیہ گارڈن کے قریب جامع مسجد کو جاتا ایک سواریوں والا تانگہ مل گیا۔ اس میں بیٹھ کر میں جامع مسجد کے چوک میں پہنچ گیا۔ وہاں سے پوچھتا پوچھتا چتلی قبر کی گلیوں میں نکل آیا۔ ایک پان والے کی دکان سے محمد خان پٹے باز کا پوچھا تو اس نے گلی کے کونے والے مکان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"وہ مکان ہے۔"

احمد مجھے گلی میں ہی مل گیا۔ اسے دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنے سارے غم ہی بھول گیا۔ دونوں دوست ایک دوسرے سے بغلگیر ہو کر ملے۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ والدہ سے ملایا۔ اس کے والد گھر پر نہیں تھے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا مل کر کھایا۔ احمد نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا بات ہے تم مجھے اداس اداس لگ رہے ہو؟"

احمد کو میری محبت کا علم نہیں تھا۔ میں نے امرتسر میں اس سے اپنی محبت کے بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے اس وقت بھی اسے کچھ نہ بتایا۔ اپنی زبان پر شبانہ کا نام نہ آنے دیا۔ یہی کہا۔ ویسے ہی اداس ہو گیا ہوں۔ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ وہ کہنے لگا۔

"چلو نظام الدین اولیاؒ چلتے ہیں۔ وہاں قوالی سنیں گے۔"

احمد اور میں چتلی قبر کی گلیوں سے نکل کر چوک میں آ گئے۔ پھر وہ مجھے لے کر ایک بازار میں چل پڑا۔ میں ان بازاروں سے ناواقف تھا۔ کافی دیر پیدل چلتے رہے۔ پھر ایک جگہ پہنچ کر ہم نظام الدین اولیاؒ کی بستی میں جانے والے تانگے میں بیٹھ گئے۔ کہتے ہیں آج کل بستی نظام الدین اولیاؒ دلی شہر کی آبادی کا حصہ بن گئی ہے۔ ان دنوں شہر اور بستی کے درمیان ویران اور بے آباد علاقہ ہوا کرتا تھا۔ درگاہ شریف پر پہنچ کر ہم نے وضو کیا۔ مزار پر دعائے فاتحہ پڑھی۔ ایک جانب ستونوں والے دالان میں قوالی ہو رہی تھی۔ ہم ایک طرف ہو کر بڑے ادب سے بیٹھ گئے اور قوالی سننے لگے۔ ایک نورانی اور روحانی فضا تھی۔ اگربتیوں اور عطریات اور پھولوں کی خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ قوالی سنتے سنتے مجھ پر رقت سی طاری ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں ان آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرنے لگا کہ احمد کیا کہے گا کہ میں رو کیوں رہا ہوں؟ حالانکہ اس فضا میں رقت کا طاری ہونا ایک سعادت تھی مگر مجھے یہی ڈر لگا تھا کہ کہیں احمد پر میری محبت کا راز نہ کھل جائے۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ میں اپنی محبوبہ کی جدائی میں رو رہا ہوں۔ میں کبھی سر نیچے کر لیتا۔ کبھی دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ اس وقت دل میں صرف ایک ہی خواہش باقی رہ گئی تھی کہ یہ قوالی اسی طرح ہوتی رہے اور میں روتا رہوں اور روتے روتے آنسوؤں میں بہہ جاؤں لیکن قوالی ختم ہو گئی۔ میری آنکھوں نے میرے آنسو بھی اپنے اندر سما

لئے۔ رقت کا لمحہ مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ میرے اور میری رقت کے درمیان ایک بار پھر دنیا حائل ہو گئی تھی۔ احمد نے کہا۔

"چلو غالب کی قبر پر چل کر فاتحہ پڑھتے ہیں۔"

مجھے صرف اتنا معلوم تھا کہ غالب اردو کا شاعر تھا۔ احمد کو بھی بس اتنا ہی معلوم تھا۔ ہم درگاہ شریف کے پہلو والے دروازے سے نکل کر درگاہ کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے قبرستان کی ڈیوڑھی میں آ گئے۔ آگے ایک چھوٹا سا قبرستان تھا۔ اونچی نیچی کچی پکی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ احمد نے ایک پکی قبر کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ غالب کی قبر ہے۔"

چھوٹی سی قبر تھی۔ پکی تھی۔ پیچھے سنگ مرمر کا کتبہ لگا تھا جس پر ایک شعر درج تھا جس میں ہاتف کا نام آتا تھا۔ میں نے احمد سے پوچھا۔

"ہاتف کے کیا معنی ہیں؟"

وہ بولا۔

"مجھے بھی نہیں پتہ۔ اردو کے ماسٹر سے پوچھ کر بتاؤں گا۔"

ہم نے فاتحہ پڑھی۔ مجھے فاتحہ پڑھنا نہیں آتا تھا۔ یونہی احمد کے ساتھ میں نے بھی ہاتھ پھیلا دیئے۔ احمد نمازی لڑکا تھا۔ اسے فاتحہ پڑھنا آتا تھا۔ ہم ننگے پاؤں تھے۔ واپسی پر قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے میرے پیر میں کانٹا چبھ گیا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ احمد نے بڑی مشکل سے میرا کانٹا نکالا۔ اس کے بعد ہم شہر واپس آ گئے۔ احمد نے مجھے دلی کی خوب سیر کرائی۔ شام ہو رہی تھی جب میں تیس ہزاری اپنے کوارٹر میں واپس آیا۔ بھائی جان سخت غصے میں تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہا۔

"خبردار اگر اب یہاں سے قدم باہر نکالا۔ صبح پہلی گاڑی پر تمہیں واپس امرتسر بھیج رہا ہوں۔"

وہ دوسرے کمرے میں گئے۔ میں کوارٹر سے نکلا اور سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ایک قلی سے پوچھا۔

"بمبئی جانے والی گاڑی کس وقت روانہ ہوگی۔"

یہ کوئی ایکسپریس گاڑی تھی۔ میں امرتسر سے آتی دفعہ اپنے ساتھ کچھ پیسے لیتا آیا تھا۔ میں نے انہیں گنا۔ کوئی بیس اکیس روپے تھے۔ یہ اس زمانے میں بہت

ہوا کرتے تھے۔ میں نے بمبئی کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر رکھ لیا اور پلیٹ فارم پر آ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ مجھے یاد نہیں رہا۔ میرا خیال ہے گیارہ بارہ روپے کا ٹکٹ آیا تھا۔ اب مجھ پر ایک بار پھر آوارہ گردی کی دھن سوار ہو چکی تھی۔ اس بار دل میں یہ طے کر کے جارہا تھا کہ واپس نہیں آؤں گا۔ بمبئی میں ہی رہوں گا۔ کہیں کوئی چھوٹا موٹا کام تلاش کرلوں گا۔ جب شبانہ امرتسر میں نہیں رہی تو میں امرتسر میں رہ کر کیا کروں گا۔ ٹرین آئی۔ میں اس میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرین بمبئی کی طرف روانہ ہو گئی۔

پہلی بار گھر سے بھاگ کر بمبئی آیا تھا تو بوری بند کے ریلوے سٹیشن پر اترا تھا۔ اس دفعہ گاڑی نے مجھے بمبئے سنٹرل کے ٹرمنل سٹیشن پر اتارا۔ یہ بمبئی کا دوسرا بڑا سٹیشن تھا۔ اس وقت دن نکل آیا تھا۔ بمبئی میں امرتسر والی سردی نہیں تھی۔ بڑا خوشگوار موسم تھا۔ میرے پاس تھوڑے سے پیسوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بمبئے سنٹرل کے آگے سے جو سڑک گذرتی تھی اس کا نام لیمنگٹن روڈ تھا۔ میں سٹیشن سے نکل کر اس سڑک پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ سوچنے لگا کس طرف جاؤں؟ مجھے کام مل سکے گا؟ میں بھی دوسرے لڑکوں کی طرح فلمیں بہت دیکھا کرتا تھا۔ بعض ایکٹر ایکٹرسیں مجھے بہت پسند تھیں۔ دل و جان سے اچھی لگتی تھیں۔ میں نے دل میں کہا چلو نسیم بانو کے ہاں چلتے ہیں۔ وہ مجھے ضرور کہیں نہ کہیں کام دلا دے گی۔ سٹیشن کے احاطے میں ایک جانب بہت سی وکٹوریہ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ بگھیاں تھیں اور بمبئی شہر میں تانگوں کی جگہ چلتی تھیں۔ میں نے ایک وکٹوریہ والے سے کہا۔

"مس نسیم بانو کا گھر معلوم ہے کہاں ہے؟ مجھے اس کے گھر لے چلو۔"

لمبی ترکی ٹوپی والے وکٹوریہ بان نے کہا۔

"دو روپے لوں گا۔"

میں وکٹوریہ میں بیٹھ گیا۔ وکٹوریہ گاڑی بمبئی کے بازاروں میں چل پڑی۔ کتنے ہی بازار آئے اور گذر گئے۔ میں نے وکٹوریہ بان سے پوچھا۔

"ابھی مس نسیم کا گھر کتنی دور ہے؟"

وہ بولا۔

"بس اب پہنچنے ہی والے ہیں بابو۔"

سہراب مودی کی فلم پکار نئی نئی ریلیز ہوئی تھی۔ مس نسیم بانو اس فلم کی

ہیروئن تھی اور اس نے نور جہاں کا رول ادا کیا تھا۔ وکٹوریہ بان راستے میں مجھ سے پوچھنے لگا۔

"کیا مس نسیم بانو تمہیں جانتی ہیں؟"

میں نے کہا۔

"ہاں ہاں، بہت اچھی طرح جانتی ہے، تم چلو۔"

سمندر کے کنارے چوپاٹی پر میرین ڈرائیو کا جو علاقہ تھا۔ وہاں نسیم بانو کسی فلیٹ میں رہتی تھی۔ وکٹوریہ ایک فلیٹ کے سامنے گرین بیلٹ کے پاس رک گئی۔

"یہ نسیم بانو کا فلیٹ ہے۔"

میں نے اسے کہا۔

"یہاں ٹھہرو۔"

اور میں وکٹوریہ سے نکل کر فلیٹ کے برآمدے میں آگیا۔ یہ پہلی منزل کا فلیٹ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ برآمدے میں ایک جانب نسیم بانو کی کچھ تصویریں دیوار پر لٹک رہی تھیں۔ ایک چوکیدار سٹول پر بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے مس نسیم کا پوچھا تو وہ بولا۔

"وہ دلی گئی ہوئی ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"وہ کب واپس آئیں گی؟"

چوکیدار نے کہا۔

"جاؤ جاؤ لڑکے مجھے کچھ معلوم نہیں کب آئیں گی۔"

میں واپس وکٹوریہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرے مایوس چہرے کو دیکھ کر وکٹوریہ والے نے پوچھا۔

"کیوں بابو! کیا ہوا؟"

میں نے اسے بتایا کہ مس نسیم دلی گئی ہوئی ہیں۔ وکٹوریہ والا سمجھا کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا شوق بمبئی کھینچ لایا ہے۔ اس زمانے میں پنجاب اور صوبہ سرحد کے اکثر لڑکے فلموں میں ہیرو بننے کے شوق میں گھروں سے بھاگ کر بمبئی آ جایا کرتے تھے۔ وکٹوریہ والا کہنے لگا۔

"بابو میں تمہیں لکشمی بائی کے پاس لئے چلتا ہوں۔ اس نے بڑے لڑکوں کو فلموں میں کام دلایا ہے۔ وہ میری واقف ہے۔ تمہیں بھی کام دلا دے گی۔"

میں نے سوچا کہیں کام تو ملے گا۔ مجھے تو بمبئی میں رہنے کے لئے تھوڑا بہت کام چاہئے تھا۔ میں نے کہا۔

"چلو مجھے لکشمی بائی کے ہاں لے چلو۔"

مجھے کچھ معلوم نہیں وہ بمبئی کے کون کون سے علاقے میں سے ہوتا ہوا ایک بازار میں مجھے لے آیا۔ بازار کی دونوں جانب پرانی عمارتیں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک عمارت کے دو کمروں کے فلیٹ میں لکشمی بائی رہتی تھی۔ وکٹوریہ والا مجھے اس کے پاس لے گیا۔ وہ کمرے کے آگے موڑھے پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ وکٹوریہ والے سے ہنس کر ملی اس سے حال چال پوچھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"اس لڑکے کو کہاں سے پکڑ لائے ہو؟"

وکٹوریہ والا بولا۔

"بائی جی بس آپ کی تھوڑی سی نظر ہو جائے تو اس لڑکے کی بھی قسمت جاگ اٹھے گی۔ پنجاب سے آیا ہے ہیرو بننا چاہتا ہے۔"

لکشمی بائی کی عمر پچاس کے قریب ہو گی۔ بالوں میں خضاب لگا ہوا تھا۔ مرہٹیوں کی طرح اس نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ کہنے لگی۔

"واوا ابھی تو یہ ہیرو کا بیٹا ہی بن سکتا ہے۔ تم لائے ہو تو میں اس کا کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ کل اسے لے کر پرکاش سٹوڈیوز میں آ جانا۔ ون کو ڈانس کی شوٹنگ ہے۔"

میں بڑا خوش ہوا کہ چلو اسی بہانے ڈانس کی شوٹنگ بھی دیکھوں گا۔ وکٹوریہ والا جس کا نام بھی احمد تھا مجھے لے کر باہر آگیا۔ کہنے لگا۔

"سمجھو تمہارا کام ہوگیا۔ اب رات کہاں گذارو گے؟"

میں نے کہا۔

"سٹیشن پر سو جاؤں گا۔"

بچپن کی آوارہ گردیوں میں مجھے ریلوے سٹیشنوں کے خالی بنچوں پر سونے کی بڑی عادت ہو گئی تھی۔ آج بھی کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ لاہور، پنڈی یا کسی دوسرے شہر کے ریلوے سٹیشن پر جا کر خالی بنچ پر سو کر رات بسر کروں۔ اس میں مجھے بڑا ایڈونچر محسوس ہوتا ہے۔ بہرحال جب احمد کو معلوم ہوا کہ میرے پاس رات بسر

کرنے کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے تو سوچ میں پڑ گیا۔

"اچھا کوئی بات نہیں تم بیٹھو۔ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔"

وکٹوریہ ایک بار پھر بمبئی کے بازاروں میں چل پڑی۔ ایک دو باتیں مجھے ان بازاروں کی اب بھی یاد ہیں۔ وکٹوریہ بازار میں جس کسی ایرانی ہوٹل کے سامنے سے گذرتی تو چائے کی خوشبو ضرور آتی تھی۔ یہ خوشبو مجھے بڑی اچھی لگتی تھی۔ اس زمانے میں عام سگرٹوں میں پیلا ہاتھی اور چار مینار سگریٹ بہت چلتا تھا۔ احمد چار مینار سگریٹ پیتا تھا۔ یہ دونوں سگریٹ بڑے سستے ہوتے تھے۔ میرے پاس پلیرز کا پیکٹ دیکھ کر وکٹوریہ والے احمد نے بڑے تعجب سے کہا تھا کہ تم اتنے مہنگے سگریٹ کہاں سے لے کر پیتے ہو؟ احمد گوالیار کا رہنے والا تھا۔ بمبئی کی گنجان آبادی والے ایک محلے میں اس کی بڑی بہن کا گھر تھا۔ وہ مجھے اس کے گھر لے گیا۔ اس کی بہن کا نام میں بھول گیا ہوں۔ بڑی شفیق خاتون تھی۔ اس نے مجھے کھچڑی پکا کر کھلائی تھی۔ احمد نے اسے یہ کہا یہ لڑکا ایکٹر بننے گھر سے بھاگ کر بمبئی آگیا ہے۔ میں اسے ایک دو دن میں کسی فلم میں کام دلا دوں گا۔ اتنے دن یہ یہیں رہے گا۔ رات میں نے اس شفیق خاتون کی چالی میں باہر راہ داری میں لیٹ کر بسر کی۔ دوسرے دن احمد وکٹوریہ لے کر آگیا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر تیار بیٹھا تھا۔ ہم پرکاش سٹوڈیوز کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ سٹوڈیوز بمبئی کے علاقے اندھیری میں واقع تھا۔ وہاں کسی سٹنٹ فلم کے کورس ڈانس کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ مجھے یاد ہے اس فلم کی ہیروئن پرمیلا تھی جو ان دنوں دوسرے درجے کی ہیروئن ہوا کرتی تھی اور ہیرو جے انت تھا جو سٹنٹ فلموں کا بڑا نامور ہیرو ہوتا تھا اور امجد خان کا والد تھا۔ کسی راجہ کے دربار کا سیٹ تھا۔ کافی رونق تھی۔ لکشمی بائی ایک طرف کرسی پر ڈانس کرنے والی لڑکیوں کے درمیان بیٹھی انہیں ہاتھ ادھر ادھر ہلا کر ڈانس کے گر سمجھا رہی تھی۔ جب وہ ذرا فارغ ہوئی تو احمد اور میں اس کے پاس گئے۔ وہ پان کھا رہی تھی۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ مجھے غور سے دیکھا اور احمد سے کہنے لگی۔

"احمد بھائی! میں اس کو اپنے پاس ملازم تو رکھ لیتی ہوں مگر کل کلاں کو ہرج مرج ہوگیا تو تم ذمے دار ہو گے۔ کیا کہتے ہو؟"

احمد بولا۔

"بائی جی! لڑکا بڑا شریف ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ تم کوئی فکر نہ

کرو۔"

وہ بولی۔

"فکر کی بات نہیں۔ بات ذمے داری کی ہے۔ یہ میرے گھر میں چوری کر کے بھاگ گیا تو میں رقم تم سے وصول کروں گی۔"

احمد نے ہنستے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"میں ذمے دار ہوں۔ میں بھر دوں گا رقم۔"

گوالیار کے رہنے والے اس وکٹوریہ بان کو میں کبھی نہیں بھول سکا۔ اس کا رنگ گہرا سانولا تھا اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے لیکن اس وقت جب وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر میری ذمے داری قبول کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا تو مجھے وہ کوئی آسمان کا فرشتہ لگ رہا تھا۔ وہ مجھے جانتا تک نہیں تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میں لکشمی بائی کے اصلی نقلی زیور یا نقدی چرا کر بھاگ جاتا مگر وہ میری حامی بھر رہا تھا۔ میری ضمانت دے رہا تھا۔ دنیا داری کا یہ رویہ نہیں ہوتا۔ اس کی روح اس کے جسم میں بیٹھی اسے کسی اور ہی راستے پر چلا رہی تھی۔ یہ وہ راستہ تھا جس پر چل کر آدمی دوسروں کو خوشیاں دیتا ہے اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہ راستہ جنت کو جاتا ہے یا دوزخ کو جاتا ہے۔ یہ مجھے نہ اس وقت معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے۔

لکشمی بائی نے مجھے اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ وہ کئی فلم کمپنیوں میں ایکسٹرا لڑکیوں کو ڈانس سکھاتی تھی۔ میرا کام ان تاریخوں کو کاپی پر لکھ لینا اور اسے وقت سے پہلے یاد کرا دینا تھا، جن تاریخوں میں اسے ڈانس کی ریہرسل یا شوٹنگ پر جانا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ لکشمی بائی کے لئے بازار سے سبزی لانا، اس کی ساڑھیوں کو استری کرنا بھی میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ رات کو میں وہیں کھولی کے کونے میں باریک تیلیوں والی صف پر سو جاتا تھا۔

لکشمی بائی کے ساتھ مجھے فلم سٹوڈیوز میں جا کر ڈانس کی شوٹنگ اور ہیرو ہیروئنوں کو دیکھنے کا موقع ملتا۔ اس زمانے میں رنجیت مووی ٹون کا سٹوڈیو' پرکاش سٹوڈیوز' ڈائریکٹر محبوب کا سنٹرل سٹوڈیو اور سہراب مودی کا منروا مووی ٹون کا سٹوڈیو بڑا مشہور تھا۔ کبھی کبھی وکٹوریہ والا احمد مجھ سے ملنے اور خیر خیریت دریافت کرنے آجاتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گذر گئے۔ میرا جی بڑا لگ گیا تھا۔ شبانہ کی یاد بھی کبھی

کبھی آتی تھی۔ اپریل کا مہینہ تھا کہ لکشمی بائی کو کسی فلم کی آؤٹ ڈور شوٹنگ پر جانا پڑ گیا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ بمبئی سے پچاس ساٹھ میل دور جنگل کے نیم پہاڑی علاقے میں آؤٹ ڈور شوٹنگ تھی۔ فلم کا سارا عملہ ہیرو ہیروئن اور ڈانس کرنے والی لڑکیوں کے ساتھ لوکیشن پر پہنچ گیا۔ بڑا خوبصورت جنگل کا علاقہ تھا۔ ایک طرف سرسبز پہاڑیاں تھیں۔ ان کی وادی میں ایک جگہ ڈانس کے لئے سیٹ لگا ہوا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں پہلے سے چھ سات خیمے بھی لگا دیئے گئے۔ یونٹ کو یہاں تین چار دن رہنا تھا اور دو گانے پکچرائز کرنے تھے۔

اس پر فضا پہاڑی علاقے میں آکر میں اس طرح خوش تھا جیسے میں اپنے گھر میں آگیا تھا۔ ذرا فرصت ملتی تو میں ادھر ادھر جنگل میں گھومنے پھرنے نکل جاتا۔ یہاں بڑے اونچے اونچے تاڑ، ناریل اور املی کے درخت تھے۔ کہیں کہیں پہاڑی نالے بھی تھے جن میں چاندی ایسا شفاف پانی چھوٹے بڑے پتھروں سے ٹکرا کر بہہ رہا تھا۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں گھومتا پھرتا جنگل میں دوسری پہاڑی کی طرف نکل گیا۔ یہاں آتے ہی ایک دم جیسے منظر بالکل ہی بدل گیا ہو۔ پھولوں والی جنگلی بیلیں جگہ جگہ درختوں پر جھول رہی تھیں۔ بھورے رنگ کی بڑی بڑی چٹانوں کی سلیں زمین سے نکل کر آڑھی ترچھی کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان چشمہ بہہ رہا تھا۔ سامنے دو چٹانوں کے درمیان چھوٹی سی آبشار کا پانی گر رہا تھا۔ جنگلی پھولدار بیلیں چٹانوں کے اوپر تک چلی گئی تھیں۔ ایک طرف جنگلی کیلوں کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دوسری جانب گل مہر کے سرخ پھولوں والے درختوں کے درمیان ایک پتلی سی پگڈنڈی چلی جا رہی تھی۔ مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے یہ پگڈنڈی جنت کی طرف جاتی ہے۔ میں بے اختیار ہو کر اس پگڈنڈی پر چل پڑا۔ تھوڑا آگے جا کر چڑھائی شروع ہو گئی۔ پتھروں کو جوڑ کر وہاں خدا جانے کس نے سیڑھیاں سی بنا دی تھیں۔ لگتا تھا اوپر کسی کا گھر ہے۔

گل مہر کے سرخ پھولوں والے درخت یا پودے پگڈنڈی کی دونوں جانب میرے ساتھ ساتھ اوپر جا رہے تھے۔

دن کا وقت تھا۔ نیلا آسمان بالکل صاف تھا۔ چمکیلی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ چڑھائی چڑھ کر میں اوپر گیا تو دیکھا کہ ایک کھلی سرسبز جگہ پر آگیا ہوں۔ ایک طرف کیلے کے درختوں کی دیوار تھی۔ سامنے کی جانب تین مخروطی چٹانیں سینہ تانے کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان ایک تنگ سا راستہ تھا۔ جو چٹانوں کے دوسری طرف جاتا تھا۔ دائیں جانب والی چٹان کے شگاف میں سے چشمے کا پانی نکل کر سرسبز قطعے کے وسط سے ہوتا ہوا نیچے آبشار بن کر گر رہا تھا۔ میں اصل میں اس پہاڑی کے اوپر آگیا تھا جس کی ڈھلان پر چٹانیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور جن کے درمیان سے ہو کر گرنے والی آبشار کو میں نے نیچے کھڑے ہو کر دیکھا تھا۔ چشمہ ایک نالے کی شکل میں بہہ رہا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ میں نے ایک گھونٹ پیا۔ پانی میٹھا بھی تھا۔ میں نے خوش ہو کر چہرے پر پانی کا چھینٹا مارا۔ میرا چہرہ گرم ہو گیا۔ درختوں کے اوپر سے کوئی چڑیا بولتی ہوئی گذر گئی۔ میں اس تنگ راستے کی طرف چل پڑا جو دو اونچی بلند زمرد کی طرح سبز چٹانوں کے درمیان سے ہو کر دوسری طرف جاتا تھا۔ میں دوسری طرف آیا تو میری آنکھوں کے سامنے اس جنگل کا سب سے حسین منظر تھا۔ ہری گھاس کا ایک چھوٹا سا میدان تھا۔ کناروں پر کیلے کے درختوں کے جھنڈ ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ ان میں زرد پھولوں کی کیاری تھی۔ درمیان میں ایک گھنا درخت تھا جس پر کاسنی اور سفید پھولوں کی بیلیں لٹک رہی تھیں۔ درخت کے نیچے مٹی کا گول چبوترا بنا ہوا تھا۔ سامنے بانس کی چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کی آدھی دیوار اور بانس کی ڈھلواں چھت زرد پھولدار بیلوں میں چھپی ہوئی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا جھونپڑی کے قریب آیا۔ جھونپڑی کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ ٹاٹ کا پردہ تھا جسے اٹھا کر چھت پر ڈال دیا گیا تھا۔ میں نے جھک کر جھونپڑی کے اندر دیکھا۔ چمکیلے دن کی دھوپ میں مجھے جھونپڑی کے اندر سوکھے گھاس کا فرش دکھائی دیا۔ فرش کے وسط میں کیلے کے چوڑے پتوں کو جوڑ کر ایک تھال سا بنا دیا گیا تھا جس میں گیندے کے زرد پھولوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ بانس کی دیوار کے ساتھ پانی کی صراحی رکھی ہوئی تھی۔ صراحی کے اوپر مٹی کا آبخورہ الٹا پڑا تھا۔ میں نے سوچا۔ یہاں ضرور کوئی سادھو جوگی رہتا ہو گا۔ میں وہاں سے ایک طرف ہٹ گیا۔ جھونپڑی کے نیلے پھولوں کے پہلو میں ایک پتلی سی پگڈنڈی ترناری کے نیلے پھولوں کی جھاڑیوں کے درمیان سے گذرتی تھی۔ یہاں اوپر بڑے تناور اور گھنے درخت تھے۔ فضا میں سبزے اور پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ میں ترناری کے نیلے پھولوں والی جھاڑیوں کے درمیان آہستہ آہستہ چلتا ذرا آگے گیا تو مجھے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ ایک آدمی دوسرے کو کہہ رہا تھا۔

"آخر کہاں گئی ہو گی؟"
دوسرے آدمی کی آواز آئی۔
"اوپر جھونپڑی کے پاس چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ آئے گی تو وہیں دبوچ لیں گے۔"

میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ ضرور یہ کوئی چور ڈاکو ہیں۔ میں جلدی سے جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ پگڈنڈی دو قدم آگے جا کر دائیں جانب مڑ گئی تھی۔ دونوں آدمی وہاں نمودار ہوئے اور باتیں کرتے میری طرف بڑھے۔ ان کا لباس اس علاقے کے دیہاتیوں جیسا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ان میں سے ایک آدمی کے کندھے پر دو نالی بندوق لٹک رہی تھی۔ وہ باتیں کرتے ہوئے ان جھاڑیوں کے قریب سے گذر گئے جن کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوا کہ وہ ادھر کسی عورت کو اٹھانے آئے ہیں۔ ان کی باتوں کے مطابق وہ عورت اس جھونپڑی میں ہی رہتی تھی جو میں دیکھ کر آ رہا تھا اور جو خالی پڑی تھی۔

جب یہ دونوں آدمی پگڈنڈی پر سے گذر کر چٹانوں کے پیچھے میری نظروں سے اوجھل ہو گئے تو میں آہستہ سے جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ اب میں جھونپڑی کی طرف جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا کہ وہ دونوں آدمی جو خونی ڈاکو ہیں، جھونپڑی کے قریب ہی کسی جگہ چھپ کر بیٹھے ہوں گے۔ میں ادھر گیا تو وہ مجھے پکڑ لیں گے۔ چنانچہ میں واپس جانے کی بجائے پگڈنڈی پر آگے چلنے لگا۔ پگڈنڈی بائیں جانب مڑ گئی۔ میں بھی اس طرف مڑ گیا۔ یہاں دونوں جانب اونچی اونچی جھاڑیاں تھیں۔ میں چند قدم چلا ہوں گا کہ اچانک میں نے ایک عورت کو دیکھا جو جھاڑیوں میں سے نکل کر پگڈنڈی پر آئی تھی۔ اس نے زرد رنگ کی سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سیاہ بال شانوں پر کھلے تھے۔ ایک ہاتھ میں منڈل تھا۔ دوسرے ہاتھ میں کسی جنگلی پھولوں کی شاخ تھی۔ وہ بڑے سکون سے قدم رکھتی چلی آ رہی تھی۔ میں پگڈنڈی کے درمیان میں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی میری طرف دیکھتی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ درختوں میں سے دھوپ چھن چھن کر اس کے زرد لباس پر پڑ رہی تھی زرد لباس میں سے زرد روشنی نکل کر اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور اس کا چہرہ گیندے کے پھول کی طرح دمک رہا تھا۔ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے سورج نے اس کا منہ چوم کر اسے ہمیشہ کے لئے سنہری کر دیا ہے۔ میں نے

ایسا جلال و جمال والا چہرہ پہلے کسی عورت کا نہیں دیکھا تھا۔ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر آ کر وہ رک گئی۔ اس کے چہرے پر ایک شیریں تبسم تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہی وہ عورت ہے جس کو وہ دونوں آدمی اغوا کرنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اس عورت کے پرشکوہ حسن اور گہرے خاموش تبسم نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا مگر میں اسے بچانا بھی چاہتا تھا۔ اتنے میں اس پراسرار عورت نے بڑی شیریں اور پرسکون آواز میں مجھ سے پوچھا۔
"تم کون ہو؟"
میں نے جلدی سے کہا۔
"کیا تم اوپر والی جھونپڑی میں رہتی ہو؟"

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی ابھی میں نے دو آدمیوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ اسے اغوا کرنے آئے ہیں اور اس کے انتظار میں اوپر اس کی جھونپڑی کے پاس چھپ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کے پاس دونالی بندوق بھی ہے۔

اس عورت نے پرسکون انداز میں میری ساری بات سنی۔ اس کے چہرے پر جو گہرا اور موہوم سا تبسم تھا۔ اس میں ذرا سا بھی فرق نہ آیا۔ پھر اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک گہرا سانس لیا اور واپس مڑ گئی۔ جب وہ ان اونچی جھاڑیوں کے پاس پہنچی جہاں سے میں نے اسے باہر آتے دیکھا تھا تو رک گئی۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور جھاڑیوں میں چلی گئی۔ میں بھی تیز تیز چلتا ہوا جھاڑیوں میں اتر گیا۔ جھاڑیوں میں تھوڑی سی اترائی تھی۔ آگے زمین ہموار ہو گئی تھی مگر یہاں اتنا جنگلی جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا کہ پگڈنڈی ان میں چھپ گئی تھی۔ زرد پوش پراسرار عورت مجھ سے دو قدم آگے چل رہی تھی۔ اس کے لباس میں سے ایک عجیب سی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ آگے چھ سات اونچی چٹانیں آ گئیں جو ایک دوسری کے اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ ان پر سیاہ کائی جمی ہوئی تھی۔ زرد پوش عورت ان چٹانوں کے پیچھے آ گئی۔ میں اس کے حکم کے مطابق پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

چٹانوں کے عقب میں جاتے ہی میں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ قدرت نے یہاں جنگلی حسن کے زر و جواہر لٹائے ہوئے تھے۔ عجیب رنگوں کے پھول دھوپ میں چمک

رہے تھے۔ چاروں طرف اونچی اونچی چٹانیں تھیں جو زرد سفید اور کاسنی رنگ کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے ان چٹانوں پر سے پھولوں کی آبشاریں گر رہی ہیں۔ درمیان میں ایک چھوٹا سا تالاب تھا جس میں سفید اور گلابی کنول کے پھول کھلے تھے۔ جنگل میں میں نے ایسا حسین منظر شاید ہی دیکھا ہو۔ لگتا تھا جنت کا ایک ٹکڑا آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے۔ ایک طرف مولسری کا پیڑ تھا جس کے نیچے چھوٹے چھوٹے مولسری کے سفید پھولوں کی چادر سی بچھی ہوئی تھی۔ ہوا خوشبوؤں کے سانس لے رہی تھی۔

زرد پوش عورت مولسری کے درخت کے پاس جا کر رک گئی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں ہری ہری نرم گھاس پر چلتا اس کے پاس آیا تو وہ پھولدار بیلوں سے ڈھکی ہوئی اونچی اونچی جھاڑیوں کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے آگے بڑھی۔ ان جھاڑیوں میں دو قدم چلنے کے بعد چٹان کے اندر بنے ہوئے قدرتی غار کا دہانہ نمودار ہوا۔ یہ غار کا منہ تھا جو جنگلی گھاس میں آدھے سے زیادہ چھپا ہوا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

"تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں"

"اندر آ جاؤ۔"

وہ غار میں داخل ہو گئی۔ غار کی چھت میرے سر سے کوئی تین چار فٹ اونچی تھی۔ وہ اتنی کشادہ تھی کہ چار آدمی ساتھ لگ کر چل سکتے تھے۔ میں نے جنگلوں میں بڑے قدرتی غار دیکھے تھے۔ ان میں جالے لٹک رہے ہوتے تھے مگر یہ غار صاف تھا۔ کچھ دور تک غار کے دہانے پر سے سورج کی روشنی ہمارے ساتھ آئی۔ پھر اندھیرا ہو گیا۔ میں رک گیا۔ مجھے زرد پوش عورت کا ہیولا سا ہی نظر آ رہا تھا۔ وہ جھک کر بائیں جانب مڑ گئی۔ مجھے ماچس کی تیلی جلانے کی آواز آئی۔ ساتھ ہی روشنی ہو گئی۔ میں نے دیکھا وہ جھک کر مٹی کا چراغ جلا رہی تھی۔ چراغ کی روشنی ہو گئی۔ یہ ایک اونچی چھت والا کھوہ یا شگاف تھا۔ زمین پر ہرن کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ اس کے سوا وہاں کچھ نہیں تھا۔ زرد پوش عورت نے اپنا کرمنڈل اور پھولوں والی شاخ جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ ایک طرف رکھ دی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ چراغ کی نرم روشنی میں اس کا چہرہ مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اتنی

خوبصورت عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی تھی مگر اس کے حسن میں ایک ملکوتی احساس تھا۔ لگتا تھا روشنی کا غبار اس کے ساتھ چل کر وہاں تک آیا ہے اور اب اس زرد پوش عورت کے اردگرد اس روشنی نے اک ہالہ بنا دیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ سب کچھ صرف میری آنکھوں کو ہی نظر آ رہا ہو۔ حقیقت میں ایسا نہ ہو لیکن مجھے جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ اس قدر پاکیزہ' شفاف اور نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا کہ مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر زمین سے بلند ہوتا محسوس ہونے لگا تھا۔

میں نے سکول کی کتابوں میں کپل وستو کے شہزادے گوتم بدھ کی کہانی پڑھی تھی۔ اس کتاب میں گوتم بدھ کی ایک تصویر بھی تھی۔ کتاب میں یہ بھی لکھا تھا کہ گوتم بدھ کے ماننے والے بھکشو اور بھکشو عورتیں زرد کپڑے پہنتی ہیں اور یہ لوگ اپنا سر منڈا دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ عورت بھی گوتم بدھ کی ماننے والی ہے مگر مجھے تعجب اس بات پر تھا کہ اس نے اپنا سر نہیں منڈوایا ہوا تھا۔ اس کے سر کے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور اس جنگل میں اکیلی کیوں رہ رہی ہے اور وہ لوگ کون تھے جو اس کو اغوا کرنے آئے تھے؟ ابھی یہ سارے سوال میرے ذہن میں ہی تھے کہ وہ عورت بڑے میٹھے لہجے میں کہنے لگی۔

"میرا نام چندر مکھی ہے۔ میں کیسرواڑی گاؤں کے سب سے بڑے پجاری کی بیٹی ہوں۔ ہم لوگ چار ویدوں اور اپنشدوں کے ماننے والے بڑے سخت برہمن ہیں۔ بچپن ہی سے مجھے دیوی دیوتاؤں کی پوجا ناپسند تھی۔ میرا پجاری باپ مجھ سے دیوی دیوتاؤں کی آرتی اترواتا تو میں سوچتی کہ یہ پتھر کے بت انسان کو کیا دے سکتے ہیں۔ یہ تو خود بے جان ہیں۔ میں جوان ہوئی تو میرے باپ نے مجھے ہندی اور سنسکرت پڑھائی۔ وید کے اشلوک یاد کرائے۔ ایک بار میں نے گوتم بدھ کی پوجا ہوتے دیکھی۔ مجھے گوتم بدھ کا پرسکون چہرہ بڑا اچھا لگا۔ پھر میں نے اس کی زندگی کے حالات پڑھے اور میں نے یہ بھی پڑھا کہ گوتم بدھ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف تھا اور وہ صرف ایک خدا کو مانتا تھا اور اسی کی پرستش کرتا تھا۔ اسی دن سے میں گوتم بدھ کی بھکشنی بن گئی لیکن میں نے اپنے دل کا بھید کسی پر ظاہر نہ کیا۔ میرے باپ نے ایک برہمن پجاری سے میری شادی کر دی۔ ایک برس گذرا ہو گا کہ میرا خاوند بیماری کی وجہ سے مر گیا۔ ہمارے گاؤں کے برہمنوں میں اس عورت کو ستی کر دیا جاتا

ہے جس کا خاوند مر جاتا تھا۔ جب میرا خاوند مرگیا تو مجھے اس کی لاش کے ساتھ چتا پر زندہ جلانے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میرا باپ بڑھ چڑھ کر ان تیاریوں میں شریک تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق مرے ہوئے خاوند کی بیوی اس کے ساتھ چتا کی آگ میں جل کر مرجاتی ہے تو اگلے جنم میں دونوں ساتھ ساتھ رہتے ہیں مگر میں ان باتوں کو نہیں مانتی تھی۔

گوتم بدھ نے اس رسم کو ظلم کہا تھا۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہو جائے میں اپنے خاوند کی لاش کے ساتھ زندہ نہیں جلوں گی۔ ستی ہونے والی عورت کو رسم کے مطابق ایک الگ کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا ہے۔ جس روز اسے ستی ہونا ہوتا ہے اس کے بدن پر کیسر ملا جاتا ہے۔ پجاری لڑکیاں اس کے سامنے بیٹھ کر اشلوک گاتی ہیں۔ پھر آدھی رات کے بعد وہ چلی جاتی ہیں۔ مجھے سورج نکلنے سے پہلے ستی ہونا تھا۔ میرے خاوند کی لاش میری کوٹھڑی میں میرے آگے زمیں پر پڑی تھی۔ سب لوگ مجھے کوٹھڑی میں بند کرکے چلے گئے۔ میری ایک راز دار سہیلی تھی جس کا نام موہنی تھا' میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں ستی نہیں ہوں گی اور آدھی رات کے بعد کوٹھڑی سے بھاگ جاؤں گی۔ موہنی نے میرا ساتھ دیا۔ آدھی رات کے بعد جب سب گھر والے مجھے کوٹھڑی میں بند کرکے میرے خاوند کی لاش کے پاس چھوڑ کر سو گئے تو موہنی نے چپکے سے اٹھ کر کوٹھڑی کا دروازہ باہر سے کھول دیا۔ میں دبے پاؤں اٹھی اور کوٹھڑی سے باہر نکل گئی۔ ہمارا چھوٹا سا کچا مکان تھا۔ صحن میں چارپائی پر میرا باپ اور دوسرے پجاری جنہوں نے صبح مجھے لاش کے ساتھ زندہ جلانا تھا۔ گہری نیند سو رہے تھے۔ میں ان کے قریب سے ہو کر آہستہ آہستہ پاؤں رکھتی گذر گئی۔ میری سہیلی نے میرے لئے وہاں ایک چھوٹی سی کشتی رات کو ہی باندھ رکھی تھی۔ میں گاؤں کی اندھیری سنسان گلیوں میں سے گذرتی دریا کنارے آ گئی۔ کشتی دریا کے کنارے رسے سے بندھی ہوئی تھی۔ کشتی میں بیٹھ کر میں نے رسی کھول دی۔ کشتی دریا کے تیز بہاؤ کے ساتھ بہنے لگی۔ کشتی میں ایک چپوار بھی تھا۔ میں نے کبھی کشتی نہیں چلائی تھی مگر مچھیروں کو کشتی چلاتے دیکھا تھا۔ میں نے چپوار تھام لیا۔ پانی کا بہاؤ بڑا تیز تھا۔ میں اس طرح چپو چلانے لگی کہ کشتی دریا کے کنارے سے دور دور رہے۔ جب سورج کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو ایک شہر آگیا۔ دریا کی لہریں ایک بڑے مندر کے گھاٹ کے سامنے سے ہو کر گزرتی تھیں۔ کشتی کو گھاٹ کی

سیڑھیوں تک لا کر میں وہاں اتر گئی۔ کشتی میں نے وہیں چھوڑ دی۔ مندر میں جانے کے بجائے میں شہر میں آگئی۔ میں نے تھوڑے سے سونے کے زیور پہن رکھے تھے۔ میں نے ایک صراف کے پاس اپنے سارے زیور بیچ ڈالے۔ مجھے کافی پیسے مل گئے۔ وہاں سے میں سیدھی ریلوے سٹیشن پر آگئی۔"

اس کے بعد چندر مکھی نے مجھے اپنی زندگی کی جو کہانی سنائی اسے میں مختصر بیان کرتا ہوں ---- چندر مکھی نے چونکہ بدھ مت اختیار کر لیا تھا اس لئے وہ وہاں سے ٹرین میں سوار ہو کر صوبہ بہار میں واقع گیا کے شہر میں آ گئی۔ یہاں بدھ مذہب کی روایات کے مطابق گوتم بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ ہندوستان میں تو بدھ مت کو برہمنوں نے دیس نکالا دے دیا تھا لیکن باہر سے آنے والے بدھ مت کو ماننے والوں نے گیا کے مقام پر ایک معبد بنا دیا ہوا ہے جہاں گوتم بدھ کی پوجا ہوتی ہے۔ چندر مکھی کو معلوم تھا کہ گوتم بدھ پتھر کے بتوں کی پوجا کے سخت خلاف تھا۔ وہ تین دن وہاں رہی مگر اس نے گوتم بدھ کے بت کی پوجا بالکل نہ کی۔ یہاں سے وہ کسی طرح بھوٹان پہنچ گئی۔ بھوٹان میں اس نے ایک بدھی خانقاہ میں تین سال گذارے۔ اس دوران اس نے پالی زبان سیکھی اور بدھ مت کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہاں سے وہ تبت چلی گئی۔ وہاں دو سال تک گیان دھیان میں مشغول رہی۔ اس کے بعد واپس ہندوستان آ کر اس نے اس جنگل میں اپنی ایک خفیہ گپھا بنا لی اور ایک سال سے وہ یہاں گیان دھیان اور تپسیا میں مشغول تھی۔

جب وہ اپنی ساری کہانی سنا چکی تو میں نے اس سے پوچھا کہ گیان دھیان اور تپسیا سے اسے کیا ملے گا؟

چندر مکھی کے چہرے پر ہلکا سا تبسم بدستور موجود تھا۔ کہنے لگی۔

"یہ میں بھی نہیں جانتی لیکن میں زندگی ایک خدا کی پرستش کرتے گذار دینا چاہتی ہوں۔ جس کی ہدایت کپل وستو کے شہزادے گوتم بدھ نے کی ہے۔"

اب اس نے مجھ سے میرے بارے میں پوچھا کہ میں کون ہوں اور اس جنگل میں کیسے آگیا ہوں۔ میں نے اسے اپنی ناکام محبت کی داستان تو نہ سنائی۔ یہی بتایا کہ میں بمبئی میں ایک فلم کمپنی میں ملازم ہوں۔ یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے اس علاقے میں آیا ہوں۔ جنگل مجھے بڑا خوبصورت لگا۔ سیر کرتا کرتا اس کے جھونپڑے کے پاس آگیا۔ گیندے کے پھولوں کے ڈھیر کو دیکھ کر تجسس پیدا ہوا کہ

یہاں ضرور کوئی جوگی وغیرہ رہتا ہوگا۔ بس پھرتا پھراتا ایک پگڈنڈی پر نکل آیا۔ یہاں میں نے دو آدمیوں کو باتیں کرتے سنا۔ وہ کسی عورت کو اغوا کرنے کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک آدمی کے پاس دونالی بندوق بھی تھی۔ وہ آگے نکل گئے تو مجھے تم نظر آگئیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ آدمی تمہیں اغوا کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ اپنا فرض سمجھ کر میں نے تمہیں خطرے سے آگاہ کر دیا۔

چندرمکھی خاموش نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر بے معلوم سا تبسم تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

"تمہیں یہاں سے کسی اور جگہ چلے جانا چاہئے۔ دونوں آدمی تمہاری جھونپڑی کے آس پاس چھپ کر بیٹھے ہیں۔ وہ تمہیں اٹھا کر لے جائیں گے۔"

میری بات سن کر وہ خاموش رہی۔ پھر آہستہ سے کہا۔

"بھگوان بدھ میری مدد کریں گے۔"

میں اس نامعلوم عورت کو ڈاکوؤں سے بچانا چاہتا تھا جو بندوق لئے اس کے انتظار میں اوپر چٹانوں کے پاس اس کی جھونپڑی کی جھاڑیوں میں چھپے بیٹھے تھے مگر میں نے محسوس کیا کہ چندرمکھی خوف زدہ بالکل نہیں تھی۔ اس کا چہرہ ویسے کا ویسا پرسکون تھا۔ یہاں میں اپنے دل کی بات ضرور بتا دینا چاہتا ہوں، چاہے آپ میرے بارے میں کچھ بھی سوچیں۔ میرے دل کی بات یہ تھی کہ مجھے اس عورت چندرمکھی سے محبت ہو گئی تھی۔ اس محبت کے محرکات کیا تھے؟ مجھے ان سے کوئی غرض نہیں تھی۔ بس میں چاہتا تھا کہ اس کے پاس ہی بیٹھا رہوں اور اس سے کبھی جدا نہ ہوں۔ میں نے پوچھا۔

"کیا یہاں تمہارا کوئی دشمن بھی ہے؟ آخر یہ لوگ تمہیں نقصان پہنچانے آئے ہیں تو ضرور کوئی بات ہوگی۔"

وہ بولی۔

"میرا کوئی دشمن نہیں۔ میرا کوئی دوست نہیں۔"

وہ چپ ہو گئی۔ مٹی کا چراغ جل رہا تھا۔ اس کی بتی ذرا نیچی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا اونچا کر دیا۔ چندرمکھی کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھرے جیسے وہ کسی بات پر غور کر رہی ہو۔ کہنے لگی۔

"ایک شکاری کچھ روز ہوئے یہاں آیا تھا۔ میں اپنی جھونپڑی کے باہر

درخت کے چبوترے پر بیٹھی گیان دھیان میں مشغول تھی کہ وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ہاتھ کھینچ کر اسے ڈانٹا کہ پرائی عورت کو چھیڑنا اچھی بات نہیں۔ اس نے مجھے کھینچ کر چبوترے سے نیچے اتارا اور مجھ سے دست درازیاں کرنے لگا۔ میں نے اسے دھکا دے کر گرا دیا اور وہاں سے بھاگ کر اس غار میں آکر چھپ گئی۔ مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ آدمی اسی شکاری نے بھیجے ہوں گے۔"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تم یہیں بیٹھو۔ میں جا کر معلوم کرتا ہوں کہ وہ لوگ ابھی تک وہیں ہیں یا چلے گئے ہیں۔"

مجھے چندرمکھی نے نہ روکا۔ وہ ہرن کی کھال پر اسی طرح بیٹھی رہی۔ میں غار سے نکلنے کے بعد دوسری جانب کے درختوں کے پیچھے سے ہو کر چٹانوں کے عقب میں اس تختے پر کی جانب آیا جہاں چندرمکھی کا جھونپڑا تھا۔ میں جھونپڑے کے بالمقابل جھاڑیوں کے عقب میں آگیا تھا۔ اب مجھے دونوں آدمیوں کی تلاش تھی۔ میں چند قدم پیچھے کی طرف ہٹ گیا۔ ادھر کیلے کے درختوں کی قطار تھی۔ یہاں دبے پاؤں چل کر میں ان لوگوں کا سراغ لگانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے بیڑی کے تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔ میں رک گیا۔ پھر جھک کر درختوں کی اوٹ لیتا، جدھر سے تمباکو کی بو آ رہی تھی اس طرف چلتا گیا۔ اچانک کوئی آہستہ سے کھانسا۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی قریب ہی جھاڑیوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بالکل خاموشی چھائی رہی۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا۔

"رانا جی کو چل کر کہہ دیتے ہیں وہاں کوئی نہیں تھا۔ جھونپڑی خالی پڑی تھی۔"

دوسرے آدمی نے کہا۔

"مرے کیوں جاتے ہو۔ تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں۔ شاید آ جائے۔"

دس پندرہ سیکنڈ کی خاموشی کے بعد پہلے والا آدمی دوبارہ بولا۔

"ہریا! شام ہو گئی تو راج گیری جانے والی گاڑی چھوٹ جائے گی۔ میری مانو، رانا جی کو کہہ دیں گے کہ ہم نے سارا جنگل چھان مارا تھا۔"

"چلو پھر چلتے ہیں۔"

مجھ سے کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ آدمی اٹھ کر ایک طرف چل پڑے۔ میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ایک آدمی کے کندھے سے دو نالی بندوق لگی تھی۔ یہ وہی آدمی تھے جنہیں میں نے پہلے اس طرف آتے دیکھا تھا۔ کچھ فاصلہ ڈال کر میں بھی ان کے پیچھے پیچھے جانے لگا۔ وہ درختوں کے جھنڈ میں جا کر پہاڑی کے نشیب میں اس طرف اتر گئے جدھر سے میں یہاں آیا تھا۔

میں وہاں سے واپس چندر مکھی کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ وہ دونوں مایوس ہو کر چلے گئے ہیں۔ چندر مکھی اسی طرح بیٹھی تھی جس طرح میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ اس طرح بیٹھے بیٹھے وہ بالکل نہیں تھکی تھی۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھنے سے آدمی کی ٹانگیں اکڑ جاتی ہیں۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ کسی رانا جی کا نام لے رہے تھے تو وہ بولی۔

"یہ وہی شکاری ہو گا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔"

میں نے کہا۔

"چندر مکھی جی! تم یہاں پر محفوظ نہیں ہو۔ یہاں سے کہیں اور چلی جاؤ۔ ہو سکتا ہے اب کی بار وہ رانا خود ان کے ساتھ آئے۔"

چندر مکھی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہیں اور جانے سے کیا ہو گا۔ اگر بھگوان بدھ نے مجھے بچانا ہے تو وہ یہاں بھی مجھے بچا لیں گے۔ ہاں تم ضرور چلے جاؤ۔ تم اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالو۔"

میرے دل کی یہ کیفیت تھی کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اس سے الگ ہو کر ان جرائم پیشہ آدمیوں کو دیکھنے گیا تھا تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں اپنی کوئی بڑی قیمتی شے پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ میں اس پارسا عورت کے طلسم کا اسیر ہو چکا تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں فلم یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ کی غرض سے ان پہاڑوں پر آیا ہوں اور لکشمی بائی کو میرا انتظار لگا ہو گا۔ میں نے اپنے دل سے کہا۔ اے دل! آسمانی محبت کا چاند تیری زندگی کے آسمان پر طلوع ہوا ہے۔ اسے چھوڑ کر مت جانا۔ اسے چھوڑ کر جاؤ گے تو دنیا کے اندھیروں میں بھٹک جاؤ گے۔ ساری عمر بھٹکتے رہو گے اور منزل کا سراغ تک نہیں ملے گا۔

میری منزل کیا تھی؟ اس کا مجھے بالکل علم نہیں تھا۔ بس میری آنکھوں کے

سامنے ایکدم روشنی ہی روشنی ہو گئی تھی۔ میں اس روشنی میں شرابور تھا۔ میری زندگی کا بھٹکا ہوا سیارہ چندر مکھی کے حلقہ کشش میں آ کر اس کے گرد گردش کرنے لگا تھا۔ اب اس حلقہ کشش سے نکلنا میرے بس میں نہیں تھا۔ میں نے بے اختیار ہو کر کہہ دیا۔

"دیوی! میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے پاس رہ کر تمہاری خدمت کروں گا۔"

وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ گپھا کی فضا ساکن تھی۔ چراغ کی لو بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ اس کی روشنی، چندر مکھی کے زرد لباس سے مل کر اس کے حسین اور نورانی چہرے کو اور زیادہ مقدس بنا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟"

اچانک مجھے ایسے لگا جیسے میری پہلی محبت شبانہ مجھ سے ہمکلام ہے۔ میری آنکھوں میں اپنے آپ آنسو آ گئے۔ چندر مکھی کی مسکراہٹ غائب ہو گئی اور چہرے پر تجسس کے اثرات ابھر آئے۔

"کیا تمہیں مجھ سے پریم ہو گیا ہے؟"

میں نے روتے ہوئے کہا۔

"مجھے نہیں پتہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔"

اور میں نے آنسوؤں سے بھیگتا چہرہ اپنے بازوؤں میں چھپا لیا۔ چندر مکھی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ہاتھوں میں سے مجھے گرم شعاعیں نکلتی محسوس ہوئیں۔ ان شعاعوں کی حرارت جیسے میرے جسم میں داخل ہو کر اسے لطیف سے لطیف تر بنا رہی تھی۔ مجھے اپنے اوپر سورج سے بچھڑی ہوئی دھوپ کا گمان ہونے لگا۔ مجھے چندر مکھی کی دل کو سکون عطا کرنے والی آواز سنائی دی۔

"تمہارے ماتا پتا تمہارے بغیر پریشان ہوں گے۔ تمہیں ان کے پاس واپس چلے جانا چاہئے۔"

میں نے بازوؤں میں سے سر اٹھا کر کہا۔

"یہاں میرے کوئی ماتا پتا نہیں ہیں۔ میں ان سے بہت دور نکل آیا ہوں۔"

میں نے بڑی جرات سے کام لیتے ہوئے چندر مکھی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

لے لیا اور التجا کی۔

"مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کرو دیوی! مجھے اپنے آپ پر کوئی اختیار نہیں رہا۔ تم سے جدا ہو کر میں زندہ نہ رہ سکوں گا۔"

میری اور اس زردپوش عورت میں کچھ نہیں تو بیس بائیس سال کا فرق ہو گا لیکن محبت زمان و مکان کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ کم از کم اس وقت مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جب میں چراغ کی روشنی میں دمکتے ہوئے چہرے والی خوبصورت چندر مکھی کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور اپنے کندھے پر سے کھسک کر نیچے آیا ہوا زرد لبادہ اوپر کرتے ہوئے بولی۔

"تم شہر کے کھانوں کے عادی ہو۔ یہاں تمہیں جنگلی پھل پھول اور چشمے کے پانی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

میں نے محبت کے جوش میں کہا۔

"میں تمہارے پاس بغیر کچھ کھائے پئے بھی رہ لوں گا۔"

وہ ہنسنے لگی۔ میں اس کی صورت کو تک رہا تھا جس میں سے مجھے شعاعیں سی نکلتی نظر آ رہی تھیں۔ کیا یہ میری محبت بھری نظروں کا فریب تھا؟ کیا یہ میرے لڑکپن کی نادانی تھی؟ اس وقت یہ باتیں نہ میرے ذہن میں آ رہی تھیں نہ میں انہیں سمجھ ہی سکتا تھا۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد اب مجھے معلوم ہوا کہ وہی میری زندگی کی سب سے بڑی دانشمندی تھی۔ اس وقت میں نہیں بول رہا تھا۔ میرے جسم کے اندر سمائی ہوئی نورانی روح بول رہی تھی جو اپنی گمشدہ جنت سے بچھڑنے کے بعد جنگلوں، جنگلوں کی بارشوں میں بھیگتے سرخ زرد سفید گلابوں، خدا کی حمد و ثناء کرنے والے رنگین پرندوں، نورانی چہروں، چاندنی راتوں میں خاموشی سے بہنے والے دریاؤں، طوفانی سمندروں، بارش میں بھیگتے خاموش ریلوے پلیٹ فارموں، پارکوں میں کھیلتے بچوں اور سورج کے طلوع و غروب کے منظروں میں اسی گمشدہ جنت کو تلاش کر رہی تھی۔ مجھے آج بھی یاد نہیں آتا کہ چندر مکھی کا جسم کس طرح کا تھا۔ جب نگاہوں میں روح کا نور سمایا ہو تو وہ نگاہ جسم کو نہیں اس جسم کی روح کو دیکھتی ہے۔ آپ اسے میری بیوقوفی، حماقت اور جو جی چاہے کہہ لیں لیکن میں آج بھی اپنی اس بیوقوفی اور حماقت کو زندگی کی سب سے قیمتی متاع جان کر سینے سے لگائے ہوئے ہوں اور اگر افلاطون اور آئین شائن دنیا میں واپس آ کر مجھے کہیں کہ ہمارے مکالمات اور

نظریہ اضافیت لے کر اپنی یہ بیوقوفی اور حماقت ہمیں دے دو تو میں کبھی نہ دوں گا۔

چندر مکھی مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ خوشبو اور روشنی بن کر میری روح میں اتر رہی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"جیسے تمہاری مرضی۔"

مجھے ایسے لگا جیسے واقعی میں نے دنیا کی سب سے قیمتی چیز کو حاصل کر لیا ہے۔ وہ کہنے لگی۔

"تم مسلمان ہو۔ تم اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرنا۔ میری طرف مت دیکھنا کہ میں کس طرح خدا کی عبادت کرتی ہوں۔"

میں نے کہا۔

"میں نماز پڑھ لوں گا۔"

وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تمہارے مذہب نے تمہیں جو راستہ دکھایا ہے ہمیشہ اس راستے پر چلتے رہنا۔ برائی کا خیال انسان کے دل میں ضرور آتا ہے جب یہ خیال آئے تو اپنی روح کی ساری طاقت لگا کر اس خیال کو دل سے نکال دینا۔ یہ برا خیال تمہارے اور خدا کے درمیان ایک پردہ گرا دیتا ہے۔ دل میں ہمیشہ ایسا خیال رکھنا جس میں سے پھولوں کی خوشبو آتی ہو۔ آسمانوں میں ایسے ان گنت لاکھوں، اربوں، کھربوں خیالات ہر وقت پھرتے رہتے ہیں جن سے خوشبوئیں نور کی کرنوں کی طرح پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ یہ وہ خوشبوئیں ہیں جو آج تک زمین کے کسی پھول کو نصیب نہیں ہوئیں۔ یہ اچھے اچھے خیالات آسمانوں کے پاس تمہاری امانتیں ہیں۔ ان کو وصول کرو....."

وہ دیر تک اس قسم کی باتیں مجھ سے کرتی رہی۔ ان باتوں میں سے کچھ مجھے یاد رہ گئی ہیں۔ بہت کچھ بھول گیا ہوں۔ میں اس کی یہ اچھی اچھی باتیں ہمہ تن گوش ہو کر سن رہا تھا۔ مجھ پر کچھ اثر ہو رہا تھا، کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ کسی وقت اس کی آواز خاموش ہو جاتی تو میں صرف اس کے ہونٹ ہلتے دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ مجھے لگتا جیسے گلاب کا کوئی پھول مجھ سے باتیں کر رہا ہے۔ یکبارگی پھر اس کی آواز سنائی دینے لگ جاتی۔

اب سورج مغربی پہاڑیوں کی طرف غروب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ لکشمی بائی ضرور مجھے تلاش کر رہی ہوگی۔ اسے ایک بار جا کر مل آتا ہوں۔

اس کے بعد یہاں چندر مکھی کے پاس واپس آ جاؤں گا۔ میں نے چندر مکھی سے کہا۔

"میں تھوڑی دیر کے لئے جاتا ہوں۔ جن لوگوں کے ساتھ یہاں آیا ہوں انہیں کہہ آؤں کہ اب میں ان کے پاس نہیں رہوں گا۔"

چندر مکھی نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔

"ایک بار پھر سوچ لو۔ کیا تم یہاں صرف پھل پھول اور پانی پر گزارہ کر لو گے؟"

میں نے کہا۔

"کر لوں گا"۔

میں چندر مکھی کو اس کی گپھا میں چھوڑ کر واپس چل پڑا۔ واپسی پر میں ایک بار پھر اس کے جھونپڑے کی طرف سے ہو کر گزرا۔ اس خیال سے کہ کہیں دونوں ڈاکو وہاں دوبارہ نہ آ گئے ہوں۔ مگر جھونپڑی خالی تھی۔ مجھے وہاں کوئی انسان نظر نہ آیا۔ شام ہو رہی تھی۔ درختوں پر پرندوں نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

میں پہاڑی سے اتر کر وادی میں اس جگہ آ گیا جہاں ہمارے فلمی یونٹ نے پڑاؤ ڈالا ہوا تھا۔ لکشمی بائی مجھے دیکھتے ہی برس پڑی۔

"تم کہاں دفع ہو گئے تھے؟ یہاں تمہارا کام کس نے کرنا تھا؟"

وہ اتنی غصے میں تھی کہ میں نے اسے یہ بتانا اس وقت مناسب نہ سمجھا کہ میں اس کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ اسے چندر مکھی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ بس یہی کہوں گا کہ مجھے اپنے ماں باپ بہن بھائی یاد آ رہے ہیں اور میں واپس اپنے شہر جا رہا ہوں۔ لکشمی بائی نے مجھے خیمہ کے اندر ایسے کام پر لگا دیا کہ اسے نمٹاتے نمٹاتے رات ہو گئی۔ پھر کھانا تقسیم ہونے لگا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہوا تو رات کافی گزر چکی تھی۔ اس وقت جنگل میں سے گزر کر چندر مکھی کے پاس جانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اس خیال سے کہ کہیں کسی جگہ سے کوئی شیر نہ نکل آئے۔ یہ بڑے گھنے جنگل تھے اور نیچے ترائی میں سنا تھا کہ رات کو شیر چیتے پھرا کرتے ہیں۔ میں نے یہی سوچا کہ کسی نہ کسی طرح رات فلمی یونٹ کے خیمے میں بسر کر لیتا ہوں۔ صبح اٹھتے ہی چندر مکھی کے پاس چلا جاؤں گا اور پھر کبھی لکشمی بائی کے پاس واپس نہیں آؤں گا۔ خیموں کے باہر گیس روشن تھے۔ کچھ لوگ ادھر ادھر گھاس پر بیٹھے بادہ آشامی میں مشغول تھے۔ خیموں کے اندر سے بھی مردوں عورتوں کے قہقہوں کی آوازیں آ جاتی تھیں۔ لکشمی بائی ایک لڑکی سے اپنے سر میں تیل ڈلوا کر مالش کروا رہی تھی۔ میں خیمہ کے کونے میں دری پر ایک طرف پڑ گیا۔ جانے کس وقت مجھے نیند آ گئی۔

صبح صبح لکشمی بائی نے مجھے جگا دیا اور چائے لانے کو کہا۔ میں خیمہ سے باہر آیا تو دیکھا آسمان پر صبح کی سفیدی تیزی سے پھیل رہی تھی۔ گھاس اور پودے شبنم سے گیلے ہو رہے تھے۔ ایک طرف چائے کا بڑا سا دیگچہ چڑھا ہوا تھا۔ ایکٹر لوگ وہاں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ مجھ پر چندر مکھی کے پاس جانے کی

دھن سوار تھی۔ میں نے ان درختوں کی طرف دیکھا جن کے درمیان سے چھوٹی سی پگڈنڈی اوپر چٹانوں میں چندر مکھی کے جھونپڑے اور اس کی گپھا کی طرف جاتی تھی۔ میں نے دل میں کہا۔ اے دل! سب کچھ یہیں پڑا رہنے دے۔ اس پہاڑی کی طرف چل جہاں تیری محبت کی ہوا گیندے اور مولسری کی خوشبوئیں لئے چل رہی ہے۔

میرے قدم اپنے آپ اوپر پہاڑی کی طرف جاتے راستے کی جانب اٹھتے چلے گئے۔ صبح کا وقت تھا۔ قسم قسم کے جنگلی پھول پودوں اور سبزے کی مہک والی خنک ہوا چل رہی تھی۔ میں اوپر چٹانوں کے درمیان سے گرتی آبشار کے قریب سے ہو کر دوسرے تختے پر آگیا جہاں چندر مکھی کا جھونپڑا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ شکاری رانا کے غنڈوں کے ڈر سے چندر مکھی رات کو چٹانوں کی گپھا میں ہی سوئی ہوگی۔ میں جھونپڑے کے پہلو والی جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا کنول کے پھولوں سے ڈھکے ہوئے تالاب کے پاس آ یا۔ پھر جنگلی جھاڑیوں کی سرنگ میں سے گزر کر اس اونچی سبز چٹان کے پاس آیا جس کے اندر چندر مکھی نے عبادت کرنے کے واسطے گپھا بنا رکھی تھی۔

سرنگ کے اندر اندھیرا تھا۔ جب میں گپھاہ میں داخل ہوا تو وہاں بھی اندھیر تھا۔ مجھے خیال آیا کہ چندر مکھی سو رہی ہوگی۔ میں نے اس کا نام لے کر آواز دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ دو تین بار آوازیں دینے پر بھی جب کوئی نہ بولا تو میں دیوار کے ساتھ لگ کر ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر اس تھڑے پر آگیا جہاں پچھلے روز چندر مکھ نے دیا جلایا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ ماچس پر پڑ گیا۔ میں نے دیا سلائی جلاوی۔ گپھا خا تھی۔ چندر مکھی وہاں نہیں تھی۔ میں دیا سلائی بجھا کر گپھا سے واپس مڑا۔ سوچا شاید چشمے پر نہانے گئی ہوگی۔ غار سے باہر آ کر میں ایک طرف بیٹھ گیا اور چندر مکھی انتظار کرنے لگا۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بھی جب وہ نہ آئی تو یہ سوچ کر اوپر جھونپڑے کی طرف چل پڑا کہ شاید وہ وہاں پر ہو۔ وہاں آیا تو دیکھا کہ جھونپ خالی تھا۔ اچانک دل میں خیال آیا کہ کہیں رات کو بدمعاش شکاری رانا کے غنڈ آکر اسے اٹھا کر نہ لے گئے ہوں۔ پھر سوچا' نہیں وہ تو یہ کہہ کر چلے گئے تھے راج گری کی گاڑی پکڑنی ہے وہ کہاں آئے ہوں گے۔ خدا جانے یہ راج گری یہا سے کتنی دور ہو۔ نہیں نہیں چندر مکھی یہیں کہیں ہوگی۔ چشمے پر نہا رہی ہوگی۔ اشن کر رہی ہوگی۔ منہ ہاتھ دھو رہی ہوگی۔ ابھی آ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کسی جگہ خدا کی عبادت کر رہی ہو۔

جھونپڑے میں کل والے گیندے کے پھول اسی طرح کیلے کے پتوں کے تھال میں پڑے ہوئے تھے۔ پھول تھوڑا تھوڑا مرجھا گئے تھے۔ میں جھونپڑے کے سامنے درخت کے نیچے جو چبوترا بنا ہوا تھا وہاں آ کر بیٹھ گیا میرے دل کو ایک بے چینی سی لگ گئی تھی۔ دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے تھے۔ اندیشے اور وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ کہیں سچ مچ رانا کے غنڈے اسے اٹھا کر نہ لے گئے ہوں۔ اچانک مجھے چندر مکھی کے کرمنڈل کا خیال آ گیا۔ میں نے یہ کرمنڈل جھونپڑی میں گیندے باسی پھولوں کے پاس دیکھا تھا۔ میں دوڑ کر جھونپڑی میں گیا۔ کرمنڈل وہیں پڑا تھا۔ میں سوچنے لگا اگر چندر مکھی ندی یا چشمے پر نہانے گئی ہوتی تو یہ کرمنڈل ضرور ساتھ لے جاتی۔ ایک بار پھر میرے دل میں وسوسے اور اندیشے سر اٹھانے لگے۔ میں تیزی سے جھونپڑے سے باہر آگیا اور پیچھے جو چشمہ بہتا تھا اس طرف تیز تیز چلنے لگا۔ یہ چھوٹا سا چشمہ تھا جو پتھروں کے درمیان بہہ رہا تھا۔ ان پتھروں کے اندر کہیں سے پانی آ رہا تھا۔ وہاں چھوٹا سا حوض بنا ہوا تھا۔ یہاں سے پانی دوسری جانب ناریل کے درختوں کی طرف نشیب میں جا رہا تھا۔ چشمہ خالی پڑا تھا چندر مکھی یہاں بھی نہیں تھی۔ دن کی روشن دھوپ پوری آب و تاب کے ساتھ درختوں میں سے چھن کر آ رہی تھی۔ کسی کسی درخت پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ پرندے خاموش ہو جاتے تو وہاں گہرا سکوت چھا جاتا۔ میں نے جھاڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے آواز دی۔

"دیوی جی!"

کسی پرندے نے بول کر اپنی بولی میں جیسے مجھے کہا کہ دیوی جی یہاں کہیں نہیں ہیں۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو گیا۔ میں واپس ہو گیا۔ وہاں سے دوبارا غار والی گپھا میں آیا۔ چندر مکھی کو آواز دی۔ اندھیرا تھا کسی نے جواب نہ دیا غار سے نکلا تو ایک بار پھر اوپر جھونپڑی کی طرف گیا۔ جھونپڑی اسی طرح خالی تھی۔ مولسری کے درخت کے نیچے چبوترے پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ کبھی میرا دل کہتا کہ چندر مکھی کو رانا کے غنڈے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ کبھی دل کہتا کہ نہیں وہ جنگل میں ہی کہیں ہوگی۔ ابھی واپس آ جائے گی۔ ان خیالوں میں الجھا دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ جب بیٹھے بیٹھے کافی دیر ہو گئی اور چندر مکھی نہ آئی تو میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ ہو سکتا ہے وہ کوئی ضروری چیز لینے یا خریدنے کے لئے نیچے کسی پہاڑی گاوں میں گئی

ہوئی ہو۔ میں دوپہر کے وقت دوبارہ آکر معلوم کروں گا۔

یہ سوچ کر میں وہاں سے واپس چل پڑا۔ سارا رستہ دل میں چندرمکھی کے بارے میں طرح طرح کے پریشان کر دینے والے خیال آتے رہے۔ اگر چندرمکھی چشمے پر نہیں ہے، گپھا میں نہیں ہے۔ جھونپڑے میں نہیں ہے۔ جنگل میں بھی نہیں ہے تو ضرور اسے رانا کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ اگر غنڈے اسے اٹھا کر لے گئے ہیں تو وہ لوگ اس پاک باز خدا پرست عورت کے ساتھ کس قسم کا سلوک کر رہے ہوں گے۔ درختوں کے نیچے چلتے چلتے میری مٹھیاں اپنے آپ بھینچ گئیں۔ میں ان غنڈوں کو ہلاک کر کے ان کے چنگل سے چندرمکھی کو چھڑا لانا چاہتا تھا۔ دوسرے لمحے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلیاں دینے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے اگر رانا نام کے کسی شکاری نے چندرمکھی سے چھیڑ خانی کی تھی اور چندرمکھی نے اسے ڈانٹ دیا تھا تو یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ وہ چندرمکھی کو اغوا کروانے کے لئے اپنے آدمی بھیج دے۔ پھر خیال آیا کہ آدمی تو چندر مکھی کو اغوا کرنے آئے تھے۔ میں نے دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جس آدمی نے اپنے کندھے پر دو نالی بندوق لٹکا رکھی تھی اس کی تو شکل بھی مجھے یاد تھی۔ ایک بار پھر مجھ پر غم کے بادل چھا گئے۔

اسی اداسی اور مایوسی کے عالم میں نیچے فلمی یونٹ کے خیموں میں پہنچا لکشمی بائی مجھے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئی۔

"تمہیں چائے لانے بھیجا تھا۔ کہاں جا کر مر گئے تھے۔ تم سخت کام چور ہو گئے ہو۔ بمبئی جاتے ہی تمہیں گھر سے نکال دوں گی۔"

میں خاموشی سے اس کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا رہا۔ اس لمحے میرے دل میں چندرمکھی کے غم کا اتنا شدید اثر تھا کہ لکشمی بائی کی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک عورت میرے سامنے کھڑی کسی ایسی زبان میں بول رہی ہے جو میری سمجھ سے باہر ہے۔

دوپہر کے بعد موقع پا کر میں دوبارہ اوپر چندرمکھی کی گپھا اور جھونپڑے کی طرف نکل گیا۔ چندرمکھی دونوں میں سے کسی جگہ پر نہیں تھی۔ گپھا بھی خالی جھونپڑا بھی خالی پڑا تھا۔ چشمے پر جا کر دیکھا۔ آس پاس کے جنگل میں جا کر دیکھا چندرمکھی کہیں نہ ملی۔ میں سخت مایوسی کے عالم میں واپس آ گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اسے شکاری رانا کے آدمی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے اسی وقت دل میں عہد کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے میں چندرمکھی کی تلاش میں جاؤں گا اور اسے ان غنڈوں سے نجات دلا کر رہوں گا۔

فلمی یونٹ دوسرے روز بمبئی واپس جا رہا تھا۔ جب شام ہونے لگی اور یونٹ کے آدمی سامان وغیرہ پیک کرنے میں مصروف تھے اور لکشمی بائی درختوں کے نیچے فلم کے ڈائریکٹر کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور چائے پی رہی تھی، میں آنکھ بچا کر اوپر چندرمکھی کے استھان کی طرف دوڑ پڑا۔ میں ایک بار پھر اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ دل میں یونہی ایک معمولی سی امید تھی کہ میں جاؤں تو آگے چندرمکھی جھونپڑی میں بیٹھی ہو ----- لیکن ایسا نہ ہوا۔ میں نے ہر ایک جگہ دیکھ ڈالی۔ چندرمکھی کہیں بھی نہیں تھی۔

اب میں نے چندرمکھی کی تلاش میں نکلنے کے منصوبے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ میری کوئی اتنی زیادہ عمر نہیں تھی کہ خوب سوچ سمجھ کر کوئی زبردست منصوبہ بناتا۔ جو دو آدمی رانا نے چندرمکھی کو اغواء کرنے کے لئے بھیجے تھے ان کی زبانی میں نے سن لیا تھا کہ وہ راج گری واپس جا رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ شکاری رانا راج گری میں رہتا ہو گا اور چندرمکھی کو اغوا کر کے وہیں لے جایا گیا ہو گا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ راج گری اگر کوئی قصبہ یا شہر ہے تو کس جگہ پر واقع ہے۔ میں اپنے دل میں کئی قسم کے پروگرام بناتا اپنے فلمی یونٹ کے پاس واپس آ گیا۔ دوسرے دن صبح صبح ہمارا یونٹ بمبئی کی طرف کوچ کر گیا۔

بمبئی آتے ہی میں نے میں نے لکشمی بائی سے پوچھا کہ راج گری کون سا شہر ہے۔ وہ اس وقت میرے پاس استری کرنے کے واسطے دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر لگا رہی تھی۔ بولی۔

"تم کیوں پوچھتے ہو؟ کیا اب راج گری بھاگ جانے کا ارادہ ہے۔"

میں نے کہا۔

"نہیں بائی جی! ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔ لیلا وتی کہہ رہی تھی کہ راج گری میں بڑے بڑے سانپ ہوتے ہیں۔"

لکشمی بائی نے مجھے جھڑک دیا۔

"اپنے کام سے کام رکھو۔ پہلے میری نیلی ساڑھی استری کرنا۔ مجھے دھن

راج سیٹھ کے ہاں جانا ہے۔"

لکشمی بائی سے مجھے راج گری کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مجھے ہر حالت میں اس کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنی تھی۔ میں نے لکشمی بائی کی نیلی ساڑھی استری کر کے اسے دے دی۔ وہ ساڑھی بدل کر ماتھے پر تلک لگا کر سیٹھ دھن راج سے ملنے چلی گئی۔

ساتھ والی چالی میں ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا جو کسی زمانے میں ڈاک خانے میں ملازم تھا۔ اب اس کا کام اپنی چالی یعنی کمرے کے آگے ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر دن بھر بیڑیاں پھونکنا اور گجراتی، ہندی اور اردو کے نئے پرانے اخبار پڑھتے رہنا تھا۔ میں اپنا کام ختم کر کے اس کے پاس گیا اور اس سے راج گری کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ راج گری بمبئی سے چالیس میل نیچے جنوب مشرق کی جانب متھراون کے ریلوے سٹیشن کے پاس ایک قصبہ ہے جہاں پٹیل اور رانا ذات کے ٹھاکروں کی بڑی بڑی جاگیریں اور زمینیں ہیں۔ راجا کا نام سنتے ہی میرا یقین پکا ہو گیا کہ چندر مکھی وہیں ہوگی۔ میں نے بوڑھے کو پینے کے لئے جیب سے نئی بیڑی نکال کر دی اور پوچھا کہ اس طرف کونسی لاری جاتی ہے۔ وہ بیڑی سلگا رہا تھا۔ بیڑی سلگا کر اس نے دو تین ہلکے ہلکے کش لگائے اور اپنی شیشوں والی عینک کو ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے بولا۔

"بمبئی کے بوری بندر سے دن کے وقت ایک ٹرین پونا کو جاتی ہے۔ ایک گھنٹے بعد اسی لائن پر متھراون نام کا سٹیشن آتا ہے۔ راج گری وہاں سے چند کوس کے فاصلے پر بھگلو ندی کے پاس ہی ہے۔ وہاں لاری وغیرہ بمبئی سے کوئی نہیں جاتی۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔

"یونہی پوچھ رہا تھا۔ ہمارے یونٹ کی ایک ایکسٹرا گرل ہے لیلا وتی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ راج گری میں بڑے بڑے سانپ ہوتے ہیں۔"

"ہوتے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر بوڑھے نے اخبار اٹھایا اور اس کے پڑھنے میں منہمک ہو گیا۔ میں چپکے سے واپس اپنی چالی میں آ گیا۔ میں نے صبح بمبئی سے نکل جانے کا پروگرام دل میں طے کر لیا۔ میرے پاس ایک دو روپے ہی رہ گئے تھے۔ لکشمی بائی نے ابھی مجھے

تنخواہ نہیں دی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ مہینہ ختم نہیں ہوا۔ وہ مجھے ایک پیسہ بھی پیشگی نہیں دے گی۔ مجھے معلوم تھا وہ روپے پیسے کس ڈبے میں چھپا کر رکھتی ہے۔ یہ ڈبہ ہمیشہ اس کی لوہے کی چارپائی کے نیچے کونے میں صندوق کے پیچھے رکھا ہوتا تھا۔ میری تنخواہ جتنی بنتی تھی میں نے رات کے وقت موقع پا کر لکشمی بائی کے ٹین کے ڈبے سے چاندی کے دس روپے نکال کر اپنی جیب میں رکھ لئے اور گھر کا کام کاج کر کے فرش پر سو گیا۔ اس خیال سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی کہ صبح میں چندر مکھی کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اسی خیال میں سو گیا تھا۔ خواب میں چندر مکھی کو دیکھا وہ ایک کنویں میں زنجیروں میں جکڑی پڑی تھی۔ اس کے پاس ہی دیا جل رہا تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور وہ بار بار مجھے آواز دے کر مدد کے لئے بلا رہی تھی۔ میں کنویں کے اوپر سے جھانک رہا تھا۔ پھر میں نے کنویں میں چھلانگ لگا دی۔ میں ایکدم نیچے گرنے کی بجائے آہستہ آہستہ نیچے گر رہا تھا۔ جیسے ہی میں نیچے گرا ایک کالا سانپ کنویں کی دیوار میں سے نکل کر میری طرف پھنکارتا ہوا بڑھا۔ میری چیخ نکل گئی۔ ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔

میرا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ چالی میں لال رنگ کا بلب جل رہا تھا۔ لکشمی بائی یہ بلب رات کو کمرے میں جلا دیتی تھی۔ وہ ساتھ والے کمرے میں سو رہی تھی۔ میرے کمرے میں دوسری طرف بوڑھی نوکرانی سو رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صندوق کے اوپر ٹائم پیس رکھا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کو غور سے دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ میں جلدی سے صف پر لیٹ گیا۔ مگر نیند غائب تھی۔ خاموش پڑا رہا۔ چاندی کے دس روپے میری پتلون کی جیب میں تھے۔ میں صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کافی دیر گزر گئی۔ بازار میں سے ایک ٹرک گزر گیا۔ دور کسی مندر سے گھنٹیاں بجنے کی آواز آنے لگی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے چمڑے کے بوٹ پہن کر تسمے باندھے۔ قمیض کو پتلون سے باہر ہی رہنے دیا۔ وہاں میرا کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ کمرے سے دبے پاؤں نکل کر راہ داری میں آ گیا۔ راہ داری کے کونے میں سیڑھیاں نیچے جاتی تھیں۔ یہاں ایک دو غسل خانے بنے ہوئے تھے یہاں میں نے منہ ہاتھ دھو کر بالوں میں چھوٹی کنگھی جیب سے نکال کر پھیری اور جلدی جلدی زینہ اتر کر بازار میں آ گیا۔

مجھے معلوم تھا کہ بوری بندر سٹیشن کو جانے والی بس چوک میں سے جاتی

ہے۔ صبح چار بجے کے بعد بسیں چلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ مزدوروں نے فیکٹریوں وغیرہ میں جانا ہوتا تھا۔ میں بس سٹاپ کے شیڈ میں بنچ پر بیٹھ گیا۔ بوری بندر جانے والی بس آدھ گھنٹے بعد آئی۔ تقریباً" خالی تھی۔ میں بس میں سوار ہو کر بوری بندر پہنچ گیا۔ یہ بمبئی کا بہت بڑا ریلوے سٹیشن ہے۔ وہاں بڑی رونق تھی۔ مسافروں کی چہل پہل لگی تھی۔ معلوم ہوا کہ پونا جانے والی گاڑی سات چالیس پر چلتی ہے۔ میں نے پلیٹ فارم پر ہی ناشتہ کیا اور ایک طرف بیٹھ کر سگریٹ پینے اور سوچنے لگا کہ اگر چندر مکھی راج گری میں بدمعاش رانا کے پاس ہی ہوئی تو اس نے اسے ضرور قید میں ڈال رکھا ہوگا۔ میں اسے وہاں سے کیسے نکالوں گا۔ راج گری جانے کا منصوبہ تو میں نے بنا لیا تھا اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا تھا مگر وہاں جا کر کیا کروں گا اور کس قسم کے حالات پیش آئیں گے؟ یہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ دل میں ایک خیال، ایک ہی عزم تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے چندر مکھی کو وہاں سے نکالنا ہے۔ ہر حالت میں نکالنا ہے۔

پلیٹ فارم پر وقت نہیں گزر رہا تھا۔ بڑی مشکل سے دن کے سات بجے ایک قلی نے بتایا کہ پونا جانے والی گاڑی دوسرے پلیٹ فارم پر لگ گئی ہے۔ میں اس طرف دوڑا۔ لال اور پیلے ڈبوں والی بڑی بمبئی ٹرین تھی۔ کھڑکیوں میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ٹرین اس وقت تک مسافروں سے بھر چکی تھی۔ ابھی اور مسافر آرہے تھے۔ میں بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھ گیا۔ مجھے کونے میں چھپ کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ میں بغیر ٹکٹ سفر نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ٹکٹ خرید کر جیب میں رکھ لیا تھا۔ میرے والا ڈبہ بھی قسم قسم کی دیہاتی اور شہری سواریوں سے بھرا ہوا تھا۔ اردو، گجراتی اور مراٹھی زیادہ نہیں بولی جا رہی تھی۔ گجراتی زبان میں فارسی عربی کے بہت لفظ ہوتے ہیں۔ یہ کچھ کچھ سمجھ میں آ جایا کرتی تھی۔ مگر مراٹھی زبان بالکل سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اگر میں بمبئی میں سال دو سال رہتا تو شاید یہ زبان بھی سیکھ جاتا۔ بمبئی کی لوکل ٹرینیں اس وقت بھی بجلی سے چلتی تھیں۔ مگر پونا جانے والی اس گاڑی کے آگے کوئلہ سے چلنے والا انجن لگا تھا۔ آخر گارڈ نے سیٹی کی آواز بلند کی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد انجن نے وسل دیا۔ جو مسافر ابھی تک باہر کھڑے تھے وہ دوڑ دوڑ کر ڈبوں میں سوار ہونے لگے۔ گارڈ نے تیسری بار سیٹی بجائی۔ ریل کے انجن نے دوبارہ وسل دیا۔ ٹرین کو ہلکا سا دھچکا لگا۔ دور آگے سے انجن کے چلنے کی آواز آئی اور ٹرین نے پلیٹ فارم پر کھسکنا شروع کر دیا۔

کلیان کے سٹیشن تک گاڑی مین لائن پر چلتی رہی۔ کلیان سے وہ پونا شولاپور لائن پر آ گئی۔ اس لائن پر یہ میرا پہلا سفر تھا۔ دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ نہ گرمی نہ سردی ---- کلیان تک بمبئی شہر کے مکان اور کارخانے نظر آتے رہے۔ تاڑ اور ناریل کے درختوں کے جھنڈ جگہ جگہ نظر آ رہے تھے۔ تاڑ کا درخت ستون کی طرح بالکل سیدھا ہوتا ہے۔ اوپر جا کر گلدستے کی طرح اس کی شاخیں نکلی ہوتی ہیں۔ دیہاتی لوگ درخت پر چڑھ کر اس کی شاخ کاٹتے ہیں اور کٹی ہوئی شاخ کے ساتھ مٹی کی ہانڈی باندھ کر اوپر ململ کا رومال ڈال دیتے ہیں۔ ساری رات کٹی ہوئی شاخ میں سے دودھ کی طرح کا گاڑھا رس نکل نکل کر ہانڈی میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ یہ رس بڑا میٹھا ہوتا ہے۔ رومال اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ اس پر مکھیاں نہ گریں۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے ہانڈی درخت پر سے اتار لی جاتی ہے۔ اس میں درخت کا جو رس ہوتا ہے اس کو تاڑی کہتے ہیں۔ مگر اس تازہ تاڑی میں نشہ بالکل نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ اگر ہانڈی کو سورج نکلنے سے پہلے پہلے نہ اتار لیا جائے تو اس میں نشہ پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ تازہ تاڑی کا ذائقہ میٹھے دہی کی لسی جیسا ہوتا ہے۔ میں نے تازہ تاڑی بندھیاچل کے جنگل میں آدمی باسی لوگوں کے جھونپڑے کے باہر بیٹھ کر پی تھی۔ اس کی تاثیر ٹھنڈی ہوتی ہے اور جگر کو طاقت پہنچاتی ہے لیکن اس درخت کی شاخوں اور اس کے رس کو ملا کر جو تاڑی شراب کشید کی جاتی ہے وہ بہت زیادہ نشہ آور ہوتی ہے۔ میں نے یہ تاڑی بھی پی کر دیکھی ہے۔ صرف ایک گلاس تاڑی آدمی کی مت مارنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ بمبئی کی مزدور بستیوں میں تاڑی کی دکانیں عام ہوا کرتی تھیں۔ سفید رنگ کی کچی لسی ایسی تاڑی کے بڑے بڑے مٹکے بھرے ہوتے تھے۔ مزدور لوگ دکان کے باہر زمین پر بیٹھ کر مٹی کے پیالوں میں تاڑی پیتے، ساتھ نمکین چنے کھاتے اور لڑتے جھگڑتے تھے۔ رنگون میں میں نے فرنگی عورتوں کو بھی اسی طرح دکان کے باہر زمین پر بیٹھ کر تاڑی پی پی کر بے ہوش ہوتے دیکھا ہے۔ اعلیٰ خاندان کی ے لالہ فام جب ذلیل ہو جاتی ہے تو تاڑی بن جاتی ہے۔

پونا کے اردگرد کا علاقہ پہاڑی بھی ہے اور میدانی بھی لیکن زمین زیادہ تر پتھریلی ہے اور اس کا رنگ سرخی مائل ہوتا ہے۔ مزدور پیشہ مرہٹہ عورتیں عام طور پر نیلے بارڈر والی سرخ اور سرخ بارڈر والی نیلی ساڑھیاں اس طرح پہنتی ہیں کہ

ساڑھی کا ایک پلو پیچھے سے اوپر لے جا کر کمر میں اڑس لیتی ہیں۔ ٹرین کسی سٹیشن پر رکتی تو کوئی نہ کوئی مرہٹہ عورت سر پر سبز موسمیوں کا ٹوکرا اٹھائے ڈبے میں موسمیاں بیچنے آ جاتی۔ بمبئی کی موسمی سبز رنگ کی پتلے چھلکے والی ہوتی ہے۔ یہ میں اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ میں چاہتا ہوں آپ جس علاقہ میں میرے ساتھ سفر کر رہے ہیں وہاں کے ذائقے اور خوشبو سے بھی واقف ہوتے رہیں۔ کلیان سے نکل کر پونا شولا پور ریلوے لائن پر آنے کے بعد ٹرین نے پوری رفتار پکڑ لی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سٹیشن آتے اور گزر جاتے۔ کہیں ٹرین کھڑی ہو جاتی۔ کسی سٹیشن کو چھوڑ کر نکل جاتی۔ آخر متھراون کا سٹیشن آ گیا۔ گاڑی یہاں تھوڑی دیر کے لئے رکی۔ ابھی نہ پاکستان بنا تھا نہ بھارت آزاد ہوا تھا۔ اس لئے ریلوے سٹیشن کے نام اردو اور انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔ آج کل تو سب نام ہندی میں لکھے جاتے ہیں۔ بمبئی میں مجھے ریٹائرڈ پوسٹ مین نے بتایا تھا کہ متھراون کے آگے چند کوس کے فاصلے پر راج گری کا سٹیشن آتا ہے۔ مجھے وہیں اترنا تھا۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق شکاری رانا کے آدمی چندر مکھی کو اغوا کر کے یہیں لے گئے تھے۔

متھراون سے ٹرین چلی تو مجھے چندر مکھی کے خیال نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کبھی خیال آتا کہ اگر وہ یہاں نہ ملی تو پھر اسے کہاں تلاش کروں گا۔ یہ خیال بھی آتا کہ چندر مکھی شکاری رانا کے پاس بھی ہوئی تو اس نے تو چندر مکھی کو ایک طرح قید میں ڈال رکھا ہوگا۔ میں اسے وہاں سے کیسے نکال سکوں گا۔ میری عمر اتنی زیادہ نہیں تھی کہ میں رانا کے آدمیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ میں کوئی ٹارزن بھی نہیں تھا کہ نعرہ لگا کر حملہ آور ہوتا اور اپنی ہیروئن کو دشمنوں کے چنگل سے نکال کر لے آتا۔ یہ صرف اس حسین عورت چندر مکھی کی محبت تھی جو مجھے نفع نقصان کا خیال کئے بغیر دشمنوں کے حصار میں کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔

آخر راج گری نام کا سٹیشن آ گیا۔ ٹرین رکی تو ڈبوں میں سے سادھوؤں اور جوگیوں کا ایک ہجوم نکل آیا۔ سارا پلیٹ فارم ان سے بھر گیا۔ خدا جانے یہاں کوئی تیرتھ استھان تھا یا کوئی مندر تھا جس کی یاترا کو یہ سادھو لوگ آئے ہوئے تھے۔ گیروے اور سیندوری رنگ کی چادریں لپیٹے، ترشول ہاتھوں میں لئے یہ لوگ ٹرین سے اترتے ہی بھجن گانے لگے تھے۔ کچھ دوسرے یاتری بھی لال لال پگڑیاں باندھے تیرتھ یاترا کرنے آئے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر اتر کر سٹیشن کے گیٹ کی طرف چلا تو

ہجوم اتنا تھا کہ دھکم پیل ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ آگے جہاں پلیٹ فارم ختم ہوتا ہے وہاں ریلوے لائن پار کر کے سٹیشن سے باہر نکل جاؤں گا۔ بغیر ٹکٹ سفر کرتے وقت میں اسی طرح سٹیشن سے باہر نکلا کرتا تھا۔ میں ٹرین کے ساتھ ساتھ آگے کی طرف چلنے لگا۔ رش بہت زیادہ تھا۔ میں پلیٹ فارم کے آخری سرے پر پہنچا جہاں راج گری سٹیشن کا نام انگریزی اور اردو میں لکھا تھا تو میں نے چار پانچ سال کی ایک بچی کو روتے ہوئے دیکھا۔ اس نے نیلے رنگ کا فراک پہن رکھا تھا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی اور بار بار اماں اماں پکار رہی تھی۔ میرے دل پر اس کی گریہ زاری کا بڑا اثر ہوا۔ وہاں کسی کو اس بچی کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں تھی۔ میں نے بچی کے قریب جا کر اس سے پوچھا۔

"کیا بات ہے بے بی۔ تم کیوں رو رہی ہو؟"

بچی روئے جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ بمبئی سے آئی تھی اور اس سے بچھڑ گئی ہے۔ میں نے بچی کا ہاتھ پکڑ کر اسے دلاسا دیا اور کہا کہ رومت میں تمہیں تمہاری ماں کے پاس لئے چلتا ہوں۔ بچی سخت ڈری ہوئی بھی تھی۔ شاید سادھوؤں کے ہجوم کو دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ اپنی ماں سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ وہ روتے روتے میرے ساتھ لگ گئی۔ اتنی دیر میں پلیٹ فارم پر رش ذرا کم ہوا تو میں بچی کو لے کر گیٹ کی طرف بڑھا۔

میں گیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ ایک عورت بے اختیار "ونتی میری بچی" کہتی ہوئی میری طرف بڑھی اور اس نے بچی کو جس کا نام ونتی تھا پلیٹ فارم پر بیٹھ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ میں نے اس عورت کو بتایا کہ یہ بچی پلیٹ فارم پر ریلوے انجن کے پاس رو رہی تھی میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ کیا آپ اس کی ماں ہیں؟ عورت مرہٹن نہیں لگتی تھی۔ اس کا رنگ گورا تھا اور ساڑھی بھی اس کی مرہٹہ عورتوں والی نہیں تھی۔ عمر چالیس پنتالیس کے درمیان ہوگی۔ جسم صحت مند تھا۔ وہ بچی کو سینے سے لگائے بار بار اس کا ماتھا چوم رہی تھی۔ بچی بھی اب نہیں رو رہی تھی۔ عورت نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے بڑی صاف اردو زبان میں کہا۔

"تم نے میری بچی کو مجھ سے ملا کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔ ہائے رام۔ ونتی گم ہو جاتی تو میں اسے کہاں ڈھونڈھتی؟"

اس عورت کے ساتھ ایک مرد بھی تھا جو دور سے تیز تیز چلتا آیا اور ونتی

کو اپنے ساتھ لگا کر بولا۔

"گنگا بائی! تم پر بھاگوان کی بڑی کرپا ہوئی ہے جو وسنتی گم ہونے کے بعد مل گئی۔ ورنہ یہاں جو بچی گم ہوتی ہے کبھی نہیں ملتی ----"

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقے میں تیرتھ یاترا کے موقعوں پر اکثر بچیاں بلکہ جوان لڑکیاں بھی گم ہو جاتی ہیں۔ انہیں خاص قسم کے جرائم پیشہ لوگ ورغلا کر یا کوئی چیز کھلا کر بے ہوش کرتے ہیں اور پھر انہیں جنوبی ہند کے مندروں میں جا کر پجاریوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں جہاں انہیں دیوداسی بنا کر رکھ لیا جاتا ہے۔

اس آدمی نے کرتہ پاجامہ پہنا ہوا تھا۔ کندھے پر لال رنگ کا صافہ تھا۔ سر پر ہندوانہ ٹوپی ٹیڑھی کر کے جمائی ہوئی تھی اور پان کھا رہا تھا۔ شکل اور حلیے سے وہ مجھے کچھ دوسری ٹائپ کا آدمی لگا۔ گنگا بائی نے اس آدمی سے کہا۔

"اس لڑکے کا شکریہ ادا کرو کاشی رام۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میری بچی مجھے نہیں مل سکتی تھی۔"

اس آدمی کا نام کاشی رام تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا۔

"بھائی جی آپ کا بڑا بڑا شکریہ۔ آپ کہاں سے آئے ہیں۔ شکل سے آپ پنجابی لگتے ہیں۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میں پنجابی ہوں اور راج گری میں یونہی سیر کرنے بمبئی سے آیا ہوں۔

"ہندو ہو کہ مسلمان؟"

میں نے کہا۔

"میں مسلمان ہوں"۔

گنگا بائی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔

"بھائی تم مسلمان بھی ہو تو میرے بھائی ہو۔ تم راج گری میں ہمارے گھر میں رہو گے۔ کاشی رام خود تمہیں شہر کی سیر کرائے گا۔ آؤ ہمارے ساتھ۔"

مجھے پہلے ہی کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ میں نے فوراً کہا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔"

میں ان لوگوں کے ساتھ سٹیشن سے باہر آ گیا۔ باہر گنگا بائی کو لینے ایک تانگہ آیا ہوا تھا۔ ہم تانگے میں بیٹھ کر گنگا بائی کے گھر کی طرف چل پڑے۔

راج گری اگر شہر نہیں تھا تو چھوٹا قصبہ بھی نہیں تھا۔ کھیتوں میں جگہ جگہ حویلی نما مکان نظر آ رہے تھے۔ سڑک پختہ تھی۔ ایک بگھی سامنے سے آ کر گزر گئی۔ اس میں ایک موٹا لالہ سونے کی زنجیر گلے میں ڈالے بڑی شان سے چاندی کی موٹھ والی چھڑی گھٹنوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ گنگا بائی نے اسے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا جس کا جواب لالہ جی نے تھوڑا سا مسکرا کر اور سر ہلا کر دیا۔ ہمارا تانگہ ایک ایسے بازار میں سے گزر رہا تھا جس کی دونوں جانب کھلے دالانوں والی پرانی حویلیاں تھیں۔

گنگا بائی کا مکان بھی حویلی نما تھا اور راج گری کے قصبے کے باہر ایک تالاب کے پاس تھا۔ تالاب خشک ہو چکا تھا اور اس میں سرکنڈے اگ رہے تھے۔ تانگہ مکان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار نے بیڑی ایک طرف پھینک کر گنگا بائی اور کاشی رام کو پرنام کیا اور جلدی سے ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا۔ مکان پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ سارا مکان خالی ہے۔ ڈیوڑھی میں سے گزرنے کے بعد ایک چھوٹا دالان تھا۔ دالان کی تین جانب برآمدہ تھا۔ یہاں تین چار کمرے تھے جن کے دروازے بند تھے۔ دالان کے وسط میں ایک چبوترے میں تلسی کا پودا لگا ہوا تھا۔ چبوترے کی دیواروں پر چاروں طرف سواستیکا کے کیسری رنگ کے نشان بنے تھے۔

گنگا بائی نے کاشی رام سے کہا۔

"کاشی رام! تم وسنتی کو شیلا کے پاس لے جاؤ۔ میں بھائی کو اس کا کمرہ دکھا دوں۔"

کاشی رام بچی وسنتی کو لے کر دوسری طرف چل دیا۔ گنگا بائی مجھے لے کر ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اسے کمرہ سمجھ رہا تھا۔ مگر وہ ایک راہ داری تھی جو آگے ایک بڑے کمرے میں جاتی تھی۔ اس بڑے کمرے میں چاندی کا فرش بچھا تھا۔ گاؤ تکیے لگے تھے۔ اگالدان پڑے تھے۔ دیواروں پر کسی عورت کے ڈانس کے پوز کی تصویریں لگی تھیں۔ کونے میں ایک ہارمونیم، تانپورہ اور طبلے کی جوڑی رکھی ہوئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ گنگا بائی ناچنے گانے والے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تو کوئی ایسا ٹھکانہ چاہئے تھا جہاں رات کو میں آ کر سو سکوں اور دن کے وقت چندر مکھی کو تلاش کروں۔ اگرچہ مجھے ابھی تک کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں چندر مکھی کی تلاش کہاں سے شروع کروں گا۔

گنگا بائی مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے آئی جو بڑے کمرے کے ساتھ ہی تھا۔ یہاں ایک پرانے پلنگ پر بستر لگا تھا۔ دو پرانی کرسیاں پڑی تھیں۔ چھت کے ساتھ پنکھا لگا تھا۔ گنگا بائی بڑی مروت کے ساتھ بولی۔

"بھائی ہم امیر لوگ نہیں ہیں۔ ہمارے پاس یہی کچھ ہے۔ اسے قبول کرو۔ تم نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو میں شاید کبھی نہ چکا سکوں لیکن مجھ سے جو خدمت ہو سکی کروں گی۔ غسل خانہ ساتھ ہی ہے۔ تم منہ ہاتھ دھو کر آرام کرو۔ دوپہر کو کھانا ہم ساتھ کھائیں گے۔"

گنگا بائی چلی گئی تو میں نے منہ ہاتھ دھویا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سوچنے لگا کہ راج گری میں تو آگیا ہوں اب یہاں شکاری رانا کا کیسے پتہ چلایا جائے۔ اس شہر نما قصبے کے مکان اور حویلیاں دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہاں واقعی ٹھاکروں اور پٹیل اور رانا ذات کے جاگیرداروں کی زمینداریاں ہیں۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ دوپہر کے بعد باہر نکل کر شکاری رانا کا سراغ لگانے کی کوشش کروں گا۔ گنگا بائی سے اس لئے نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ میں نے اسے کہا تھا کہ میں راج گری کی سیر کرنے آیا ہوں۔ شکاری رانا کی بابت اس کو خوامخواہ شک پڑ جائے گا کہ میں یہ سب کچھ کس لئے پوچھ رہا ہوں۔ بستر پر لیٹے لیٹے مجھے نیند آ گئی۔ آنکھ اس وقت کھلی جب ایک ملازم لڑکا میرا کندھا ہلا کر جگاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"صاحب۔ اٹھو، بائی جی بلا رہی ہیں۔ کھانا لگا دیا ہے۔"

دوسرے کمرے میں کھانا لگا تھا۔ کاشی رام، وسنتی اور گنگا بائی کے علاوہ وہاں ایک نوجوان خوش شکل لڑکی بھی تھی جس نے نیلے رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گنگا بائی نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ یہ شیلا تھی جو گنگا بائی کی بڑی بیٹی تھی۔ یہاں یہ راز بھی کھل گیا کہ یہ ناچنے گانے والی عورتیں اورنگ آباد ضلع کی رہنے والی ہیں۔ راج گری میں آباد ہو کر ایک عرصے سے یہی دھندا کر رہی ہیں۔ یہاں آنے کی وجہ راج گری کے امیر جاگیردار پٹیل اور رانا تھے جو ان کا مجرا سنتے اور روپیہ لٹاتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد کاشی رام مجھے اپنے تانگے میں بٹھا کر راج گری قصبے کی سیر کرانے لے گیا۔ قصبہ کے باہر دور دور تک پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ مغلوں اور مرہٹوں کے زمانے کے کئی ایک کھنڈر بھی دیکھے۔ میں نے راستے میں کاشی رام سے کہا۔

"سنا ہے یہاں کے جاگیردار لوگوں کو شکار کا بھی بہت شوق ہے۔ کیا یہاں جنگل بھی ہیں؟"

میرا مقصد شکاری رانا کے بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ کاشی رام بولا۔

"سب کو نہیں کچھ لوگوں کو شکار کا شوق ضرور ہے۔ یہاں رانا ذات کے دو تین آدمی شکار کھیلتے ہیں۔ مگر وہ عام طور پر شکار کھیلنے بمبئی کے پاس جنگلوں میں جاتے ہیں۔"

مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس شکاری رانا کا نام کیا ہے جس کے آدمیوں نے چندرمکھی کو اغواء کیا ہے۔ اس لئے مزید کچھ پوچھنے کی گنجائش نہیں تھی۔

رات کے وقت گنگا بائی کے ہاں مجرے کی محفل لگی۔ میں اپنے کمرے میں ہی تھا۔ مجھے بڑے کمرے سے گانے بجانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ طبلہ بج رہا تھا۔ گھنگرو بھی چھنک رہے تھے۔ کافی دیر تک یہ محفل جمی رہی۔ میں بستر پر لیٹا شیلا کے گانے کی آواز سنتا رہا۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد کسی آدمی کے اونچی اونچی بولنے کی آواز آنے لگی۔ گنگا بائی اور کاشی رام کی اونچی اونچی آوازیں بھی آنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی بات پر جھگڑا ہو رہا ہے۔ میں کان لگا کر سنتا رہا۔ آوازیں ضرور آ رہی تھیں مگر کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد آوازیں تھم گئیں اور ایک بار پھر مجرا شروع ہو گیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد گانا بجانا ختم ہو گیا۔ حویلی کے باہر ایک تانگے یا بگھی کے جانے کی آواز آئی اور خاموشی چھا گئی۔ اب گنگا بائی اور کاشی رام کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گنگا بائی کسی کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

یونہی میرے دل میں خیال آیا کہ سننا چاہئے، یہ کس کو برا بھلا کہہ رہی ہے۔ میں کمرے سے نکل کر راہ داری میں بڑے کمرے کے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ بڑے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ میں نے ایک درز میں سے دیکھا۔ سازندے ساز وغیرہ سنبھال رہے تھے۔ گنگا بائی گاؤ تکئے کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ کاشی رام سامنے بیٹھا تھا۔ گنگا بائی کہہ رہی تھی۔

"رانا ہو گا تو اپنے گھر ہو گا۔ آخر ہم لوگوں کو بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔

اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے۔"
کاشی رام کہنے لگا۔
"گنگا بائی ہمیں یہاں رہنا ہے۔ ان لوگوں سے بگاڑ کر تو نہیں رہ سکتے۔"
گنگا بائی نے غصے میں جواب دیا۔
"مگر ان لوگوں کی جوتیاں بھی تو نہیں اٹھا سکتے۔ میں آج شہر کے تھانے ؛
جا کر بتا دوں کہ اس رانا بکرم نے گھر میں ایک شریف عورت کو اغوا کر کے ڈال رَ
ہے تو اسے نانی یاد آ جائے گی۔"
میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جس رانا کی مجھے تلاش تھی وہ مجھے مل گیا ت
یقیناً" یہی بکرم نام کا وہ رانا تھا جس نے چندر مکھی کو اغواء کرایا تھا۔ میں مزید غور
سننے لگا۔ مگر اس کے بعد گنگا بائی رانا کو گالیاں ہی دیتی رہی۔ اس کے بارے میں
مزید کوئی معلومات نہ حاصل ہو سکیں کہ یہ رانا بکرم کہاں رہتا ہے اور کہاں سے
ہے۔ میں دبے پاؤں چل کر اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔ بستر پر لیٹا سوچتا رہا کہ
رانا بکرم کا کہاں سے پتہ چلانا چاہئے۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں گنگا بائی کو ساری بات بتا دوں۔ را
وہ اپنا دشمن بھی سمجھتی ہے۔ اس کے سخت خلاف بھی ہے۔ ضرور میری مدد کر
گی۔ مجھے روشنی کی کرن نظر آ گئی تھی۔ اس کے بعد میں اطمینان سے سو گیا۔

دوسرے روز میں نے موقع پا کر گنگا بائی کو ساری بات بیان کر دی اور اسے
دیا کہ میں اسی عورت چندر مکھی کی تلاش میں راج گری آیا ہوں جسے رانا کے
ی بمبئی کے جنگل سے اغواء کر کے لے آئے ہیں۔ گنگا بائی میری بات غور سے
ن رہی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ چندر مکھی ایک ایشور بھگت قسم کی پارسا عورت
، تو اس نے رانا کو میرے سامنے دو تین گالیاں دیں اور کہا۔
"تم فکر نہ کرو۔ میں آج ہی پتہ کرواتی ہوں کہ اس بدمعاش رانا نے
رمکھی کو کہاں رکھا ہوا ہے۔"
میں نے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"کیا آپ کاشی رام کو بھی یہ سب کچھ بتا دیں گی؟"
مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ رانا کو جا کر نہ بتا دے۔ گنگا بائی کہنے لگی۔
"کاشی رام میرا خاص اور بڑے بھروسے کا آدمی ہے۔ تم اس کی طرف سے
ے فکر رہو۔ بلکہ وہی چندر مکھی کا سراغ لگائے گا۔"
تھوڑی دیر وہ کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔
"تم دیکھ لینا۔ اس رانا بکرم کو رام بھگتی کا سراپ لگے گا۔ یہ کوڑھی ہو کر
رے گا۔"
یہ میرے حق میں بڑی اچھی بات تھی کہ گنگا بائی رانا کے سخت خلاف تھی۔
ب صرف ایک تجسس باقی تھا کہ رانا بکرم نے جس عورت کو اغواء کروا کر گھر میں
ل رکھا ہے کیا یہ چندر مکھی ہی ہے؟ میں نے گنگا بائی سے کہا۔
"بائی جی! آپ یہ ضرور معلوم کریں کہ اس عورت کا نام چندر مکھی ہے یا
ھ اور ہے؟"
گنگا بائی بولی۔
"تم فکر ہی نہ کرو۔ میں سب کچھ معلوم کر لوں گی۔ میرے پاس بڑے

جاسوس ہیں۔"

اس نے کاشی رام کو بھی ساری بات بتا دی اور دونوں تانگے میں بیٹھ کر گھر سے نکل گئے۔ کوئی گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے بعد وہ واپس آئے۔ آتے ہی گنگا بائی اور کاشی رام میرے کمرے میں آ گئے۔ گنگا بائی نے کہا۔

"اس عورت کا نام چندر مکھی ہی ہے اور وہ بڑی ستی ساوتری عورت ہے۔ رانا نے اسے یہاں سے کچھ دور اپنی بیٹھی کی کوٹھی میں بند کر رکھا ہے۔ وہاں پہرے دار ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ میرے جاسوس نے بتایا ہے کہ چندر مکھی ہر وقت گیان دھیان میں مشغول رہتی ہے مگر رانا اس پر بڑا ظلم کرتا ہے۔ رات کو شراب پی کر اسے مارتا بھی ہے۔"

میرے دل پر اس بات کا شدید اثر ہوا۔ چندر مکھی تو نازک پھول کی طرح ہے۔ میرا جی چاہا کہ ابھی جا کر رانا کو گولی سے اڑا دوں۔ میں نے گنگا بائی سے کہا۔

"بائی جی! جس طرح بھی ہو چندر مکھی کو اس بدمعاش کے چنگل سے نکالنے میں میری مدد کریں۔ میں آپ کا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا۔"

گنگا بائی کہنے لگی۔

"تم نے میری بیٹی مجھے واپس دلا کر مجھ پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ تو شاید نہ چکا سکوں لیکن یہ تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ چندر مکھی کو اس راکشش کے قبضے سے نکال کر تمہارے حوالے ضرور کر دوں گی۔"

کاشی رام خاموشی سے سگریٹ پیتے ہوئے ہمارے باتیں سن رہا تھا۔ کہنے لگا

"اس معاملے میں ہمیں فوراً آگے نہیں آنا چاہئے۔ سارا کام کسی دوسرے ذریعے سے کروانا ہوگا۔"

گنگا بائی نے کہا۔

"کاشی رام تم کیوں گھبرا رہے ہو۔ رانا کوئی ہمارا بھگوان نہیں ہے لیکن جو کچھ کہنا چاہتے ہو وہ میں بھی خوب سمجھتی ہوں۔ بھگوان نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ میری طرف متوجہ ہو کر کہنے لگی۔

"ہمیں سارا کام آدھی رات کے وقت کرنا ہوگا۔ کیونکہ رات کے دو بجے کولہا پور سے ایک ٹرین راج گری آتی ہے۔ جو مالیگاؤں اور جبل پور سے ہوتی

کلکتے کی طرف جاتی ہے۔ میرے آدمی چندر مکھی کو آدھی رات کے وقت نکال کر لے آئیں گے۔ تمہیں اسی وقت اسے لے کر کولہا پور والی کلکتہ ایکسپریس پکڑنی ہوگی۔ کاشی رام سٹیشن پر تمہارے ٹکٹ خرید کر موجود ہوگا۔ بس مجھے صرف دو دن کی مہلت دے دو۔"

گنگا بائی واقعی بڑی دلیر عورت تھی۔ ایک دن گزر گیا۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ اس دوران گنگا بائی گھر پر بہت تھوڑے وقت کے لئے آتی اور پھر چلی جاتی۔ کاشی رام بھی اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ دوسرے دن شام کو دونوں آئے تو گنگا بائی مجھے بڑی رازداری سے اپنے کمرے میں لے گئی۔ کہنے لگی۔

"سب کام ٹھیک ہو گیا ہے۔ میرے آدمی آج رات کو چندر مکھی کو رانا کی بیٹھی والی کوٹھی سے نکال کر یہاں لے آئیں گے۔ یہاں سے تم اسے اپنے ساتھ لے کر سٹیشن چلے جاؤ گے جہاں کاشی رام پہلے سے تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہاں سے تو میں تم دونوں کو اپنی حفاظت میں نکلوا دوں گی۔ آگے کے تم ذمے دار ہو گے ٹھیک ہے؟"

میں نے کہا۔

"میرے پاس آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں گنگا بائی۔"

گنگا بائی نے سگریٹ سلگا کر ہاتھ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ میں عورت ذات ہوں۔ عورت کے دکھ درد کو اچھی طرح محسوس کر سکتی ہوں۔"

اس نے کاشی رام سے کہا۔

"کاشی رام! تم دو ٹکٹ لے رکھنا۔"

کاشی رام نے میری طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"ٹکٹ کونسے شہر کے لینے ہوں گے؟ گاڑی تو سیدھی کلکتے جائے گی۔"

گنگا بائی نے پوچھا۔

"چندر مکھی کا گھر بار کہاں ہے؟ تم نے مجھے یہ بالکل نہیں بتایا"۔

میں نے کہا۔

"مجھے اتنا معلوم ہے کہ وہ کیسرواڑی میں اپنے برہمن ماتا پتا کے گھر رہتی تھی۔ اب معلوم نہیں یہ کیسرواڑی کہاں پر ہے۔"

گنگا بائی نے کاشی رام کی طرف دیکھا۔ کاشی رام بولا۔

"میرا خیال ہے کہ جبل پور کے پاس اس نام کا ریلوے سٹیشن ہے۔"

"ٹھیک ہے"۔ گنگا بائی بولی۔ "کیسرواڑی تمہارے راستے میں ہی آئے گا۔"

میں نے پوچھا۔

"جو دو چوکیدار پہرہ دیتے ہیں کہیں وہ شور تو نہیں مچا دیں گے؟"

گنگا بائی نے طنزیہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

"انہیں اس قابل ہی نہیں چھوڑیں گے کہ وہ شور مچا سکیں۔ یہ بات تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں نے ایسا بندوبست کیا ہے کہ اگر وہاں بدمعاش رانا بھی ہوا تو چوکیداروں کے ساتھ وہ بھی بے ہوش پڑا ہوگا۔"

تب میں نے گنگا بائی سے کہا۔

"میرا خیال ہے جبل پور تک کے دو ٹکٹ لے لیتے ہیں۔ مگر میرے پاس ا اتنے پیسے نہیں ہوں گے۔"

گنگا بائی نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔

"پیسوں کی تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس بھی تمہارے ہی پیسے ہیں۔"

یہ ڈراما رات کو شروع ہونے والا تھا۔ ذہن میں طرح طرح کے خیال ا اندیشے پیدا ہو رہے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لو رانا اور اس کے چوکیداروں کو بے ہوش کر کے وہاں سے چندر مکھی کو نکالنے وا تھے۔ لیکن اگر وہ ہوش میں آ گئے تو کیا ہوگا؟ رانا یہاں کا بااثر جاگیردار ہے۔ ا کے آدمی تو بندوقیں لے کر سٹیشن پر پہنچ جائیں گے۔ میں دیر تک انہی خیالات الجھا رہا۔ رات کو کھانا کھانے کو بھی جی نہ چاہا۔ گنگا بائی اور کاشی رام بھی میر ساتھ ہی جاگ رہے تھے۔ اس رات گنگا بائی نے شیلا کی بیماری کا بہانہ بنا کر مجرا نہیں کرایا تھا۔

رات کے گیارہ بجے کاشی رام یہ کہ کر نکل گیا کہ میں سٹیشن پر جاتا ہو اس کے بعد میں اور گنگا بائی بیٹھے جاگتے رہے۔ شیلا بھی وسنتی کو لے کر سو گئی صرف چوکیدار حویلی کے باہر موجود تھا۔ گنگا بائی نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہوا تھ رات کے گیارہ بج گئے۔ پھر ایک بج گیا تو گنگا بائی کچھ پریشان سی ہو کر اور بولی۔

"ان لوگوں کو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔"

ہم گنگا بائی کے کمرے میں ہی بیٹھے تھے۔ وہ باہر نکل گئی۔ دو تین منٹ بعد اپس آ گئی۔ چہرے پر فکرمندی کے اثرات تھے۔ سگریٹ کے ساتھ دوسرا سگریٹ انے کے بعد بولی۔

"کہیں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔ مگر ایسا ہو نہیں سکتا۔ میرے آدمی بڑے وشیار ہیں۔"

اس کے آدمی واقعی بڑے ہوشیار تھے۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد گنگا بائی کا ہوکیدار بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا۔

"بائی جی وہ لوگ آ گئے ہیں۔"

گنگا بائی اٹھ کھڑی ہوئی۔ چوکیدار سے کہا۔

"تانگہ نہیں لائے؟"

"جی وہ پیدل ہی آئے ہیں۔ عورت بھی ان کے ساتھ ہے۔"

گنگا بائی نے اپنے پرس میں سے دس دس روپے کے تین نوٹ نکال کر مجھے دیئے اور کہا۔

"یہ اپنے پاس رکھو۔ راستے میں ضرورت پڑے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے نوٹ جیب میں رکھے اور گنگا بائی کے ساتھ حویلی سے باہر آ گیا۔ رات خاموش اور تاریک تھی۔ مجھے دو آدمی برآمدے کے ستون کے پاس کھڑے نظر آئے۔ انہوں نے سر چادروں میں لپیٹ رکھے تھے۔ ایک عورت بھی ان کے ساتھ چادر لپیٹے کھڑی تھی۔ میں نے اس کے قد بت سے اندھیرے میں بھی اسے پہچان لیا۔ یہ چندر مکھی ہی تھی۔ ہم ان کے پاس آ گئے۔ میں چندر مکھی کے قریب گیا تو ستاروں کی پھیکی سی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ ایسا لگا جیسے وہ بہت بیمار ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کیا کہوں۔ اس سے کیا بات کروں۔ اسی دوران گنگا بائی نے اپنے آدمیوں سے پوچھا۔

"سواری کہاں چھوڑ آئے ہو؟"

ان میں سے ایک آدمی نے کہا۔

"ٹلیا کی دوسری طرف تانگہ کھڑا ہے۔"

"سارا کام ٹھیک ہو گیا تھا؟"

"سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب آپ اپنی امانت سنبھالیں اور ہمیں جانے دیں۔"

گنگا بائی نے پہلے ہی سے پرس میں سے کچھ نوٹ نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھ لئے تھے۔ اس نے نوٹ اس آدمی کو دیئے اور کہا۔

"اب جدھر سے تمہیں بلایا تھا اسی طرف جا کر غائب ہو جاؤ۔"

دونوں آدمی کوئی بات کئے بغیر ایک طرف تیز تیز قدم اٹھاتے چل دیئے اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ گنگا بائی نے مجھ سے کہا۔

"اسے پہچان لو۔ یہ چندر مکھی ہی ہے ناں۔"

میں نے کہا۔

"ہاں بائی جی! یہ چندر مکھی ہی ہے۔"

گنگا بائی نے چندر مکھی کو ہاتھ باندھ کر کہا۔

"آپ ایشور کی بھگتنی ہیں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔"

چندر مکھی نے کوئی جواب نہ دیا۔ گنگا بائی نے چوکیدار کو جو قریب ہی کھڑا تھا بلا کر کہا۔

"ہمارے مہمانوں کو جتنی جلدی ہو سکے سٹیشن پر پہنچا دو۔ تانگہ تلیا کی پچھلی طرف کھڑا ہے۔"

"ٹھیک ہے بائی جی۔"

میں گنگا بائی کا شکریہ ادا کرنے لگا تو وہ بولی۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ اب یہاں سے نکل چلو۔"

میں نے چندر مکھی کو ساتھ لیا اور چوکیدار کے پیچھے چل پڑا۔ سوکھی تلیا کی دوسری جانب درختوں اور جھاڑیوں کے پاس ایک تانگہ کھڑا تھا۔ چوکیدار باگیں سنبھال کر آگے بیٹھ گیا۔ میں اور چندر مکھی تانگے کے پیچھے بیٹھ گئے اور تانگہ سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔

پکی سڑک پر آتے ہی تانگہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ چندر مکھی میرے ساتھ بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے بھی اس سے کوئی بات نہ کی۔ ہم ٹھیک وقت پر سٹیشن پہنچ گئے۔ کاشی رام پہلے سے وہاں موجود تھا۔ وہ سٹیشن کے باہر ہی کھڑا تھا۔ ہمیں تانگے سے اترتے دیکھا تو ہمارے پاس آگیا۔ مجھے دو ٹکٹ دے کر بولا۔

"گاڑی ابھی نہیں آئی۔ آنے ہی والی ہے۔ تم لوگ پلیٹ فارم پر جا کر بیٹھو۔ جب تک تمہاری گاڑی نہیں چلی جاتی۔ میں اور چوکیدار یہیں رہیں گے۔"

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ چندر مکھی کو لیا اور پلیٹ فارم پر آگیا جو بالکل خالی پڑا تھا۔ ٹرین آنے میں ابھی کچھ دیر تھی۔ پلیٹ فارم پر بتیاں روشن تھیں۔ مگر زیادہ روشنی نہیں تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہم ایک خالی بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں چندر مکھی سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ وہ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کو جیسے خاموشی کی مہر لگ گئی تھی۔ ہمارے قریب ہی کھمبے پر بجلی کا بلب لگا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی چندر مکھی پر بھی پڑ رہی تھی۔ چندر مکھی کا لباس وہ نہیں تھا جو میں نے بمبئی کے خوبصورت جنگل میں اس کی جھونپڑی میں دیکھا تھا۔ اس نے کھیس نما چادر سے اپنا سارا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے بال بھی چادر میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہ جانے کیوں گھبرا رہا تھا۔ چندر مکھی کے چہرے کا گورا رنگ کملا کر سانولا ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ مجھے وہ ٹی بی کی مریضہ لگی۔ میرے دل پر چوٹ سی پڑی۔ خدا جانے وہ رانا اس عورت کے ساتھ کیا کیا ظلم کرتا رہا ہے۔

میں نے ہمت کر کے خاموشی کے طلسم کو توڑتے ہوئے کہا۔

"میں اگلے روز تمہاری جھونپڑی میں گیا تو تم وہاں نہیں تھیں۔ میں نے بہت تلاش کیا۔ تم نہ ملیں تو دل اداس ہو گیا۔ پھر بمبئی میں میرا دل نہ لگا۔ میں تمہاری تلاش میں راج گری آگیا۔"

چندر مکھی نظریں نیچی کئے پلیٹ فارم کے فرش کو تک رہی تھی۔ اس نے آگے سے کچھ نہ کہا۔ میں بولتا گیا۔

"رانا کے آدمیوں کی زبانی میں نے راج گری کا نام سن رکھا تھا۔ یہاں آیا تو گنگا بائی مل گئی۔ بڑی درد دل رکھنے والی عورت ہے۔ اس نے میری بڑی مدد کی۔ اگر یہ مدد نہ کرتی تو میں تمہیں رانا کی قید سے نہیں چھڑا سکتا تھا......"

میں خاموش ہوا تو ایک بار پھر وہی خاموشی طاری ہو گئی۔ آخر میں نے بیتاب ہو کر پوچھا۔

"چندر مکھی جی! تم ٹھیک ہو ناں؟"

چندر مکھی نے اثبات میں سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ میں ٹھیک ہوں۔ اس

دوران کچھ مسافر پلیٹ فارم پر نمودار ہو چکے تھے۔ سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی۔ اس کے اندر سے ایک آدمی باہر نکلا۔ دیوار کے ساتھ ریلوے لائن کا ایک ٹکڑا لٹک رہا تھا۔ اس نے اسے دو تین بار بجا کر اعلان کیا کہ ٹرین آنے والی ہے۔ چندر مکھی بالکل خاموش اور ساکت بیٹھی تھی۔ مجھے خیال آنے لگا کہ اس صدمے سے کہیں اس کی قوت گویائی تو ختم نہیں ہو گئی۔

اتنے میں زور سے ریلوے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ چار چھ مسافر جو پلیٹ فارم پر بیٹھے تھے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے چندر مکھی سے کہا۔

"گاڑی آ گئی ہے۔"

پھر میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس جبل پور تک کے دو ٹکٹ ہیں۔ اگر وہ اپنے آبائی گھر واپس جانا چاہتی ہے تو کیسرواڑی جبل پور کے راستے میں ہی آتا ہے۔ اس پر بھی چندر مکھی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب ٹرین کے انجن کی روشنی پلیٹ فارم پر پڑنے لگی تھی۔ پھر ٹرین شور مچاتی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ میں نے چندر مکھی سے کہا۔

"کیا یہاں سے چلو گی نہیں؟"

چندر مکھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

ٹرین میں زیادہ رش نہیں تھا۔ عورتوں کے ڈبے میں چند ایک عورتیں تھیں جن میں سے اکثر سو رہی تھیں۔ میں نے چندر مکھی کو زنانہ ڈبے میں سوار کرایا اور کہا۔

"میں ہر سٹیشن پر جہاں گاڑی کھڑی ہوگی آکر تمہیں دیکھ جایا کروں گا۔"

ٹرین راج گری کے سٹیشن پر زیادہ دیر نہ رکی۔ دوسرے لمحے انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور ٹرین کھسکنے لگی۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ زنانہ ڈبہ گزر گیا۔ اس کے ساتھ والے دو ڈبے بھی گزر گئے۔ ان ڈبوں میں بڑا رش تھا۔ میں تیسرے ڈبے میں داخل ہو گیا۔ ٹرین راج گری کے سٹیشن سے نکل گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں چندر مکھی کو بدمعاشوں کی قید سے نکال لانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

کھڑکی کے پاس تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ رات کے پچھلے پہر کی ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ میں نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ چندر مکھی

ایک پاکباز پارسا عورت تھی۔ وہ ایک بدمعاش کے چنگل میں پھنس گئی تھی۔ اس پر اس صدمے کا زبردست اثر ہوا ہے۔ میں اسے خود اس کے گھر چھوڑ کر آؤں گا۔ دو تین دنوں میں وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر مجھے خیال آیا کہ چندر مکھی کو اس کے گھر چھوڑ آنے کے بعد میں کیا کروں گا؟ کہاں جاؤں گا؟ میں اس کے بغیر کیسے زندہ رہوں گا؟ اس کی شکل نظر نہیں آئے گی تو اسے کہاں تلاش کروں گا؟

اسی لمحے میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ میں بھی چندر مکھی کے ساتھ ہی رہوں گا۔ اس کے گھر میں نوکر بن کر رہ لوں گا۔ اگر ایسا نہ ہو سکا تو کیسرواڑی میں چندر مکھی کے شہر میں کسی جگہ نوکری کر لوں گا۔ اس طرح کم از کم اس کے دیدار سے تو محروم نہیں ہوں گا۔

ٹرین بڑی تیز رفتاری سے اڑی جا رہی تھی۔ ڈبے کے اکثر مسافر سو رہے تھے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ٹرین ایک سٹیشن پر رکی۔ میں اتر کر چندر مکھی کے پاس گیا۔ وہ اسی طرح چپ چاپ سی بیٹھی تھی۔ میں نے جیب سے ایک ٹکٹ نکال کر اس کو دیا اور کہا۔

"یہ جبل پور تک کا ٹکٹ ہے۔ اسے اپنے پاس رکھنا۔ چائے پانی کی ضرورت تو نہیں؟"

چندر مکھی کے چہرے پر ایک کربناک تاثر ابھر آیا۔ اس نے ٹکٹکی باندھ کر ایک لمحے کے لئے میری طرف دیکھا۔ پھر بڑی کمزور آواز میں کہا۔

"نہیں"۔

انجن نے وسل دیا۔ میں نے کہا۔

"میں اگلے سٹیشن پر آؤں گا۔"

جب میرا ڈبہ آیا تو میں دروازے میں سے اندر داخل ہو گیا۔ سٹیشن سے نکلتے ہی ٹرین نے سپیڈ پکڑ لی۔ میں چندر مکھی کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ میں نے اپنا سر کھڑکی کے ساتھ لگا دیا۔ پچھلی رات کے اندھیرے میں باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔ سر نیچے گرنے لگا تو ایکدم جاگ پڑا۔ نیند کا زبردست غلبہ تھا۔ میں نے وہیں تھوڑی سی جگہ بنا لی اور سمٹ سمٹا کر سو گیا۔

جس وقت آنکھ کھلی باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ڈبے کے دوسرے مسافر بھی جاگ پڑے تھے۔ ٹرین پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے ایک مسافر سے پوچھا۔

"پیچھے کون سا سٹیشن تھا؟"

میرا مطلب تھا کہ رات تین بجے کے بعد ٹرین صبح ہونے تک پیچھے کتنے سٹیشن چھوڑ آئی تھی۔ مسافر بولا۔

"مینڈھا پور نکل گیا ہے۔ اب بیدر کا سٹیشن آنے والا ہے۔"

بیدر حیدر آباد دکن کا شہر تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ ٹرین شولاپور بھی پیچھے چھوڑ آئی ہے۔ میں نے چندر مکھی کا حال نہیں پوچھا تھا۔ پتہ نہیں اس نے ناشتہ بھی کیا ہوگا کہ نہیں۔ میں بے چینی سے ٹرین کے رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد ٹرین کی رفتار ہلکی ہونی شروع ہوئی۔ بیدر شہر کا سٹیشن آ رہا تھا۔ یہ کوئی بڑا شہر تھا۔ کافی بڑا جنکشن تھا۔ ٹرین رکی تو میں ڈبہ سے اتر کر بھاگتا ہوا چندر مکھی کے ڈبہ کی طرف گیا۔ چندر مکھی اپنی سیٹ پر نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ باتھ روم میں گئی ہوگی۔ میں ڈبے کے باہر ہی کھڑا ہو کر بے تابی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ جب تین چار منٹ گزر گئے تو میں نے ساتھ والی کھڑکی کے پاس بیٹھی ہوئی عورت سے پوچھا کہ یہاں جو عورت بیٹھی تھی کیا وہ باتھ روم میں گئی ہے؟ اس پر عورت نے میری طرف تعجب بھری نگاہ ڈالی اور بولی۔

"وہ تو صبح سویرے ہی ایک سٹیشن پر اتر گئی تھی۔"

مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ میں عورت کا منہ تکتا رہ گیا۔ وہ بولی۔

"کیا تم اس کے مرد ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بڑی مشکل سے کہا۔

"نہیں۔ میں --- وہ کون سے سٹیشن پر اتری تھی؟"

عورت نے کہا۔

"اندھیرا تھا ابھی۔ پتہ نہیں کون سا سٹیشن تھا۔"

پھر وہ ایک چائے والے لڑکے کو آوازیں دینے لگی۔ میں بوجھل قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے ڈبے کی طرف چلا۔ دل میں ایک طوفان سا مچ گیا تھا۔ چندر مکھی اچانک ٹرین سے کیوں اتر گئی؟ وہ کہاں گئی ہوگی؟ وہ کیوں چلی گئی؟ اپنے ڈبے تک آتے آتے میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ میں اپنے ڈبے کے باتھ روم میں گھس گیا۔ دروازہ بند کیا اور میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آنسو کیا بہنے تھے، میں بچوں کی طرح رونے لگا۔ مجھے معلوم تھا اب چندر مکھی سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔ پھر کبھی وہ کنول پھول ایسا چہرہ نظر نہیں آئے گا۔

کسی نے باہر سے دروازے پر دو تین ہاتھ مارے۔ میں نے جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھے۔ رومال کو پانی سے گیلا کیا اور اپنا منہ پونچھتا ہوا باہر آگیا۔ کھل کر رونے سے دل کا غبار کافی ہلکا ہو گیا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا۔ اب کیا کروں؟ کس کے لئے جبل پور جاؤں گا؟ چندر مکھی نے تو میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ تو مجھ سے بچھڑ گئی۔ نہ جانے رات کے پچھلے پہر کس ویران سٹیشن پر اتر گئی۔ وہ تو جنگل کی دیوی تھی۔ جنگل نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ہوگا۔ میری آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو چھلکنے لگے۔ میں نے چہرہ کھڑکی سے باہر نکال لیا۔ پلیٹ فارم پر نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آنسوؤں کو روکا۔ کاش میں انسانوں سے دور کسی جنگل میں ہوتا۔ پھر وہاں کسی درخت کے ساتھ لگ کر خوب روتا۔ میرا حال اس بچے کی طرح تھا جس کا رنگین غبارہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہو اور وہ اسے آسمان کی وسعتوں میں جاتا حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔

مجھے انجن کی چیخ نے چونکا دیا۔

ٹرین چل پڑی تھی۔ پھر ٹرین کی رفتار تیز ہو گئی۔ مجھے اب سفر بے مقصد لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں بھی آگے سٹیشن پر اتر جاتا ہوں یا کسی جنگل میں ٹرین کھڑی ہو گی تو وہاں اتر جاتا ہوں۔ میں جبل پور جا کر کیا کروں گا۔ میرے لئے اب ہر سٹیشن ایک جیسا تھا۔ اجنبی اداس اور بے مروت۔ ٹرین خدا جانے شہر کے مکانات سے گزر رہی تھی یا کھیتوں میں سے گزر رہی تھی یا پہاڑی علاقے میں سے

گزر رہی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں کھڑکی کے باہر ضرور دیکھ رہا تھا مگر مجھے سوائے چندرمکھی کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کبھی میں اسے دیکھتا کہ وہ زرد لباس پہنے ایک ہاتھ میں کرمنڈل اور دوسرے ہاتھ میں گیندے کے پھول لئے جھاڑیوں میں سے گزرتی چلی آ رہی ہے۔ کبھی وہ مجھے اپنی گپھا میں آنکھیں بند کئے بیٹھی نظر آتی۔ اس کا چہرہ گیندے کے پھول کی طرح سنہری اور شگفتہ لگتا۔ کبھی مجھے اس کی باتیں کرنے کی آواز سنائی دیتی۔ جیسے ہوا مولسری کی پھولوں سے بھری ہوئی شاخوں میں سے گزر رہی ہو۔ ایک بار دل نے کہا۔ کھڑکی سے باہر چھلانگ لگا دوں۔ کوئی دریا آئے تو چلتی ٹرین میں سے چھلانگ لگا دوں۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم خود ایک دریا کی لہر ہو۔ دریا کی لہر دریا میں مل جائے گی۔ جب ٹرین ایک دریا پر سے گزرنے لگی تو میں چھلانگ نہ لگا سکا۔ ڈر گیا ابھی مجھے زندہ رہنا تھا۔ ابھی کئی برائیاں کرنی تھیں۔ ہزاروں ملال اور پچھتاوے زندگی کی شاہراہ پر کھڑے میری راہ دیکھ رہے تھے۔ ابھی نہ جانے کتنے ایسے چہروں کو دیکھنا تھا جن کو دیکھنے کی میں نے کبھی خواہش نہیں کی تھی۔ ابھی زندگی کے ماہ و سال کی کھیتی میں کئی کانٹے بونے تھے اور ان کی فصل کاٹنی تھی۔ کئی صدمے اٹھانے تھے۔ کئی دکھ جھیلنے تھے۔ ہزاروں خوشیوں سے اپنا دامن بھی بھرنا تھا اور لاکھوں غموں کا بوجھ بھی اٹھانا تھا۔ عمر قید کی زنجیر پاؤں میں باندھے ابھی کئی وادیوں، بازاروں، گلی کوچوں، چمن زاروں اور تپتے صحراؤں سے گزرنا تھا۔ ابھی میرے دامن پر کئی داغ لگنے تھے اور مجھے وقت کے دریا پر بیٹھ کر ان داغوں کو زندگی کے آخری لمحات تک دھوتے رہنا تھا۔

ٹرین شور مچاتی دریا کے پل پر سے گزر گئی۔

اب میں قدرے صاف ذہن کے ساتھ سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے کہاں جانا چاہئے۔ میں نے اس وقت تک اپنی زندگی کا مقصد متعین نہیں کیا تھا جو عمر میں متعین کر دیا جاتا ہے یا ماں باپ مل کر کر دیتے ہیں۔ میں قدرت کے حسن پر مرتا تھا۔ خوبصورت اداس خاموش مسکراتی عورتوں کے چہرے، بارش میں نہائے باغ، گہری راتوں کی تاریکی میں سوئے ہوئے بیباک جنگل، ان جنگلوں کے برگد درخت، ان درختوں کے اندر سفر کرتی خوشبوئیں، نازک نازک سنہری کونپلیں، سردیوں کی کہر آلود صبحوں میں دھند میں ڈوبے شہروں کے باغ، گرم نیلے آسمانوں میں اڑتے ہوئے سفید، سبز اور سرخ پرندے اور پارکوں میں کھیلتے بچے اور

سمندروں کی تیز بارشوں میں بھیگتے استوائی جزیرے اور پوٹھوہار کی ہری بھری دھریکوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے خوشبودار کاسنی پھول، شام کے اداس لمحوں میں بنگال کے ریستورانوں میں گونجتے رابندر سنگیت کے دردناک گیت اور کوہ مری کی مال روڈ پر گرتی برف میں ارل گرے چائے اور ایران مور تمباکو کی گرم خوشبو ---- یہ سب میری محبتوں کے آسمانوں کے بکھرے ہوئے ستارے ہیں۔ یہی میری زندگی ہے۔ یہی میرا ماضی، حال اور مستقبل ہے۔ یہی میرا کیریئر ہے۔ اسی میں میرا سب کچھ ہے۔ اگر میں ان کے اندر ہوں تو سب کچھ ہوں، اگر باہر ہوں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔

ٹرین ایک اور دریا کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ دریا مجھے دیکھ رہا تھا، جیسے کہہ رہا تھا۔ مجھے وہاں ملنا جہاں میں سمندر میں گرتا ہوں۔ دریا پیچھے رہ گیا۔ کوئی اور شہر آ رہا تھا۔ ٹرین کی رفتار کم ہو رہی تھی۔ مجھے یاد نہیں یہ کونسا شہر تھا۔ ٹرین رک گئی۔ کافی بڑا سٹیشن تھا۔ میں پلیٹ فارم پر اتر کر ٹہلنے لگا۔ سمندر مجھے بلا رہا تھا۔ میں واپس اپنے شہر امرتسر نہیں جانا چاہتا تھا۔ یہ شہر شبانہ سے خالی تھا۔ اس کا گلی والا مکان شبانہ سے خالی تھا۔ یہ شہر میری سوگوار یادوں کا بابل و نینوا تھا۔ اس کے گلی کوچوں میں اس کی نہروں اور اس کے باغوں میں میری ناکام محبت کے کھنڈر زمین بوس تھے۔ میں کیسے امرتسر واپس جا سکتا تھا۔

ٹرین چلی تو میں نے ایک مسافر سے پوچھا۔

"آگے کونسا بڑا شہر ہے؟"

"جبل پور۔۔۔"

"اس کے آگے؟"

"اس کے آگے تو بڑا شہر کلکتہ ہی ہے"۔

ٹھیک ہے میں نے اپنے دل سے کہا۔ کلکتہ چلو۔

گاڑی جبل پور پہنچی تو میں نے وہاں سے کلکتے کا ٹکٹ بنوا لیا۔اور اسی گاڑی میں سوار ہو کر کلکتے کی طرف روانہ ہو گیا۔ کلکتہ وہاں سے کافی دور تھا۔ سارا دن اور ساری رات گاڑی سفر کرتی رہی۔ دوسرے دن صبح کے وقت گاڑی کلکتے کے ہوڑہ سٹیشن پر جا کر رکی۔ جیسا کہ میں اپنی داستان بیان کرتے ہوئے شروع میں لکھ چکا ہوں کلکتہ میرے لئے کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ یہاں امرتسر کے شال مرچنٹ، رفوگر اور ٹپ گر کشمیریوں کا شروع ہی سے کاروبار رہا تھا۔ ہماری فیملی کے کچھ لوگ ہ

سال شالیں وغیرہ لے کر کلکتے جایا کرتے تھے۔ یہ لوگ کلکتے میں چھ ماہ رہتے۔ اس کے بعد امرتسر واپس آ جاتے۔ آتی دفعہ کلکتے کے کالے سلیپر اور چارخانہ دھوتیاں ضرور ساتھ لاتے۔ بچپن میں میں کالے سلیپر اور چارخانہ دھوتی پہنا کرتا تھا۔ سردیوں میں اوپر گرم شال لے لیتا۔ گرم کوٹ پہننے کی نوبت کبھی کبھار ہی آتی تھی۔ کشمیری گرم شالیں ہمارے گھر میں ادھر ادھر پڑی رہتی تھیں۔ کمروں میں دری کے اوپر جازم بچھتی تھی اور سردیوں میں چارپائیوں پر گدیلوں کی دیگر گرم دریاں بچھائی جاتی تھیں۔ یہ گرم دریاں شالوں کی لمبی کترنوں سے بنی جاتی تھیں اور صرف امرتسر کے رفوگر ٹپ گر اور شال مرچنٹ کشمیریوں کے گھروں میں ہی ہوتی تھیں۔ امرتسر میں ان دنوں بڑی شدید سردی پڑتی تھی۔ بارش ہوتی تو کمرہ بند کر کے بیٹھ جاتے سماوار میں سبز چائے پکتی۔ کبھی قہوہ بنایا جاتا اور کھنڈ قلچوں اور نمکین قلچوں کے ساتھ پیا جاتا۔ اب نہ وہ کھنڈ قلچے اور نمکین قلچے کہیں نظر آتے ہیں اور نہ وہ سنہری رنگت والا خوشبودار قہوہ ہی کہیں بنتا ہے۔ بہرحال میں اپنی داستان کو آگے بڑھاتا ہوں۔ کلکتے کے سٹیشن پر اتر کر سوچنے لگا کہ کہاں جاؤں؟

زکریا سٹریٹ میں شالوں کا کاروبار کرنے والے رشتے دار ضرور رہتے تھے مگر خطرہ تھا کہ وہ مجھے پکڑ کر بٹھا لیں گے اور پیچھے گھر خط لکھ دیں گے کہ لڑکے کو ہم نے پکڑ لیا ہے کوئی آ کر واپس لے جائے۔ ایسا میرے ساتھ دو ایک بار ہو چکا تھا کہ میں بڑی خوشی خوشی زکریا سٹریٹ اپنے رشتے داروں کے ہاں گیا۔ انہوں نے بڑی آؤ بھگت کی مگر چپکے سے پیچھے والد صاحب کو خط لکھ دیا کہ برخوردار ہمارے پاس بالکل محفوظ ہے کوئی آدمی بھیج کر اسے لے جائیے۔ والد صاحب نے اپنے ایک شاگرد پہلوان کو بھیج دیا جس نے آتے ہی مجھے دبوچ لیا اور اپنی نگرانی میں مجھے واپس لے گیا۔ ان کشمیری رفوگر ٹپ گر اور شال مرچنٹ رشتے داروں میں صرف خواجہ قمردین ایک ایسا شخص تھا جو مجھے بڑا اچھا لگتا تھا۔ اس دلچسپ شخص کے بارے میں میں پہلے بھی تھوڑا بہت لکھ چکا ہوں۔ خواجہ قمردین کی عمر اس وقت چالیس پینتالیس سال کی تھی۔ گورا چٹا صحت مند خوبصورت آدمی تھا۔ پیٹنٹ کا کالا پمپ شو' سفید شلوار' بوسکی کی قمیض' گلے میں سونے کی زنجیری' انگلیوں میں سونے کی زمرد اور عقیق والی انگوٹھیاں' کندھے پر کبھی عام شال اور کبھی قیمتی جامہ دار ڈالی ہوتی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ ہاتھ میں کریون اے سگرٹوں کا ڈبہ ہوتا۔ خواجہ صاحب شہزادوں کی طرح زکریا سٹریٹ میں داخل ہوتے اور امجدیہ ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتے۔

خواجہ صاحب ہمارے بڑے قریبی رشتے دار تھے۔ جوانی میں ہی انہیں شراب اور جوئے کی لت پڑ گئی تھی جو اب تک ان کے ساتھ تھی۔ کلکتے میں نہ تو ان کی کوئی دکان تھی اور نہ امرتسر سے مال لا کر وہاں بیچتے تھے۔ وہ کلکتے میں مہینے میں دو ایک بار پھیری لگاتے تھے۔ یعنی کسی دکان دار کی چھ سات شالیں' قالین کے دو ایک ٹکڑے لے کر ٹیکسی میں ڈالتے اور ٹالی گنج اور بالی گنج میں جو غیر ملکی رہتے تھے ان کے ہاں جاتے اور دو چار ٹکڑے فروخت کر آتے۔ عام طور پر وہ اس زمانے میں دو سو کی شال پانچ سو میں اور اسی طرح قالین کے چھوٹے ٹکڑے کو سمرقند اور

بخارا کی تاریخی روایات کا حامل بتا کر منگے داموں بیچتے۔ واپس آ کر اپنے واقف کار دکاندار کو اصل مال کی قیمت منافع کے ساتھ دینے کے باوجود ان کے پاس کافی رقم بچ جاتی۔ اس کے بعد ان کے دو ہی کام ہوتے تھے۔ شراب پینی اور جواء کھیلنا --- وہ آٹھ جماعتیں پاس تھے مگر میں نے انہیں بالی گنج کے انگریزوں اور امریکیوں کے آگے ایسی انگریزی فر فر بولتے دیکھا ہے جو نہ میری سمجھ میں آتی تھی نہ امریکی اور انگریز گاہکوں کی سمجھ میں آتی تھی مگر خواجہ صاحب سو روپے کی شال پانچ سو میں فروخت کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ہمیشہ اعلیٰ لباس پہنتے۔ اعلیٰ سگریٹ پیتے، قیمتی انگریزی شراب پیتے اور کلکتے کے بازار حسن سونا گاچی کی حسین ترین طوائف کا مجرا سنتے اور بے دریغ روپیہ لٹاتے۔

ایک بار جوئے میں بیوی کا سارا زیور اپنی سونے کی انگوٹھیاں، سونے کی زنجیریں سب کچھ ہار گئے۔ زکریا سٹریٹ کے دکانداروں نے اب ان پر اعتبار کر چھوڑ دیا تھا اور انہیں پھیری پر لے جانے کے لئے مال دیتے ہوئے کتراتے تھے خواجہ صاحب بڑے پریشان ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"سوداں! ہمارا نکاح نامہ تمہارے پاس ہے؟"

اس نے صندوق میں سے نکاح نامہ نکال کر دے دیا۔ اس زمانے کے نکا نامے بڑے بڑے ہوتے تھے۔ رنگ برنگا پھولدار حاشیہ ہوتا تھا اور عبارت نسخ اس طرح لکھی ہوتی تھی کہ عربی زبان کی تحریر لگتی تھی۔ خواجہ صاحب کا نکاح ویسے بھی پرانا ہو کر خستہ ہو چکا تھا۔ نکاح نامہ لے کر ٹیکسی میں بیٹھے اور سیدھا بال یا ٹالی گنج میں ایک انگریز کے بنگلے پر آ گئے۔ اس انگریز کو نوادرات اور پرانی چ جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ جاتے ہی نکاح نامہ کھول کر اس کے آگے رکھ دیا اور خاص ایجاد کردہ انگریزی زبان میں بولنا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب کا بھانجہ احسن کے ساتھ تھا۔ احسن نے مجھے بتایا کہ ماموں فر فر انگریزی بولتے جا رہے تھے۔ بہ خواجہ صاحب نے اس انگریز کو بتایا کہ میں تمہارے لئے ایک ایسی تاریخی دستاوی کر آیا ہوں جو تمہیں ہندوستان میں اور کہیں نہیں ملے گی۔ بوڑھے انگریز نے نکاح نامے کو غور سے دیکھا اس پر لکھی ہوئی عربی تحریر اور نکاح خواں کی لگی انگوٹھی کی مہر کو دیکھا اور پوچھا۔

"ویل خواجہ! یہ کیا ہے؟"

خواجہ صاحب نے کہا۔

"صاحب! یوں سمجھ لو کہ میں تمہارے پاس اپنے باپ دادا کی ساری جائیداد بیچ آیا ہوں۔"

بوڑھا انگریز بڑی دلچسپی سے نکاح نامہ کو دیکھنے لگا۔

"ویل خواجہ! یہ کیا ہے؟"

جب خواجہ صاحب نے محسوس کیا کہ انگریز کا اشتیاق نقطہ عروج پر پہنچ چکا، تو بولے۔

"صاحب! تمہیں معلوم ہے ہلدی گھاٹ پر مرہٹوں اور بادشاہ اکبر کی مغل وں کے درمیان جنگ ہوئی تھی؟"

بوڑھے انگریز نے کہا۔

"یس! ہمیں معلوم ہے۔"

خواجہ صاحب نے کہا۔

"اور ہلدی گھاٹ پر مرہٹوں اور مغلیہ فوج کے درمیان صلح کا معاہدہ ہوا ۔"

"یس۔ ہمیں معلوم ہے۔"

خواجہ صاحب نے نکاح نامے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ وہی تاریخی معاہدہ ہے۔ یہ دیکھو یہ مغل سپہ سالار کے دستخط ہیں۔"

اور خواجہ صاحب نے نکاح نامے پر نکاح پڑھانے والے مولوی صاحب کی ٹھی کی مہر پر انگلی رکھ دی۔ پھر نکاح نامے پر جہاں اپنے الٹے سیدھے دستخط کئے، اس پر انگلی رکھ کر کہا۔

"اور یہ مرہٹہ سردار بالا جی باجی راؤ کے دستخط ہیں۔"

انگریز نے سوال کیا کہ خواجہ یہ معاہدہ تمہارے ہاتھ کیسے لگ گیا۔ اس پر اجہ صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"ہمارے نانا کے والد مغل فوج کی طرف سے اس جنگ میں لڑے تھے۔ انہوں نے کسی طرح یہ معاہدہ اڑا لیا اور تب سے یہ ہمارے خاندان میں ایک وراثت کے طور پر چلا آ رہا ہے اب میرے حالات خراب ہو گئے ہیں اس لئے ر ہو کر تمہارے پاس فروخت کر رہا ہوں۔"

بوڑھے انگریز کو یقین آیا نہ آیا ہو گا لیکن نکاح نامے کو وہ کوئی پرانی دستاو
ضرور سمجھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"ویل خواجہ! تم اس کا کیا لے گا؟"

خواجہ نے کہا۔

"صاحب! یہ ہماری فیملی کی سب سے قیمتی شے ہے۔ اگر میں اسے عجائب گھر
والوں کو دے دوں تو مجھے کچھ نہیں تو دس ہزار روپے ضرور مل جائیں گے لیکن تم
میرے پرانے گاہک ہو اور تمہیں اس قسم کی تاریخی چیزیں جمع کرنے کا شوق بھ
ہے۔ اس لئے میں تم سے اس کے صرف آٹھ ہزار روپے لے لوں گا۔ نہ کم نہ
زیادہ۔"

سات ہزار روپے پر سودا ہو گیا اور خواجہ قمردین اپنا نکاح نامہ سات ہزا
میں انگریز کے ہاتھ فروخت کر کے سیدھے گھر آئے اور بیوی کے آگے سار
روپے رکھ دیئے اور کہا۔

"نکاح نامہ بیچ آیا ہوں۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس کی ایک کاپی امر
والے گھر میں پڑی ہوئی ہے۔

سات ہزار روپے اس زمانے میں بڑی کافی رقم ہوا کرتی تھی۔ یہ
1940ء کا زمانہ تھا۔ خواجہ صاحب نے بیوی کو نیا زیور بنا کر دیا۔ اپنی بھی نئی انگوٹھ
بنوائیں۔ دوسرے دن رات کو وہ بوسکی کی قمیض اور سیاہ پمپ شو پہنے کریون ا
ڈبہ ہاتھ میں لئے سوناگاچی میں مجرا سن رہے تھے۔

میری آوارہ گردیوں کے زمانے میں بھی زکریا سٹریٹ میں میرا ان کا
سامنا ہو جاتا تو مجھے اشارے سے اپنے پاس بلاتے اور والدہ اور والد صاحب کا
پوچھتے اور پھر مجھے امجدیہ ہوٹل میں لے جا کر خوب کھلاتے پلاتے۔ جاتے ہوئ
دس روپے دیتے۔ میں بادل نخواستہ انکار کرتا تو کہتے۔

"پردیس میں ہو تمہارے کام آئیں گے۔ جاؤ کھاؤ پیو۔ ضرورت پڑ
گھر آکر اور لے جانا۔"

میں ہوڑہ سٹیشن سے باہر نکل آیا تھا۔ کسی رشتے دار کے ہاں جانا ا
تھا جیسے شکار خود جال میں جا کر پھنس جائے۔ سوچا لالہ قمر کے ہاں چلتا ہوں
خواجہ قمردین کو لالہ کہا کرتا تھا۔ ان کا فلیٹ لوئر چیت پور روڈ کے پیچھے مو

کے پاس ہی تھا۔ میں وہاں پہنچا تو لالہ گھر پر نہیں تھے۔ ان کی بیوی آپا سوداں باورچی
خانے میں کچھ پکا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ کہنے لگیں۔

"تمہارے لالہ بازار گئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے بیٹھو۔ ناشتہ کیا ہے کہ
نہیں؟"

میں نے کہا۔

"نہیں کیا آپی۔"

آپا سوداں نے مجھے ناشتہ کرایا۔ اتنے میں لالہ قمر بھی آ گئے۔ آتے ہی مجھ پر
نظر پڑی تو بولے۔

"واہ! کب آئے ہو کلکتے؟"

میں نے کہا۔

"صبح کی گاڑی سے آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں یہ بتاؤ گھر سے بھاگ کر آئے ہو ناں؟"

میں شرمندہ سا ہو کر مسکرایا تو لالہ خوش ہو کر بولے۔

"شاباش! جب تم گھر سے بھاگ کر آتے ہو تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔"

آپا سوداں کہنے لگی۔

"ایسی تعلیم تو نہ دیں اسے۔ گھر سے بھاگنا کوئی اچھی بات ہے۔ آپو جی کتنی
پریشان ہو رہی ہوں گی؟"

ہم اپنی والدہ صاحبہ کو آپو جی کہا کرتے تھے۔ لالہ قمر نے اسے جھڑک کر
کہا۔

"تم چپ کرو۔ تمہیں کیا پتہ آدمی مرد کیسے بنتا ہے۔ ارے یہ گھر سے
بھاگے گا نہیں تو دنیا میں اپنا مقام کیسے پیدا کرے گا۔ بس ٹھیک ہے۔ اس کے آنے کی
خوشی میں آج ساگ مچھلی اور کوفتے پکیں گے۔"

لالہ قمر کی اعلیٰ پوشاک اور سونے کی انگوٹھیوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ آج
کل ان کی جوئے میں جیت ہو رہی ہے۔ مجھ سے پوچھا۔

"زکریا سٹریٹ کی طرف تو نہیں گئے ناں؟"

میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ وہ لوگ تو مجھے پکڑ لیتے ہیں۔"

لالہ قمر نے زکریا سٹریٹ والے اپنے اور میرے سارے رشتے داروں کو گالی دی اور کہا۔

"ادھر کبھی نہ جانا۔ وہ سب روپے پیسے کے غلام ہیں۔ دنیا دار لوگ ہیں۔ انہیں گولی مارو۔ یہاں جتنے دن چاہے میرے پاس رہو۔ کھاؤ پیئو عیش کرو۔"

جب آپا سوداں نے کہا کہ لڑکے کی یعنی میری پڑھائی کا حرج ہو گا اور مجھے واپس جانا چاہیئے تو لالہ قمر نے کریون اے سگریٹ کا لمبا کش لگانے کے بعد کہا۔

"پڑھ لکھ کر ہم نے کیا کر لیا ہے جو یہ کرے گا؟ یاد رکھنا۔ امرتسری کشمیریوں کے لڑکوں کو صرف دو کام سوٹ کرتے ہیں۔ عشق محبت کرنا اور پہلوانی کرنا۔ بس۔"

دوپہر کو لالہ قمر مجھے اپنے ساتھ کلکتے کی سیر کرانے لے گئے۔ ہم وکٹوریہ میموریل بھی گئے۔ یہ عجائب گھر میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ مگر لالہ قمر کے ساتھ زیادہ مزا آیا۔ خاص طور پر وہ جو کمنٹری کر رہے تھے وہ وہاں کا کوئی تجربہ کار گائیڈ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وکٹوریہ میموریل کلکتے میں تاج محل کی طرز کی انگریزوں کی بنائی ہوئی عمارت ہے جہاں ہندوستانی اور برطانوی نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ایک خوبصورت باغ میں بنی ہوئی دو منزلہ سنگ مرمر کی عمارت ہے جس کے سامنے ایک جھیل ہے۔ جھیل میں کنول کے پھول کھلے ہوتے ہیں۔ ہم برطانیہ کے شاہی خاندان کی رنگین تصویریں دیکھ رہے تھے۔ لالہ قمر نے کہا۔

"انگریزوں نے دنیا میں ایک ہی زبردست کام کیا ہے۔ انہوں نے جو وسکی بنائی ہے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

سورج غروب ہونے کے بعد لالہ قمر کمرے میں سکاچ کی بوتل لے کر بیٹھ گئے۔ ایک سیر دہی سے بھرا ہوا پیالہ اور بھنی ہوئی کلیجی کی پلیٹ سامنے رکھ لی۔ خوب نہا دھو کر بوسکی کی نئی قمیض اور جالی کے لٹھے کی نئی شلوار پہن رکھی تھی۔ کریون اے کا ڈبہ اور سنہری لائیٹر میز پر شیشے کے چمکدار گلاس کے پاس ہی پڑا تھا۔ کپڑوں بڑا عمدہ پرفیوم لگا رکھا تھا۔ شراب بناتے ہوئے بولے۔

"میں تو اس بری عادت میں پڑ گیا ہوں تم کبھی اسے ہاتھ بھی نہ لگانا سگریٹ بے شک پینا۔ مجرا بے شک سننا۔ مگر شراب کو کبھی ہاتھ نہ لگانا۔ یہ شیرنی دودھ ہے۔ اسے پچانا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ ارے میں نے تو اس شیرنی پر سوار

ڈال رکھی ہے۔ کبھی چار ڈبل پیگ سے زیادہ نہیں پیتا۔"

اتنے میں آپا سوداں مزید بھنا ہوا گوشت لے کر آ گئیں۔ انہوں نے لالہ سے کہا۔

"آج پھر زیادہ نہ پی جانا۔ لڑکا کیا کہے گا۔"

لالہ قمر نے گلاس پر ہاتھ رکھ دیا اور جھڑک کر کہا۔

"سارا مزا خراب کر دیا۔"

پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔

"کبھی کبھی یہ شیرنی ہاتھ سے نکل جاتی ہے جیسے نوجوان گھوڑی نہیں کبھی کبھی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی؟ بس اسی طرح کبھی کبھی یہ شیرنی بھی میرے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ بس تم اسے ہاتھ نہ لگانا۔"

میں اٹھ کر کچن میں آپا کے پاس جانے لگا تو لالہ قمر نے میرا بازو پکڑ کر مجھے زبردستی بٹھا لیا۔

"ارے یہاں سے چلے جاؤ گے تو تمہیں یہ کیسے پتہ چلے گا کہ شراب آدمی کا کیا حال کرتی ہے۔"

دو ڈبل چڑھانے کے بعد لالہ قمر بڑے موڈ میں آ گئے تھے۔ پہلے پیگ پر وہ اپنے تمام رشتے داروں کی تعریف کر رہے تھے کہ رشتے دار آخر رشتے دار ہوتا ہے اور اپنا خون ہوتا ہے۔ دوسرے پیگ پر ان کا لہجہ بدل گیا۔ کہنے لگے۔

"مگر کوئی کوئی رشتہ دار بڑے حاسد ہوتے ہیں۔ وہ دوسرے رشتے دار کو خوش ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔"

تیسرے پیگ کے بعد وہ تمام رشتے داروں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے انہیں گالیاں دے رہے تھے۔ میں کسی بہانے اٹھ کر آپا کے پاس کچن میں آ گیا۔ آپا سوداں کہنے لگیں۔

"مجھ سے ان کا سلوک بڑا اچھا ہے۔ مجھے ہر طرح کا آرام دیتے ہیں مگر جوئے اور شراب نے ان کی زندگی برباد کر دی ہے۔ تم نے خود انہیں دیکھ لیا ہے۔ تم ابھی نوجوان ہو خبردار ساری زندگی کبھی جوئے اور شراب کے قریب نہ جانا۔ ہمارے مذہب نے یونہی ان چیزوں کو حرام قرار نہیں دیا۔ یہ آدمی کو تباہ کر دیتی ہیں۔"

رات کو لالہ قمر سونا گاچی گانا سننے چلے گئے اور میں کچھ دیر آپا سے باتیں کرنے کے بعد سو گیا۔

اگلے دن میں اکیلا کلکتے کی سیر کرنے نکل گیا۔ خضر پور جیٹی پر بہت سے لوگوں کو گیٹ کی طرف اپنے سامان کے ساتھ جاتے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک سمندری جہاز رنگون جا رہا ہے۔ رنگون کے بارے میں بڑی پراسرار باتیں سن رکھی تھیں اور ایک فلم میں رنگون کے کسی جنگل میں بارش ہوتی بھی دیکھ لی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر آوارہ گردی کرنی ہے تو کیوں نہ رنگون چلا جائے۔ ایک آدمی سے پوچھا کہ رنگون کا کرایہ کتنا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی کا جہاز کے ڈیک کا کرایہ پچیس روپے ہے۔ میرے پاس دس روپے کم تھے۔ برما پر بھی اس زمانے میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ ویزا پاسپورٹ کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف میڈیکل چیک اپ کے بعد دو تین ٹیکے لگا دیئے جاتے تھے۔ مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اگلا بحری جہاز تین دن کے بعد رنگون روانہ ہوگا۔ میں نے لالہ قمر سے بات کی تو وہ کہنے لگے۔

"بس ٹھیک ہے۔ رنگون ضرور جاؤ۔ اس طرح تمہارا بحر کھل جائے گا۔ مگر وہاں رہو گے کہاں؟ کھاؤ گے کہاں سے؟"

ان چیزوں کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ بس اللہ کا نام لے کر جدھر جانا ہوتا تھا چل پڑتا تھا۔ میں نے جواب دیا۔

"وہاں پہنچ گیا تو کچھ نہ کچھ بندوبست کر لوں گا۔"

"شاباش میں چاہتا ہوں کہ کشمیریوں کے بچے شیر کے بچوں کی طرح جنگل میں چل پھر کر اپنی خوراک آپ پیدا کریں۔" میں نے انہیں کہا کہ میرے پاس کرائے کے پیسے پورے نہیں ہیں۔ لالہ قمر نے ہنس کر میرے کندھے پر تھاپی مارتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا ہوا؟ میں یہاں کس لئے بیٹھا ہوں۔ کتنے پیسے کم ہیں؟"

"صرف دس روپے۔"

"بس؟ جہاز کب جا رہا ہے؟"

میں نے کہا۔

"تین دن بعد کلکتے سے روانہ ہوگا۔"

"فکر نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لالہ قمر نے مجھے نئی پتلون نئی قمیض اور نئے بوٹ لے کر دیئے۔ جہاز دوپہر کے وقت روانہ ہونے والا تھا۔ وہ مجھے امجدیہ ہوٹل میں لے کر آ گئے۔ مجھے اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور باتیں کرنے لگے۔

"میری ایک دو باتیں ہمیشہ یاد رکھنا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں شراب کبھی نہ پینا۔ جوا کبھی نہ کھیلنا۔ ایک اور بات سن لو۔ شریف عورتوں پر کبھی بری نگاہ نہ ڈالنا۔ اور یہ جو طوائف عورتیں ہوتی ہیں ان کو کبھی شریف نگاہوں سے نہ دیکھنا۔ شریف عورتوں سے نظریں جھکا کر بات کرنا لیکن طوائفوں سے آمنے سامنے آکر کھل کر بات کرنا۔ کبھی گھٹیا سگریٹ نہ پینا۔ فاقے کر لینا مگر روکھی سوکھی روٹی کبھی نہ کھانا۔ جب کھانا ساگ مچھلی اور پلاؤ بریانی کھانا۔ چلو جہاز والوں کے دفتر میں چلتے ہیں۔ وہاں سے تمہارا ٹکٹ بھی لینا ہے۔"

جہاز دوسرے روز روانہ ہونے والا تھا۔ لالہ قمر نے ایک دن پہلے میرا ڈیک کا ٹکٹ خرید کر مجھے دے دیا۔ مجھے خود بندرگاہ یعنی کلکتے کی خضرپور جیٹی پر چھوڑنے آئے۔ بڑے گیٹ کے پاس آکر انہوں نے مجھے روکا۔ جیب سے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر دیئے اور کہا۔

"انہیں کنجوسوں کی طرح سوچ سوچ کر خرچ نہ کرنا۔ بس بے دھڑک خرچ کر ڈالنا۔ اگر سوچ سوچ کر خرچ کرو گے تو آگے سے روپے آنا بند ہو جائیں گے۔ جاؤ۔"

میں انہیں سلام کر کے گیٹ میں سے گزرتا ہوا بڑے ہال میں پہنچ گیا۔ یہاں کتنے ہی مسافر اپنے اپنے سامان کے پاس بال بچوں سمیت بیٹھے تھے۔ میں بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ مسافروں میں ہر صوبے کے لوگ تھے۔ ہر صوبے کا لباس نظر آ رہا تھا۔ ان میں بنگالی بھی تھے مدراسی بھی تھے مگر گجراتی اور سورتی میمن لوگ زیادہ تھے۔ ایک گھنٹے بعد ہال کا دوسرا گیٹ کھلا۔ سارے مسافر اس طرف دوڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ گیٹ پر ٹکٹ چیک ہوتے تھے۔ یہاں بھی آدھا گھنٹہ لگ گیا۔ سامنے جیٹی کا وارف یعنی پلیٹ فارم تھا۔ ایک بہت بڑا سمندری جہاز کھڑا تھا۔ اس کی

ایک جانب بڑے بڑے تختوں کی سیڑھی لگی تھی جس پر سے قلی مسافروں کا سامان لے کر اوپر جا رہے تھے۔ جہاز کی پہلی منزل اور دوسری منزل کی لمبی گیلریوں میں فسٹ اور سیکنڈ کلاس کے مسافر پہلے سے سوار ہو چکے تھے اور گیلری کی ریلنگ کے ساتھ لگے تھرڈ کلاس کے مسافروں کی بدحواسیوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ کوئی مسافر سامان کی طرف دوڑ رہا تھا۔ کوئی عورت بچے کو سنبھال رہی تھی۔ کوئی کسی کو آواز دے رہا تھا۔ کوئی کسی کو بلا رہا تھا۔ جہاز کی پچھلی طرف چوڑے تختوں والی سیڑھی لگ گئی تھی۔ یہ سیدھی اوپر اپر ڈیک پر جاتی تھی۔ دوسرے مسافروں کے ساتھ میں بھی اپر ڈیک پر آ گیا۔ زندگی میں پہلی بار سمندری جہاز پر سفر کا اتفاق ہو رہا تھا۔ اوپر جاتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ جہاز بہت بے معلوم انداز میں اوپر نیچے ہو رہا ہے۔

کافی کشادہ ڈیک تھا۔ مسافر شور مچاتے قلیوں کو آوازیں دیتے ڈیک کے درمیان ترپال کے بہت بڑے سائبان کے نیچے اپنا اپنا سامان لگوا رہے تھے۔ میرے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں تھا۔ میں ڈیک کی دوسری طرف جا کر جنگلے پر جھک کر دیکھنے لگا۔ نیچے دریا کا گدلا گدلا پانی تھا۔ یہ دریائے ہگلی تھا جو پیچھے سے دریائے جمنا کے نام سے آتا تھا اور بنگال میں داخل ہونے کے بعد دریائے ہگلی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ دریا کا دوسرا کنارا کافی دور تھا۔ وہاں درختوں کے جھنڈ دور تک چلے گئے تھے۔ دریا میں دو تین سٹیمر اور ماہی گیروں کی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ جہاز پر مسافروں کا شور مچا ہوا تھا۔ جہاز کے پیچھے کی جانب آبی پرندے غوطہ لگا کر نیچے آتے اور پھر اوپر اٹھ جاتے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں آسمان پر بادلوں کے ٹکڑے بھی نظر آ رہے تھے۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں جنگلے سے ہٹ کر جہاز کے سامنے والے حصے میں آ گیا۔ یہاں ڈیک کے دونوں جانب کے جنگلے آ کر مل جاتے تھے۔ یہاں لوہے کے راڈ کے اوپر جہاز والوں کا اپنا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ میں نے نیچے جھک کر دیکھا۔ جہاز کے پیندے میں سے لنگر کا آہنی سنگل دریا کے پانی کے اندر گیا ہوا تھا۔

جہاز بے معلوم انداز سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ کونے میں بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ میں وہاں بیٹھ گیا۔ یہاں ہوا ذرا تیز تھی۔ میرا دل سگریٹ پینے کو چاہا۔ میری جیب میں کیونڈر کا پیکٹ تھا مگر میں نے سگریٹ نہ نکالا۔ تیز ہوا میں سگریٹ پینے کا مزا ضائع ہو جاتا ہے۔ فضا ساکن ہو تو سگریٹ کی خوشبو آدمی کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ تیز ہوا چل رہی ہو تو یہ خوشبو اڑتی جاتی ہے۔ میں بیٹھا سوچنے لگا کہ

رنگون پہنچ کر کسی نہ کسی جگہ چھوٹا موٹا کام تلاش کر لوں گا اور پھر شہر کی سیر کروں گا۔ برما کے جنگل دیکھوں گا۔ ان جنگلوں کی بارشیں دیکھوں گا۔ میں دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے جہاز چلنے کی تیاری کر رہا ہے۔ میں اٹھ کر جہاز کے جیٹی والے جنگلے پر آ گیا۔

جہاز کی ایک سیڑھی اتار دی گئی تھی۔ دوسری سیڑھی اتاری جا رہی تھی۔ دونوں جانب مزدور لوگ پلیٹ فارم پر لوہے کے بھاری ستون سے بندھے ہوئے موٹے رسے کھول رہے تھے۔ عرشے کے فرش میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ پھر جہاز کے انجن چلنے کی آواز آنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی جہاز کی دونوں جانب کے لنگر اٹھنے لگے۔ لنگر اٹھانے والی چرخی زور سے گھوم رہی تھی۔ جب لنگر چرخی کے ساتھ لپیٹ دیئے گئے تو جہاز نے تین چار بار وسل دیئے۔ میں نے نیچے دیکھا۔ جہاز پلیٹ فارم سے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہا تھا۔ مجھے پلیٹ فارم کی دیوار کے ساتھ لگے ہوئے بڑے بڑے ٹائر نظر آنے لگے۔ یہ اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ جہاز جیٹی کے ساتھ لگتے وقت رگڑ نہ کھائے۔ جیٹی پر کھڑے لوگ گیلری اور اوپر کے ڈیک پر کھڑے لوگوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہے تھے۔

جہاز اور پلیٹ فارم کے درمیان فاصلہ بڑھ رہا تھا۔ بندرگاہ کے پلیٹ فارم کو گودی بھی کہتے ہیں مگر یہ نام مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے بار بار پلیٹ فارم لکھ رہا ہوں۔ جہاز دیر تک آگے یا پیچھے جانے کی بجائے پہلو کی طرف پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ جب جیٹی یعنی بندرگاہ اور جہاز کے درمیان کافی فاصلہ پڑ گیا تو جہاز دریا میں سیدھا چلنے لگا۔ میں جلدی سے جہاز کے عقبی ڈیک پر آ گیا۔ کلکتہ کی بندرگاہ دور ہو رہی تھی۔ پہلے رخصت کرنے والے لوگوں کی شکلیں غائب ہوئیں۔ پھر بندرگاہ کی عمارت بھی چھوٹی ہوتی گئی۔ جہاز کے سارے انجن چل رہے تھے۔ جہاز آگے نکل آیا تھا۔ میں جہاز کے سامنے والی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا۔ دریا کا بائیں جانب والا کنارا بھی پیچھے ہٹ رہا تھا۔ دریا میں لوہے کے بنے ہوئے بڑے بڑے گولے جگہ جگہ ابھرے ہوئے تھے۔ یہ جہاز کو شاید راستہ دکھا رہے تھے۔

سورج مغرب کی جانب غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ سنہری ہو کر سمٹ رہی تھی۔ دریا کے کنارے دور رہ گئے تھے۔ دریا کا پاٹ بہت کشادہ ہو گیا تھا۔ آہستہ آہستہ کلکتے کے کارخانوں کی چمنیاں بھی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ ابھی شام کے

سائے نہیں اترے تھے کہ میں نے دریا کو ڈیک پر سے جھک کر دیکھا۔ دریا کے گدلے پانی میں سمندر کے پانی کی نیلی نیلی لہریں شامل ہونے لگی تھیں۔ دریا نے کہا تھا' مجھے وہاں آ کر ملنا۔ جہاں میں سمندر میں گرتا ہوں۔ یہ وہی مقام تھا۔ دریا سمندر سے ہم آغوش ہو رہا تھا۔ میں دریا کی لہروں کو سمندر کی نیلی لکیروں کے ساتھ گلے ملتے دیکھ رہا تھا۔ مجھے رنگون کے دریا ایراوتی کے ملاحوں کا گیت یاد آ گیا۔ یہ گیت بلکہ اصلی گیت کا ترجمہ میں نے امرتسر میں لائبریری کی ایک کتاب میں پڑھا تھا۔

ایراوتی! اری او ایراوتی!
سب ندیاں پیاری ہیں
سب سے پیاری ہے ایراوتی
دن بھر میں ناؤ کھیتا ہوں
تیرے پانیوں پر او ایراوتی!
ملاح کی زندگی بجائے خود ایک گیت ہے
تیرے پانیوں پر --- ایراوتی!
سندر لڑکیاں ناچ رہی ہیں' جھوم رہی ہیں
تیزی سے' کبھی دھیرے دھیرے
تم نے یہ ناچ کہاں سے سیکھا ہے؟
بتاؤ ایراوتی کی بیٹیو!
ہم ہیں مور اور تم ہو مورنیاں
مور مارے جائیں گے اور تم رویا کرو گی
دریا کے اس موڑ پر ناچ سیکھا تھا یا اس پہاڑ پر
جہاں سے ایراوتی نکلتی ہے؟

ایراوتی میں ہمارے آنسو سماتے رہے ہیں بھائیو!
ایراوتی کتنی میلی ہو رہی ہے
اور جب غریبی ہمارے گلے گھونٹ دے گی
ایراوتی اسی طرح بہتی رہے گی

بہتی جا ماں اراوتی!
تیزی سے کبھی دھیرے دھیرے
اراوتی تو چپ کیوں ہے؟
اداس کیوں ہے؟
ہمارے آنسو شوق سے پئے جا
ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم ہیں تیرے بیٹے
بہتی جا ماں اراوتی! تیزی سے
کبھی دھیرے دھیرے ---"

میں نے اپنے دل سے کہا۔ رنگون پہنچ کر سب سے پہلے اراوتی دریا کو دیکھوں گا۔ اراوتی دریا کی لہروں کو پیار کروں گا۔ اس وقت مجھے لاہور کا دریائے راوی یاد آ گیا۔ اگر میں راوی کا ملاح ہوتا تو ضرور دریائے راوی کی لہروں کا ایک گیت بناتا۔ اور راوی کی لہروں کو کہتا۔

راوی کی لہرو! تم میں میرے آنسو
سماتے رہے ہیں
راوی کی لہرو! تم اداس کیوں ہو
چپ کیوں ہو؟
میرے آنسوؤں کے موتی لے کر تم کون سے سمندر کو جاتی ہو؟

مگر میں لاہور کے دریائے راوی سے بہت دور تھا اور مزید دور ہوتا جا رہا تھا۔ ابھی جہاز ہگلی دریا میں ہی رواں دواں تھا۔ زمین پر سارے دریا ایک دوسرے سے دور دور ہو کر بہتے ہیں۔ سمندر میں جا کر سارے دریا ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ پھر وہاں کسی دریا کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ دریا اپنا نام کبھی نہیں رکھتا۔ میرا سگریٹ پینے کو بہت جی چاہا۔ دریا پر شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ جہاز کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ مجھے اپنے لئے ڈیک پر کوئی جگہ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈیک بہت کشادہ تھا۔ میں رات کو کسی جگہ پر پڑ کر سو سکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے رات کو سونا پسند نہیں ہے۔ دوسروں کو سوتے دیکھ کر اداس ہو جاتا ہوں کہ یہ لوگ اٹھ کر باتیں کیوں

نہیں کرتے۔ سماوار گرم کر کے محفل کیوں نہیں لگاتے۔ رات کو سارے گیت جاگ پڑتے ہیں۔ سارے درد بیدار ہو جاتے ہیں۔ نطشے نے بھی یہی لکھا ہے۔
"رات کو چشموں کی آواز زیادہ قریب سے سنائی دینے لگتی ہے دن کے وقت جو درد سو رہے ہوتے ہیں وہ رات کو بیدار ہو جاتے ہیں۔"

میں تیز ہوا میں سگریٹ نہیں سلگانا چاہتا تھا۔ میں نے معلوم کر لیا تھا کہ تیسرے درجے کے مسافروں کے واسطے کینٹین نیچے لوئر ڈیک میں ہے۔ میں تنگ سیڑھیاں اتر کر نیچے لوئر ڈیک میں آ گیا۔ یہاں جگہ جگہ مسافروں کی ٹولیاں اپنے سامان کے انبار لگائے جمع تھیں۔ ایک طرف چھوٹی سی کینٹین بنی ہوئی تھی۔ کاؤنٹر کے پیچھے ایک کالا کلوٹا مدراسی تانبے کے بڑے حمام کے پاس بیٹھا گاہکوں کو کھانے پینے کی چیزیں دے رہا تھا۔ فضا میں گرمی اور حبس تھا۔ صرف وہاں تازہ ہوا آ رہی تھی جہاں ہوا دان لگا ہوا تھا۔ یہ ہوا دان بڑے پائپ کی شکل میں تھا جس کا منہ اوپر جہاز کے عرشے پر جا کر ٹیڑھا ہو کر کھلتا تھا۔

میں نے مدراسی کینٹین والے سے چائے مانگی تو اس نے شکستہ ہندوستانی میں بتایا کہ کینٹین میں صرف کافی ملتی ہے چائے نہیں۔ میں نے کافی کا ایک گلاس لیا اور کاؤنٹر پر ایک طرف ہو کر پینے لگا۔ جنوبی ہند میں کافی بہت پی جاتی ہے۔ میں نے مدراس اور ترچناپلی میں بھی کافی پی تھی۔ یہ کافی بھی تازہ اور تلخ تھی۔ مجھے بہت اچھی لگی۔ اس میں ساگوان کے درخت کی خوشبو آ رہی تھی۔ یہ مقامی کافی تھی۔ انگریزی یا امریکن کافی نہیں تھی۔ یورپ کی کافی سے مجھے رومن دور کے پرانے قلعوں کی اونچی فصیلوں کی ڈھلانوں پر خاموش کھڑے سائپرس کے درخت یاد آ جاتے ہیں۔ قلعوں کی خاموش ویران راہ داریاں یاد آتی ہیں اور ان قلعوں کے وہ ایوان یاد آ جاتے ہیں جہاں کبھی حسین شہزادیاں بے آواز قدموں سے اپنے مخملیں لباس کی سرسراہٹوں کے ساتھ چلا کرتی تھیں۔ لیکن جنوبی ہند کی کافی مجھے ساگوان کے درختوں والے جنگلوں میں لے جاتی ہے جہاں تاریک اندھیری راتوں میں دریا خاموشی سے بہتے ہیں اور بانس کے جھنڈوں پر اوس گرتی ہے --- کافی پی کر میں نے سگریٹ سلگایا تو مجھے خوشبوؤں میں ڈوبے تاریک معبدوں میں رقص کرتی دیوداسیوں کے سائے لہراتے نظر آنے لگے۔ جب تک میرا پورا سگریٹ ختم نہیں ہو گیا میں وہیں کاؤنٹر کے پاس کھڑا دیوداسیوں کے رقص کرتے سایوں کو دیکھتا رہا۔ سگریٹ ختم ہو گیا۔ رقص

ختم ہو گیا۔

اور میں زینہ چڑھ کر اوپر والے ڈیک پر آ گیا۔ جہاں لنگر ڈالنے والی مشین لگی تھی۔ وہاں اوپر ایک بلب روشن تھا۔ میں نے وہیں لیٹ کر رات بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس وقت یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ مگر جنگ ابھی تک یورپ میں ہی لڑی جا رہی تھی ساؤتھ ایسٹ ایشیا ابھی تک پرامن تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جہاز پر رات کو بلیک آؤٹ نہیں ہوا تھا۔ کلکتہ میں بھی بلیک آؤٹ نہیں ہوتا تھا یہاں جنگ اخباروں کی خبروں اور کارخانوں میں سامان تیار کرنے تک ہی محدود تھی۔ جاپان نے ابھی اعلان جنگ نہیں کیا تھا۔ ڈیک پر مسافروں نے اپنی اپنی جگہیں بنا لی تھیں۔ رات ہو چکی تھی۔ جہاز ایک خاص رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ میں نے جنگلے کے پاس جا کر جھک کر دیکھا۔ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جہاز ابھی دریا میں ہی ہے یا سمندر میں داخل ہو گیا ہے میرے قریب ہی ایک مسافر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا جہاز سمندر میں جا رہا ہے؟"

وہ بولا۔

"نہیں۔ سمندر آدھی رات کے بعد آئے گا۔ اس وقت جہاز ڈولنا شروع کر دے گا۔"

میں لنگر ڈالنے والی مشین کے پاس آ کر نیم دراز ہو گیا۔ بڑی خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ میرے اوپر ترپال کا بہت بڑا سائبان لگا تھا۔ اگر بارش ہوئی تو میں محفوظ رہ سکتا تھا۔ میں ڈیک پر رہ کر بارش دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ تین دن کا سمندری سفر تھا۔ جہاز بہت پرسکون انداز میں ڈول رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ جہاز میں چکر ضرور آئیں گے۔ راولپنڈی سے کوہ مری جاتے ہوئے مجھے بس میں بھی چکر آ جایا کرتے تھے۔ لیکن جہاز اتنے آرام سے ڈول رہا تھا کہ ابھی تک مجھے ایک بھی چکر نہیں آیا تھا۔

میں بڑا مطمئن تھا۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے بھوک محسوس ہوئی۔ میں لوئر ڈیک والی کینٹین پر آ گیا۔ یہاں تھوڑے بہت چاول کھائے اور ایک پورا سگریٹ ختم کرنے کے بعد اوپر آ کر لیٹ گیا۔ بادلوں کی وجہ سے بھی ہوا ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ مجھے

نیند آ گئی۔ جب آنکھ کھلی تو جہاز کافی ڈول رہا تھا۔ باقاعدہ رولنگ شروع ہو گئی ہوئی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر سنبھل سنبھل کر چلتا جہاز کے سرے پر آیا جہاں بیٹھنے کے لئے لوہے کی سیٹ بنی ہوئی تھی۔ آہستہ سے ریلنگ کو پکڑ کر دیکھا تو دریا اور زمین غائب ہو چکی تھی۔ چاروں طرف گہرے سیاہ رنگ کا سمندر ہی سمندر تھا۔ بڑی بڑی موجیں اپنی جگہ پر اوپر نیچے ہو رہی تھیں۔ جیسے سمندر سانس لے رہا ہو۔ جہاز سمندر کو کاٹتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جہاز کے تکونے حصے سے ٹکرا کر سمندر کی موجیں دائیں بائیں اسقدر تیزی سے پیچھے کو جا رہی تھیں کہ ان پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ میں حیران تھا کہ سمندر اتنا کالا سیاہ کیوں ہے۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ اس وقت مجھے زمین بہت یاد آئی۔ میں نے سوچا کہ اگر جہاز ڈوب گیا تو میرے زندہ بچنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ مجھے پڑھی ہوئی وہ کہانیاں یاد آنے لگیں جن میں جہاز ڈوب جاتا ہے اور جہاز کے مسافر تختوں پر بیٹھ کر جان بچاتے ہیں اور پھر کھلے سمندر میں اللہ کے بھروسے پر نکل پڑتے ہیں۔ میں نے سمندر کو دیکھا۔ سمندر کو دیکھ کر مجھ پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ خدا کی خدائی یاد آ رہی تھی۔ اس سمندر میں اگر میں کسی تختے پر جان بچا کر بیٹھنے میں کامیاب بھی ہو گیا تو اتنے بڑے سمندر میں کتنی دیر تک زندہ رہ سکوں گا۔

زمین! زمین! پیاری زمین! کاش زمین پھر سے نظر آ جائے۔ میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا واپس لنگر کی مشین کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ڈیک پر دوسرے مسافر اپنے اپنے کاموں میں لگے تھے۔ کوئی سامان ٹھیک کر رہا تھا۔ کوئی بستر جھاڑ کر دوبارہ بچھا رہا تھا۔ کچھ مسافروں نے اپنی خواتین کے پردے کے واسطے چادریں اور کھیس تان رکھے تھے۔

جہاز کچھ اس طرح ڈول رہا تھا کہ کبھی دائیں ہو جاتا کبھی بائیں اور کبھی آگے کو جھک جاتا اور کبھی اوپر کو اٹھ جاتا۔ مجھے چکر آنا شروع ہو گئے۔ مجھے فکر پڑ گیا کہ یہاں میری طبیعت خراب ہو گئی تو کیا کروں گا۔ یہاں تو مجھے پوچھنے والا بھی کوئی نہیں۔ میں نے سوچا نیچے لوئر ڈیک پر چلتا ہوں۔ شاید وہاں چکر نہ آئیں۔ میں دیوار کو پکڑ کر زینے تک پہنچا۔ پھر زینہ اتر کر نچلے ڈیک میں آ گیا۔ یہاں ایک طرف پوربیوں نے گانے بجانے کی محفل لگائی ہوئی تھی۔ ڈھولک بجا کر کوئی گیت گا رہے تھے۔ جہاز یہاں بھی ڈول رہا تھا لیکن اوپر کی نسبت رولنگ کم محسوس ہو رہی تھی۔ کینٹین پر

سے میں نے بادل نخواستہ ناشتہ کیا اور کافی کا مگ لے کر لوہے کی ایک پٹی پر بیٹھ گیا۔ کافی پینے سے طبیعت کچھ سنبھل گئی۔ دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ یہاں ایک لڑکے سے میری صورت شناسائی ہو گئی۔ یہ سورتی میمن مسلمان لڑکا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو میرے پاس آگیا۔

"چکر آ رہے ہیں؟"

میں نے اس کی طرف دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"اوپر زیادہ آ رہے تھے۔"

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"جہاز کے ڈاکٹر کے پاس جا کر کوئی دوا پی لینا۔ چکر ختم ہو جائیں گے۔ میں کلکتے آتا جاتا رہتا ہوں پہلے پہل مجھے بھی چکر آیا کرتے تھے اب نہیں آتے۔ اگر آئیں تو جہاز کا ڈاکٹر مجھے ایک خوراک پلا دیتا ہے۔"

اس لڑکے کا نام کریم الدین تھا۔ رنگون میں اس کے باپ کی کپڑے کی دکان تھی۔ میں نے کہا۔

"جہاز کا ڈاکٹر کہاں ملے گا؟"

کریم بولا۔

"میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لئے چلتا ہوں۔"

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ جہاز کا ڈاکٹر جہاز کی دوسری منزل والے کیبنوں میں سے ایک کیبن میں مل گیا۔ یہاں اس کی چھوٹی سی ڈسپنسری تھی۔ یہ ڈاکٹر ہندوستانی تھا۔ اس نے مجھے سٹریچر پر بٹھا دیا اور شیشے کے چھوٹے سے گلاس میں گہرے لال رنگ کی دوائی ڈال کر دی۔

"اس کو پی جاؤ۔ چکر وکر سب ختم ہو جائیگا۔"

میں ناک بند کر کے دوائی پی گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے گلے میں سے گرم اور کڑوی شے اتر گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی میرے جسم میں گرمائش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میری طبیعت بحال ہو گئی۔ چکر غائب ہو گئے۔ ڈاکٹر بولا۔

"اگر چکر پھر آگیا تو میرے پاس آ کر دوائی پی جانا۔"

میں اور کریم اوپر والے ڈیک پر آ گئے۔ سمندری ہوا چل رہی تھی۔ بڑی تیز اور نم دار ہوا تھی۔ مجھے کچھ سرور سا محسوس ہوا۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

"یہ کس قسم کی دوائی تھی اس کا نام معلوم ہے تمہیں؟"

کریم الدین نے ہنس کر کہا۔

"یہ برانڈی تھی۔"

میں نے پہلے کبھی برانڈی نہیں پی تھی۔ سنا ضرور تھا کہ آدمی کو زیادہ سردی لگے یا نمونیہ ہو جائے تو اسے برانڈی پینے کو دیتے ہیں۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ یہ ایک قسم کی شراب ہی ہوتی ہے۔ میں نے کریم سے کہا۔

"یہ تو شراب ہوئی پھر۔"

وہ بولا۔

"برانڈی اور ہوتی ہے۔ شراب اور ہوتی ہے۔ برانڈی تو ڈاکٹر خود مریضوں کو دیتے ہیں۔"

دوپہر کے بعد بارش شروع ہو گئی۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں۔ جہاز زیادہ شدت سے ڈولنے لگا۔ برانڈی کا اثر ضائع ہو چکا تھا۔ شام کے وقت مجھے دوبارہ چکر آنا شروع ہو گئے۔ میں نیچے ڈاکٹر کے کیبن میں گیا۔ برانڈی کی ایک اور خوراک پی اور طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی۔

ساری رات بارش ہوتی رہی۔ تیز ہوائیں چلتی رہیں۔ جہاز بری طرح سے ڈولتا رہا۔ رات کو میں نے برانڈی کی ایک اور خوراک پی لی۔ جہاز ڈولتا رہا اور میں لوئر ڈیک کے فرش پر بے فکر ہو کر سویا رہا۔ رات میں کسی وقت آنکھ کھلی۔ جہاز بدستور رولنگ کر رہا تھا۔ مگر میری طبیعت ٹھیک تھی۔ میں دوبارہ سو گیا۔ میرے جہاز کے دوست کریم نے مجھے ایک چادر تکیہ دے دیا تھا۔ دن کے وقت اٹھا تو رولنگ کم ہو رہی تھی۔ اوپر ڈیک پر آیا تو دیکھا سمندری طوفان گزر چکا تھا۔ سمندر میں وہ ہیجان نہیں تھا مگر بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ سر بھاری ہو رہا تھا۔ نیچے آ کر کینٹین پر ناشتہ کیا۔ کافی پی رہا تھا کہ کریم الدین بھی آ گیا۔

"اب طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔

"ٹھیک ہوں۔ ابھی رنگون کتنی دور ہے؟"

کریم بولا۔

"ابھی کل کا دن اور رات بھی سمندر میں گزرے گی۔ پرسوں دن کے

وقت رنگون آئے گا۔"

کریم کو معلوم تھا کہ میں رنگون صرف سیر و سیاحت کے لئے جا رہا ہوں اور وہاں میرا کوئی جان پہچان والا نہیں ہے۔ وہ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔

"ہمارے گھر میں تو ایسی کوئی جگہ نہیں ہے ہمارا ایک گودام ہے۔ وہاں اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے لئے چارپائی بچھوا دوں گا۔ جب تک تمہیں کوئی دوسری جگہ نہیں مل جاتی تم وہیں رات کو سو جایا کرنا۔"

میرے لئے یہی بہت تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ گودام رنگون شہر میں ہے یا شہر کے باہر ہے۔ کریم نے کہا۔

"شہر سے تین چار میل ہی باہر ہے۔ وہاں آنے جانے کے لئے تمہیں بس مل جایا کرے گی۔"

وہ دن بھی گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی۔ تیسرے روز صبح کے وقت لوئر ڈیک سے اٹھ کر اپر ڈیک پر گیا تو سمندر کا کالا سیاہ رنگ سبزی مائل ہو رہا تھا۔ غور سے دیکھا تو مجھے دریا کی گدلی لہریں نظر آئیں۔ کریم مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گیا۔ مسکرا رہا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کہنے لگا۔

"جہاز دریائے ایراوتی کے ڈیلٹے میں چلا جا رہا ہے۔"

زمین ابھی تک نظر نہیں آئی تھی۔ کوئی تین چار گھنٹے گزرنے کے بعد دور سے بائیں جانب ایک سیاہ دھبہ دکھائی دیا۔ ڈیک پر دوسرے مسافر بھی کھڑے تھے۔ ایک مسافر اسی سیاہ دھبے کی طرف اشارہ کر کے چلایا۔

"دھرتی ماتا-----"

دوسرے مسافر بھی دوڑ کر جنگلے کے پاس آ گئے۔ زمین نظر آ گئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھے اپنا گھر نظر آنے لگا ہے۔ سیاہ دھبہ آہستہ آہستہ ایک لمبی پٹی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اس لکیر نے ایک کنارے کی شکل اختیار کر لی۔ میں اور کریم جہا کے بالکل سامنے کے رخ پر لوہے کی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ سمندر کا پانی دریا کے گد- پانی میں تبدیل ہو گیا تھا۔ کریم کہنے لگا۔

"یہ دریائے ایراوتی ہے۔"

میں نے گردن جھکا کر ایراوتی کو دیکھا۔ ایروتی! تیرے پانیوں میں مفل ملاحوں کے آنسو سماتے رہے ہیں۔ مشرق کے ہر دریا میں غریب ملاحوں کے آ

گرتے ہیں۔ شاید اسی لئے دریاؤں کا پانی گدلا ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر گزری تو بائیں جانب کا کنارا بھی دور سے نظر آنے لگا۔ دریا کے کنارے جہاز کے قریب آ رہے تھے۔ مگر بہت آہستہ آہستہ ----

دور سے ایک جگہ زمین میں سے ابھرے ہوئے گول گول چکر دکھائی دیئے۔ کریم بولا۔

"یہ برما شیل والوں کے تیل کے کنویں ہیں۔"

سہ پہر کا سورج چمک رہا تھا۔ میں نے دور دور تین چار مینار دیکھے جو زمین سے باہر نکلے ہوئے تھے اور ان کے سنہری کلس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

"یہ کوئی مندر ہے؟"

وہ بولا۔

"یہ بدھ مذہب کو ماننے والوں کے مندر ہیں۔ ان کو پیگوڈا کہتے ہیں۔ ایسے پیگوڈا برما میں بہت دیکھنے کو ملیں گے۔ رنگون میں سب سے بڑا پیگوڈا ہے۔ اس کا نام سولی پیگوڈا ہے۔"

میں پیگوڈا کے چمکتے کلس دیکھ رہا تھا۔ کریم نے کہا۔

"رنگون میں ایک بہت بڑی جامع مسجد بھی ہے۔ اس کا نام سلطان ٹیپو جامع مسجد ہے۔ میں وہاں جمعے کی نماز پڑھنے جایا کرتا ہوں۔ یہ مسجد رنگون کی مغل سٹریٹ میں ہے۔"

میں نے دل میں سوچ لیا کہ یہ مسجد بھی ضرور دیکھوں گا۔ کریم نے بتایا کہ رنگون میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ برمی مسلمانوں کی بھی بھاری تعداد آباد ہے۔

"رنگون سے تو اردو کے دو اخبار بھی نکلتے ہیں۔"

یہ سن کر میرے دل میں امید کی کرن سی چمکی۔ مجھے ان اردو اخباروں کے دفتر میں کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جائے گا۔ میں اردو کا لٹریچر بہت پڑھا کرتا تھا اور میری اردو کی لکھائی بھی بڑی اچھی تھی۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ جہاز رنگون کی بندرگاہ میں داخل ہو گیا۔ ہمارا جہاز بندرگاہ میں کھڑا کئی غیر ملکی اور ملکی جہازوں کے قریب سے گزرا۔ ان جہازوں پر اپنے اپنے ملک کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سٹیمر سیٹیاں

بجاتے دریا میں ادھر سے ادھر جا رہے تھے۔ جہاز کی رفتار بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ آخر
جہاز رنگون کی جیٹی میں گودی کے ساتھ لگ گیا۔ (اب گودی کا لفظ میرے قلم سے
اپنے آپ نکل گیا ہے تو میں اسے کاٹوں گا نہیں) یہاں بھی پلیٹ فارم یعنی جیٹی پر
بے شمار لوگ اپنے اپنے رشتے داروں کو لینے آئے ہوئے تھے۔ کریم ڈیک پر کھڑے
کھڑے زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔

"ماموں ماموں ---"

نیچے ہجوم میں سے ایک میمن بھی زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ میں اور کریم
جہاز سے اتر کر جیٹی پر آ گئے۔ کریم کا ماموں اسے لینے آیا ہوا تھا۔ کریم نے اس سے
میرا تعارف کرایا۔ اس آدمی نے مجھ سے بھی ہاتھ ملایا۔ پھر کریم سے ایک غیر مانوس
زبان میں باتیں کرتا آگے بڑھا۔ باہر ان کی بگھی کھڑی تھی۔ زمین پر قدم رکھنے کے
بعد میرے پاؤں ٹھیک طرح سے نہیں پڑ رہے تھے۔ لگتا تھا زمین ڈول رہی ہے۔ جیٹی
سے باہر نکل کر ہم بگھی میں بیٹھ گئے اور بگھی کریم الدین کے گھر کی طرف روانہ ہو
گئی۔ شام ہو رہی تھی۔ رنگون کے بازار کشادہ تھا۔ بمبئی اور کلکتے کے بازاروں کی
طرح بلڈنگیں بھی بمبئی کلکتے کی بلڈنگوں ایسی تھیں۔ لوگ مختلف تھے۔ زرد رنگ کی
عورتیں سفید کرنڈی کی قمیضیں پہنے ہوئے تھیں۔ ریشم کی رنگ برنگی لنگیاں انہوں
نے کمر تک باندھ رکھی تھیں۔ مردوں نے بھی قمیض کے اوپر کمر تک لنگیاں باندھی
ہوئی تھیں۔ عورتوں کے رنگ زرد تھے۔ مردوں کے رنگ سانولے اور زرد دونوں
طرح کے تھے۔ میں نے ایک دو بوڑھے بھکشوؤں کو بھی دیکھا۔ زرد لبادے اوڑھے
ہاتھوں میں کرمنڈل تھامے فٹ پاتھ پر چلے جا رہے تھے۔ مجھے چندر مکھی یاد آ گئی۔
وہ جبل پور کے پاس کسی ویران سٹیشن پر رات کو اتر گئی تھی۔ خدا جا
کہاں ہوگی۔ کس حال میں ہوگی۔ میں اسے یاد کر کے اداس ہو گیا۔ ایک موٹر ہارا
دیتی ہمارے پیچھے سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ رنگون کے بازاروں میں بتیاں رو
ہونے لگی تھیں۔ بازاروں میں پان کے زروے اور سگار کے تمباکو کی خوشبو
محسوس ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ خوشبوئیں بڑی رومانٹک لگیں۔ میں ان خوشبوؤں
ساتھ اس شہر میں خوش ہو کر رہ سکتا تھا۔ بگھی شہر کی بڑی بڑی عمارتوں وا
بازاروں سے نکل کر ایک سرسبز پارک کے قریب سے گزر رہی تھی۔ اندھیرا پھیلنے
تھا۔ فضا خنک ہو رہی تھی۔ کریم نے میری طرف جھک کر کہا۔

"ہمارا بنگلہ آنے ہی والا ہے۔"

بگھی ایک سٹریٹ میں داخل ہو گئی۔

یہاں ایک جانب چھوٹی چھوٹی کاٹج نما کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ دوسری جانب
میدان تھا۔ یہ کوٹھیاں زمین سے تین چار فٹ اونچے مچانوں پر بنی تھیں۔ سب کی
چھتیں ڈھلواں تھیں۔ ہر کوٹھی کے آگے پیچھے کیلے اور ناریل کے درخت ہی درخت
تھے۔ کریم الدین کی کوٹھی کے چھوٹے سے باغیچے میں بھی کیلے اور ناریل کے درخت
تھے۔ دروازے پر بلب روشن تھا۔ کریم نے مجھے اپنی والدہ اور والد اور بہنوں سے
ملایا۔ سب لوگ شکل ہی سے بڑے شریف' بے زبان اور بے ضرر لگ رہے تھے۔
تقریباً" سب نے نظر والی عینکیں لگا رکھی تھیں۔

وہ رات میں نے کریم کے ہاں گزاری۔ دوسرے دن کریم مجھے بگھی میں
اپنے گودام پر لے گیا۔ کہنے لگا۔

"یہاں ایک چھوٹا سا کمرہ میں نے تمہارے لئے صاف کروا دیا ہے۔ آؤ
میرے ساتھ۔"

گودام کے باہر چوکیدار موجود تھا۔ اس نے گودام کھول دیا۔ اندر ایک بڑا
سا ہال کمرہ تھا۔ کمرے میں لکڑی کی پیٹیاں اور ہر قسم کا سامان بھرا ہوا تھا۔ ایک
جانب چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کمرہ تنگ تھا۔ اندر بانس کی چارپائی بچھی تھی۔ اس پر مچھر
دانی بھی لگی تھی۔ لوہے کی ایک کرسی بھی پڑی تھی۔ کریم کے کہنے پر چوکیدار کہیں
سے ایک پرانی گرد آلود تپائی اٹھا کر لے آیا۔ چارپائی پر بستر تہہ کیا ہوا تھا۔ دیوار کے
ساتھ تولیہ اور رات کو پہننے والا کرتہ پاجامہ لٹک رہا تھا۔ کریم نے واقعی بڑا انتظام کیا
ہوا تھا۔ گودام کے اندر کونے میں ایک چھوٹا سا غسل خانہ بھی تھا جس کا ایک دروازہ
باہر کو کھلتا تھا اس کی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔ کریم بولا۔

"یہاں تم شہر سے دور ضرور ہوگے مگر چوکیدار کو کہہ کر تمہیں ضرورت کی
ہر چیز مل جایا کرے گی۔ کھانا دونوں ٹائم ہمارا نوکر تمہیں دے جائے گا۔ چائے
چوکیدار تمہیں خود تیار کر کے دے گا۔ یہ بنگالی مسلمان ہے بڑی اچھی چائے بناتا
ہے۔ اب میرے ساتھ شہر چلو۔ میں تمہیں اپنی دکان بھی دکھا دیتا ہوں۔ تم جس وقت
چاہو مجھے دکان پر آ کر مل سکتے ہو۔ میں صبح سے شام تک پاپا کے ساتھ دکان پر ہی
ہوتا ہوں۔"

کریم مجھے بگھی میں ساتھ بٹھا کر واپس شہر لے آیا۔ رنگون کی مشہور شاک مارکیٹ میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ اس کے والد صاحب بیٹھے حساب لکھ رہے تھے۔ دکان کے اندر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ یہ کریم کا آفس تھا۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر چائے پی۔ میں نے کریم سے پوچھا۔

"کریم بھائی! مجھے یہ بتاؤ کہ یہاں سے جو اردو اخبار نکلتے ہیں ان کا دفتر کہاں ہے۔"

کریم الدین نے بتایا کہ یہ دفتر سپارکس سٹریٹ میں ہے۔ میں نے ایک رکشا لیا اور سپارکس سٹریٹ کی طرف چل پڑا۔ برما میں رکشا اس زمانے میں ہاتھوں سے چلائے جاتے تھے۔ رکشا چلانے والے عام طور پر جنوبی ہند کے محنت کش ہوتے تھے جنہیں قرنگی کہہ کر پکارا جاتا۔ یہ زرد آنکھوں والے کالے رنگ کے سوکھے آدمی ہوتے تھے جنہوں نے بالوں کو پیچھے گت کی طرح باندھا ہوتا تھا۔ یہاں رکشہ کو بتہ کہا جاتا تھا۔ سپارکس سٹریٹ میں داخل ہوتے ہی میں رکشا سے اتر گیا۔ یہ کافی چوڑی سڑک تھی۔ ایک جانب بلند و بالا عمارتیں تھیں۔ سامنے کی جانب گراؤنڈ تھی۔ میں فٹ پاتھ پر دکانوں کے بورڈ پڑھتا گزرنے لگا۔ ایک جگہ اردو میں روزنامہ "مجاہد برما" اور روزنامہ "شیر رنگون" کا بورڈ لگا تھا۔ دونوں اخباروں کا ایک ہی دفتر تھا اور ایک ہی انتظامیہ کے تحت شائع ہوتے تھے۔ میں نے دیکھا، ایک بڑے کمرے میں کچھ لوگ بیٹھے کام کر رہے تھے۔ شکلیں پنجاب کی لگتی تھیں۔ میں فٹ پاتھ پر دفتر کے سامنے ایک طرف ہو کر کھڑا تھا۔ میرے پاس کلکتے والے لالہ قمر کے دیئے ہوئے ابھی کافی پیسے موجود تھے۔ اس لئے دل نہ چاہا کہ اخبار کے دفتر میں جا کر کسی سے کہوں کہ مجھے نوکری چاہئے۔ نوکری ویسے بھی اچھی نہیں لگتی تھی اور جب پیسے جیب میں ہوں تو جب تک وہ پیسے ختم نہ ہو جائیں کسی جگہ کام کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں دور ہی سے دفتر کا جائزہ لے کر آگے نکل گیا۔

رنگون شہر میرے لئے ایک خواب کا شہر تھا۔ ہر بازار مجھے پراسرار لگتا تھا۔ زرد رنگ کی برمی لڑکیاں ریشمی لنگیاں پہنے بالوں میں پھول لگائے میرے قریب سے گزرتیں تو مجھے ان دیکھے بارشوں والے جنگلوں سے ان پھولوں کی خوشبوئیں آتیں جو ابھی کھلے نہیں تھے۔ سپارکس سٹریٹ ایک دوسرے بازار میں داخل ہو گئی۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ میں نے پان سگریٹ کی ایسی دکانیں دیکھیں جہاں

نوجوان برمی عورتیں بیٹھی پان لگا رہی تھیں۔ ایک عورت سے میں نے پان خریدا۔ منہ میں ڈال کر آگے بڑھا تو پان کڑوا لگا۔ اس میں لونگ کی تیز خوشبو تھی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا رنگون میں پان سگریٹ کی دکانوں پر پان کیلے کے پتے میں لپیٹ کر اس میں لونگ چھپا کر رکھے ہوتے ہیں اور انہیں لونگ نکال کر کیلے کا پتا الگ کر کے کھایا جاتا ہے۔ اکثر ادھیڑ عمر کی برمی عورتیں ہاتھوں میں سگار لئے گزرتے دیکھیں۔ برما میں بوڑھی عورتیں سفید رنگ کا سگار پیتی ہیں اور یہ سگار کافی بڑا ہوتا ہے۔ میں ایک اور بازار میں آگیا۔ یہاں ایک دکان کے بورڈ پر انگریزی میں فریزر سٹریٹ لکھا ہوا تھا۔ بازار میں بڑی رونق تھی۔ دکانیں چھتے ہوئے فٹ پاتھ کے اندر تھیں۔ ان دکانوں کے قریب سے گزرتے ہوئے کبھی لکڑی کے نئے فرنیچر، کبھی سگار اور کبھی کسی عجیب سے خوشگوار پرفیوم کی خوشبو آتی۔ ایک جگہ میکسم بار لکھا تھا۔ میں نے بار کے شیشوں میں سے دیکھا۔ اندر میز کرسیوں پر سفید نیلی وردیوں والے کچھ غیر ملکی ملاح بیٹھے بادہ نوشی کرتے نظر آئے۔ سامنے گرینڈ ہوٹل کی اونچی عمارت تھی جس کے دروازے پر ایک گورکھا چوکیدار کھڑا تھا۔

چھتا ہوا فٹ پاتھ ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ آگے جا کر ایک بڑا چوراہا آ گیا۔ یہاں آتے ہی سامنے ایک بہت بڑے اور اونچے پیگوڈا پر نظر پڑی۔ میرے جہاز کے دوست کریم نے کہا تھا کہ رنگون کے سب سے بڑے پیگوڈا کا نام سولی پیگوڈا ہے۔ میں نے ایک برمی سے انگریزی میں پوچھا کہ یہ کونسا پیگوڈا ہے۔ اس نے پیگوڈا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سولی پیگوڈا" اور آگے چل دیا۔ میرے قدم سولی پیگوڈا کی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے سوچا کہ میں مسلمان ہوں۔ کیا مجھے پیگوڈا دیکھنے کی اجازت مل جائے گی؟

سولی پیگوڈا کا بیضوی گنبد اور کلس دن کی روشنی اور ہلکی ہلکی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس پر سونے کا پترا چڑھا ہوا ہے۔ اس کے اندر بھی جو مہاتما بدھ کا بہت بڑا مجسمہ تھا کہتے ہیں وہ بھی خالص سونے کا تھا۔ میں سڑک کراس کر کے پیگوڈا کے سامنے آگیا۔ یہ پیگوڈا زمین سے کافی بلند ایک بہت بڑے ٹیلے کی شکل کے چبوترے پر بنا تھا۔ کافی چوڑی سیڑھیاں اوپر کو جاتی تھیں۔ ہر بیس سیڑھیوں کے بعد چھوٹا سا صحن آ جاتا تھا جس کی دونوں جانب پھول بیچنے والی برمی عورتیں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے لکڑی اور ٹین کی بالٹیوں اور مٹی کے برتنوں میں

کنول، ترناری، رجنی گندھا اور رتن جوت کے پھولوں کے بڑے بڑے گچھے سجا رکھے تھے۔ بانس کی ٹوکریوں میں گیندے کے پھولوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ برمی عورتیں اور مرد یہاں سے پھول لے کر اوپر مہاتما بدھ کے مجسمہ کے قدموں میں جا کر رکھتیں اور اگربتیاں سلگاتیں۔ سیڑھیوں کے تین دالان تھے۔

میں دوسرے دالان پر آیا تو میں نے پھول بیچنے والی ایک برمی لڑکی کو دیکھا۔ وہ اپنے نازک ہاتھوں سے بالٹی کے پانی میں سے کنول کے کھلے ہوئے اور ادھ کھلے پھول نکال کر ان کا گلدستہ بنا رہی تھی۔ اس کے زرد چہرے پر شگفتگی بھی تھی اور اداسی بھی تھی۔ اس نے سفید کرنڈی کی قمیض اور کاسنی رنگ کی لنگی پہن رکھی تھی۔ بالوں میں چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں کا گجرا سجا تھا۔ اس کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری زندگی کی پہلی محبت شبانہ اور چندر مکھی سے ہوتی ہوئی پھول بیچنے والی لڑکی کے روپ میں آکر مندر کی سیڑھیوں میں آ گئی ہے۔ سیڑھیوں کی دونوں جانب ایک خوشنما دیوار بھی ساتھ ساتھ اوپر جاتی تھی۔ میں سامنے والی دیوار کے پاس کھڑا ہو کر اس پھول بیچنے والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

اس لڑکی کو زیادہ دیر دیکھنے سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ میں نے نظریں اوپر کی طرف کر لیں۔ میری طرف سے لوگ اوپر مہاتما بدھ کے مجسمے کے درشن کرنے کے بعد نیچے آتے تھے اور پھول بیچنے والی لڑکی کی طرف سے اوپر کو جاتے تھے۔

میرا اب اوپر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ایسے محسوس ہوا جیسے لوگ جس چیز کی تلاش میں اوپر بدھ معبد میں جاتے تھے وہ مجھے معبد کی سیڑھیوں پر ہی مل گئی ہے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھول بیچنے والی لڑکی کو کنکھیوں سے دیکھ لیتا۔ اس کے چہرے پر نظریں پڑتے ہی میرا چہرہ گرم ہو جاتا اور آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگتیں۔ میں سورج کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو روشنی مہاتما بدھ نے کپل وستو کے شہزادے کے روپ میں نالندہ کے جنگلوں میں درخت کے نیچے بیٹھ کر دیکھی تھی۔ وہی روشنی مجھے اس کے معبد کی سیڑھیوں پر نظر آ رہی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شہزادہ گوتم روشنی کو دیکھ کر خود بھی روشنی بن گیا تھا مگر جو روشنی مجھے نظر آ رہی تھی وہ میرے جسم کے تاریک بادلوں میں تھوڑی دیر چمک کر غائب ہو جاتی تھی۔

ایک برمی عورت اس پھول بیچنے والی لڑکی کے پاس کھڑی اس سے پھول لے

رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ پھول لے کر چلی گئی تو میں پھول بیچنے والی لڑکی کے پاس آ گیا۔ میں بالٹیوں اور پانی سے بھرے ہوئے مٹی کے پیالوں میں رکھے ہوئے پھولوں کو دیکھنے لگا۔ لڑکی نے میرے چہرے سے دیکھ لیا تھا کہ میں برما کا باشندہ نہیں ہوں۔ رنگون میں دو زبانیں عام بول چال کی زبانیں تھیں۔ ایک انگریزی اور دوسری بہت شکستہ اردو جسے وہ لوگ ہندوستانی کہتے تھے۔ لڑکی نے پوچھا۔

"فلاور؟ کون سا پھول؟"

اس کی آواز اس کے زرد چہرے کی طرح پرسکون تھی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے کونسا پھول چاہئے تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"رجنی گندھا"

پھول بیچنے والی لڑکی نے بالٹی میں سے رجنی گندھا کے پھولوں کا چھوٹا سا گلدستہ نکالا اور اس کے گرد کیلے کا پتا لپیٹ کر مجھے دے دیا۔

"فائیو سینٹ پلیز"۔

رنگون میں ہندوستان والی انگریزوں کی کرنسی ہی چلتی تھی مگر یہاں یعنی چینج آنے دونی چونی کی بجائے سینٹوں میں ہوتا تھا۔ ایک روپے کے سو سینٹ ملتے تھے۔ میں نے اسے پانچ سینٹ دیئے اور گلدستہ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ پھول بیچنے والی لڑکی کے اردگرد ہر قسم کے پھولوں کی دھیمی دھیمی خوشبوئیں تھیں ان میں ایک خوشبو سب سے الگ مجھے محسوس ہوئی تھی شاید یہ خوشبو اس پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو تھی۔ یہ خوشبو میرے ساتھ ساتھ آ رہی تھی۔ میں سولی پیگوڈا کے سب سے بڑے صحن میں آ گیا۔ یہاں جگہ جگہ مہاتما بدھ کے مجسمے نصب تھے۔ بودھی لوگ ان کے آگے پھول رکھ کر ماتھا ٹیک رہے تھے۔ جس کے آگے مجھے پھول رکھنے تھے وہ نیچے رہ گئی تھی۔ میں پھول لئے ایک طرف چلنے لگا۔ یہ بہت بڑا پیگوڈا تھا۔ ایک بہت بڑے ہال کمرے کے اندر اونچے استھان پر گوتم بدھ کا مجسمہ مجھے باہر سے نظر آ رہا تھا۔ مہاتما بدھ کو مراقبے کی حالت میں بیٹھے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ مجھے اس رات کا خیال آ گیا جب کپل وستو کا شہزادہ سدھارتھ لوگوں کے دکھوں کا علاج تلاش کرنے کی خاطر اپنے محل کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ رہا تھا۔ اپنے محل کے آرام و آسائش، اپنی بیوی بچے اور تخت و تاج کو چھوڑ رہا تھا۔ اس کا ملازم چنا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا

تھا۔ جب شہزادہ وہاں پہنچا جہاں جنگل شروع ہو جاتا تھا تو شہزادہ گھوڑے سے اترا۔ اس نے اپنا گھوڑا ملازم کے حوالے کیا اور کہا۔

"میرے راجہ باپ کو جا کر کہنا کہ اس کا بیٹا پہلے سے زیادہ شہزادہ بن کر واپس آئے گا۔"

اور پھر یہ شہزادہ صوبہ بہار کے خطرناک تاریک جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس کا دل دکھی لوگوں کی محبت سے لبریز تھا۔ یہ وہ محبت ہے جو تتلی کے پروں کے حیرت انگیز رنگوں کے پھول بناتی ہے۔ مور کے پروں کی گل کاریاں کرتی ہے۔ گیہوں کا خوشہ اسی محبت کی طاقت سے زمین کا سینہ چیر کر باہر نکلتا ہے۔ پرندوں کو یہی محبت اڑنا سکھاتی ہے۔ یہ محبت شہد کے چھتے کو شہد سے بدلتی ہے اور سانپ کے منہ میں زہر رکھتی ہے۔ یہی وہ محبت ہے جو شیر کو کہتی ہے کہ حملہ کرو اور ہرنی کو کہتی ہے کہ جان بچا کر بھاگو --- اس محبت کے رازوں کو سمجھنا آسان نہیں۔ شہزادہ سدھارتھ اسی محبت کی خوشیوں، اسی محبت کی اذیتوں اور دکھوں کا راز معلوم کرنے جنگل میں نکل گیا تھا۔ کہتے ہیں شہزادہ سدھارتھ نے اس محبت کا راز پا لیا تھا۔ ضرور پا لیا ہو گا۔ شہزادے نے اس قیمتی موتی کو حاصل کرنے کے لئے بہت بڑی قیمت ادا کی تھی۔ رجنی گندھا کے پھول میرے ہاتھ میں تھے۔

مجھے پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو آ رہی تھی۔ رجنی گندھا کے پھولوں کی خوشبو اپنی پنکھڑیوں سے جدا ہو کر مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی مگر پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو نے مجھے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ میں پیگوڈا کے کشادہ صحن میں ناریل کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے درختوں کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے رجنی گندھا کے پھول ان درختوں کے نیچے رکھ دیئے۔ درخت میرے گوتم بدھ ہیں۔ یہ نروان حاصل کر چکے ہیں اور مجھے نروان حاصل کرنے کا راستہ بتاتے ہیں۔ میں واپس ہو کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ جب سیڑھیوں کے اس والان میں پہنچا جہاں پھول بیچنے والی بری لڑکی پھولوں سے بھرے ہوئے برتنوں کے پاس بیٹھی تھی تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرے قدم رکنے لگے۔ میرے دل نے کہا۔ رک جاؤ یہی تمہاری منزل ہے۔ پھول بیچنے والی کے پاس جاؤ۔ اگر پھول بن کر اس کے پاس نہیں جا سکتے تو پھولوں کی تلاش میں نکلی ہوئی ہوا بن کر اس کے پاس جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جن شہزادیوں کے شاہی محلوں سے وہ پھول توڑ کر لاتی ہے ان کے باغ کہاں ہیں؟ اس دریا کا کیا نام

ہے جس کا پانی ان باغوں کے قریب سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس سے پوچھو وہ کونسی رات ہوتی ہے جب چاندنی ان پھولوں پر شبنم کے موتی لٹاتی اترتی ہے۔ انہیں خوشبو اور رنگ عطا کرتی ہے۔

میرا دل مجھے بہت کچھ کہتا رہا۔ بہت کچھ سمجھاتا رہا لیکن میں ایک قدم بھی پھول بیچنے والی لڑکی کی طرف نہ بڑھا اور سر جھکائے خاموشی سے سیڑھیاں اتر گیا۔ دوسرے روز میں پھر اسی وقت پھول بیچنے والی لڑکی کو دیکھنے سولی پیگوڈا گیا۔ آج اس نے اپنے سیاہ بالوں کے جوڑے میں سفید پھول سجا رکھے تھے۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس سے تین چار کنول کے پھول خریدے اور اوپر جا کر ناریل کے درختوں کے نیچے بیٹھ گیا۔ پھول بیچنے والی لڑکی کی خوشبو میرے پاس تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ پھر کنول کے پھول ناریل کے درخت کے پاس رکھے اور اٹھ کر چل پڑا۔ سیڑھیاں اتر کر اس لڑکی کے قریب سے گزرا تو اس نے آنکھیں اٹھا کر ایک نظر مجھے دیکھا اور پھولوں کے گلدستے بنانے میں لگ گئی۔ اس کی نظر روشنی کی شعاع بن کر جیسے میرے دل میں اتر گئی اور اس نے میرے سارے جسم کو روشن کر دیا۔ میں اس روشنی کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتا فریزر سٹریٹ کے ایک بنگالی ریستوران میں سگریٹ سلگا کر پھول بیچنے والی لڑکی کے اداس چہرے کو دیکھنے لگا جو میری آنکھوں کے عین سامنے تھا۔ میں دیر تک ریستوران میں بیٹھا پھول بیچنے والی لڑکی کے تصور میں محو رہا۔

میرے پاس ابھی کافی پیسے تھے۔ ریستوران سے نکل کر رنگون کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے لگا۔ دوپہر ہو چکی تھی۔ میں نے ایک ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور سگریٹ لگا کر دوبارہ آوارہ گردی شروع کر دی۔ میں رنگون کی سڑکوں اور بازاروں سے ناواقف تھا۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ جس سڑک پر چل رہا ہوں یہ آگے کس طرف چلی جائے گی۔ اپنے دوست کریم الدین کے بازار کا نام مجھے معلوم تھا۔ جب تھک گیا تو ایک رکشا لے کر کریم الدین کی دکان پر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اپنے باپ کے ساتھ بیٹھا کام کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ جب وہ ذرا فارغ ہوا تو میں نے اسے کہا۔

"میں کشتی میں دریائے ایراوتی کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔"

کریم بولا۔

"ٹھیک ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں چلتے ہیں۔"

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم دکان سے نکلے اور ایک رکشے میں بیٹھ کر دریا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دریا وہاں سے کافی دور تھا۔ پہلے ناریل کے درختوں کا ایک گھنا ذخیرہ آیا۔ پھر جھیلیں بالکل ساتھ ساتھ تھیں۔ ان کے کناروں پر کاسنی، گلابی اور سفید کنول کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ واقعی کنول کا پھول پھولوں کا بادشاہ ہے۔ پورے کھلے ہوئے سفید کنول کے پھول کو دیکھ کر قدرت کے جاہ و جلال کا احساس ہوتا ہے۔

جھیلوں کی دوسری طرف دریائے ایراوتی بہہ رہا تھا۔ یہاں ایک جگہ چھوٹا سا گھاٹ بنا ہوا تھا۔ گھاٹ پر سے ہم کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کرنے لگے۔ کشتی چھوٹی تھی۔ اسے برمی لوگ سمپان کہتے ہیں۔ برمی ملاح کشتی چلا رہا تھا اور کشتی کے پچھلے سرے پر بیٹھا تھا دریا کے دوسرے کنارے کے درخت نظر آ رہے تھے۔ میں نے دریا کے پانی کو دیکھا۔ پانی گدلا تھا۔ میں نے پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ مجھے دریائے ایراوتی کے ملاحوں کا اداس گیت یاد آ گیا۔ سورج دوسرے کنارے کے درختوں کے پیچھے اتر رہا تھا۔ دریا پر دھوپ کا رنگ سبز ہو کر دریا کو سنہری کر رہا تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ جس میں پانی میں ڈوبے ہوئے سرکنڈوں کی خوشبو تھی۔ مجھے پھول بیچنے والی لڑکی یاد آ رہی تھی۔ کریم الدین کہنے لگا۔

"یہاں دریا زیادہ گہرا نہیں ہے۔ مگر رنگون کی جیٹی کے پاس اسے بہت گہرا کر دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا سمندری جہاز جیٹی کے ساتھ آ کر لگا تھا۔ دریا کم گہرا ہو تو جہاز جیٹی سے دور کھڑا ہوتا ہے اور مسافر سٹیمروں میں بیٹھ کر جہاز تک جاتے ہیں...."

میں پھول بیچنے والی لڑکی کے خیال میں محو تھا۔ کریم الدین نے مجھے کچھ غائب حاضر دماغ دیکھا تو بولا۔

"کیا بات ہے۔ کیا اپنا گھر یاد آ رہا ہے؟ تم مجھے کچھ کھوئے کھوئے سے نظر آتے ہو۔"

میں نے کہا۔

"نہیں۔ گھر یاد نہیں آ رہا ویسے ہی خاموش تھا۔"

اور میں نے کریم سے باتیں شروع کر دیں۔ ہماری کشتی دریا کے بہاؤ کے ساتھ جا رہی تھی۔ اوپر کی جانب سے ایک بھاری بھرکم سٹیمر آتا نظر آیا۔ جب وہ

ہمارے قریب سے گزرا تو سٹیمر میں سے ریکارڈنگ کی آواز آنے لگی۔ سپیکر پر فلم رتن کا گانا بج رہا تھا۔

ساون کے بادلو
ان سے یہ جا کہو
تقدیر میں یہی تھا
ساجن میرے نہ رو

اس زمانے میں فلم رتن رنگون میں بہت چل رہی تھی اور ہوٹلوں ریستورانوں میں بھی اس فلم کے گانوں کی ریکارڈنگ ہوتی تھی۔ کریم کہنے لگا۔

"یہ سٹیمر سیاحوں کو دریا کی سیر کراتا ہے۔ اس میں ایک ریستوران بھی ہے۔ یہ ریکارڈنگ اس ریستوران میں ہو رہی ہے۔"

پھر اس نے پوچھا۔

"تم نے فلم رتن دیکھی ہے؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔ لاہور میں دیکھی تھی۔"

کریم بولا۔

"یہاں اوڈین سینما میں لگی ہے۔ کسی دن چل کر دیکھیں گے۔"

پھر اس نے مجھ سے اخبار کی نوکری کے بارے میں پوچھا۔

"کیا اخبار کے دفتر میں گئے تھے؟ کوئی کام ملا یا نہیں؟"

میں نے یونہی کہہ دیا۔

"ان لوگوں سے ملا تھا۔ انہوں نے کہا ہے دس پندرہ دنوں کے بعد آنا۔"

کریم نے کہا۔

"آج کل یورپ میں جنگ لگی ہوئی ہے۔ یہاں رنگون میں بڑی نوکریاں ہیں۔ کئی نئے کارخانے کھل گئے ہیں۔ انگریز یہاں سے ترپالیں، بیلچے اور دوسرا سامان تیار کروا کر ولایت لے جا رہے ہیں۔ کسی کارخانے میں تمہیں ضرور کام مل جائے گا۔"

کریم جنگی سازو سامان بنانے والے کارخانوں کی باتیں کر رہا تھا اور میرے ذہن میں دریائے ایراوتی کے ملاحوں کے دردناک گیت گونج رہے تھے۔ میں غروب ہوتے سورج کی سنہری روشنی میں چمکتی دریائے ایراوتی کی لہروں میں پھول بیچنے والی لڑکی کا اداس زرد چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر کریم کہنے لگا۔

"ہمارا مال بھی بہت ولایت جا رہا ہے۔ کہتے ہیں جنگ رنگون تک آ جائے گی۔ مگر کیسے آ جائے گی؟ جنگ تو جرمنوں اور انگریزوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ یہاں جرمن اتنی دور کیا کرنے آئیں گے بھلا....."

اسے خدشہ تھا کہ اگر جنگ رنگون تک پہنچ گئی تو ان کا سارا کاروبار ختم ہو جائے گا۔ کہنے لگا۔

"خدا نہ کرے یہاں بھی جنگ شروع ہو۔ پھر تو بڑی تباہی آئے گی۔ جنگ بڑی خراب چیز ہے۔ جہاز شہروں پر بمباری کرتے ہیں۔ فوجیں داخل ہو جاتی ہیں اور ہر طرف تباہی مچ جاتی ہے۔"

میں کریم کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے باہر نکالتا جا رہا تھا۔ میں پھول بیچنے والی اداس لڑکی کے خیال میں تھا۔ مجھے اس کی جنگی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس خوبصورت رومانوی شہر پر دوسری جنگ عظیم کی وہ قیامت ٹوٹنے والی ہے کہ سڑکوں پر انسانی لاشیں بکھری ہوں گی۔ عمارتوں سے شعلے اٹھ رہے ہوں گے۔ بھائی بہنوں سے اور بچے ماؤں سے بچھڑ جائیں گے۔ نہ پھول رہیں گے اور نہ پھول بیچنے والیاں رہیں گی۔ ابھی دریائے ایراوتی کے پانیوں پر ہماری سمپان بڑے سکون سے بہہ رہی تھی۔ ابھی غروب آفتاب کے بعد دریا پر چلنے والی ہواؤں میں پھٹتے بموں کے بارود کی بو شامل نہیں ہوئی تھی۔ ابھی ہوا شبنم کے موتیوں کی طرح نم دار اور شفاف تھی۔ کریم الدین کہہ رہا تھا۔

"اگر یہاں جنگ کا کوئی خطرہ ہوتا تو رات کو بلیک آؤٹ ضرور ہوتا۔ مگر شہر رات کو جگمگا رہا ہوتا ہے۔ بابا جان کل کسی سے کہہ رہے تھے کہ ادھر بھی جنگ کا خطرہ لگتا ہے۔ مگر جرمنوں کو اتنی دور آ کر انگریزوں سے لڑنے کی کیا ضرورت ہے۔"

میں سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں میں بیٹھ کر پھول بیچنے والی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔

وہ گیندے اور ترناری کے پھولوں کو کیلے کے پتوں میں لپیٹ رہی تھی۔ اس کی نازک انگلیوں سے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس کے اداس خاموش چہرے پر کنول کے پھولوں کی بے زبان شگفتگی تھی۔

"تم نے یہ رقص کہاں سے سیکھا ہے
اے ایراوتی کی لہرو!
ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے؟
ایراوتی میں ہمارے آنسو گرتے ہیں بھائیو!"

ہماری کشتی دریا کی لہروں پر بہتی ہوئی جب کافی دور نکل گئی تو کریم نے اپنے گفتگو سے چونک کر کہا۔

"ارے ہم تو منکی پوائنٹ تک آ گئے ہیں۔"

اس نے ملاح سے کہا کہ کشتی واپس لے چلو۔ ملاح نے کشتی کا رخ موڑ دیا۔ کریم کہنے لگا۔

"مجھے خیال ہی نہیں رہا منکی پوائنٹ سے دریا کا چوڑا پاٹ شروع ہو جاتا ہے۔"

وہ انگریزی میں ملاح کے بارے میں کہنے لگا کہ یہ لوگ اکثر تاڑی پی کر کشتی چلاتے ہیں۔ اس نے بھی نہیں سوچا کہ آگے دریا کی لہریں خطرناک ہو جاتی ہیں۔ اس وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور ہوا بھی تیز ہو گئی تھی۔ ملاح کو کشتی چلاتے ہوئے کافی زور لگانا پڑ رہا تھا۔ گھاٹ تک پہنچتے پہنچتے ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ شام کی سیاہی بھی پھیل گئی تھی اور گھاٹ کی بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ ہم جلدی سے کشتی سے اتر کر ایک سائبان کے نیچے آ گئے۔ یہاں بانس کے بڑے بڑے گٹھے پڑے تھے۔ بارش آہستہ آہستہ تیز ہو رہی تھی۔ کریم بولا۔

"غلطی کی جو میں نے اپنی بند بگھی نہیں نکلوائی۔ یہاں سے شاید ہی کوئی بند بگھی ملے۔"

گھاٹ پر کوئی رکشا بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک بند بگھی آ کر رکی۔ دو آدمی اس میں سے سامان نکال کر سائبان کے نیچے رکھنے لگے۔ کریم الدین برما زبان جانتا تھا۔ اس نے بگھی کے کوچوان کو شہر چلنے کے لئے کہا تو اس نے بند بگھی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔ ہم جلدی سے اندر بیٹھ گئے۔ یہ بند بگھی اس

قسم کی تھی جیسی لندن میں آج سے سو سال پہلے چلا کرتی تھیں۔ انہیں میں نے پرانی انگریزی فلموں میں دیکھ رکھا تھا۔ چاروں طرف سے یہ بگھی ڈبے کی طرح بند ہوتی تھی۔ اس میں چڑھنے اترنے کی جگہ ہوتی تھی اور روشندان بھی ہوتے تھے۔ کوچوان بگھی کے باہر اونچی سیٹ پر ترپال اوڑھ کر بیٹھتا تھا۔ آگے ایک گھوڑا جتا ہوتا تھا۔ بگھی میں بیٹھنے کے بعد بارش کا شور زیادہ سنائی دینے لگا۔ بارش کی موٹی موٹی بوندیں بگھی کی چھت پر گر کر شور مچا رہی تھیں۔ مجھے یہ شور بڑا اچھا لگا۔ اس لئے کہ بارش کے شور نے باقی تمام واہیات شور و غل کو ختم کر دیا تھا۔

مجھے بارش کے شور میں ہمیشہ ایک میوزک سنائی دیتا تھا اور آج بھی سنائی دیتا ہے۔ بارش جنگل کے درختوں پر گرتی ہے تو پتوں سے موسیقی کی زبان میں بات کرتی ہے۔ اس وقت میرا جی انگلش کافی کے ساتھ ٹرکش سگریٹ پینے کو چاہتا ہے۔ بارش موسلادھار ہو رہی ہو تو میں پائپ سلگا لیتا ہوں۔ ہلکی بارش میں سری لنکا کی چائے سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ صحن چمن میں موتیا اور گلاب کے پھولوں پر بارش کے قطرے گر رہے ہوں تو میں سگریٹ' چائے کافی اور پائپ کے ایوانوں سے باہر آ جاتا ہوں۔ اس وقت میرے لئے بارش میں اڑتی موتئے اور گلاب کی خوشبو ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ سردیوں کی راتوں کی بارش مجھے املی بردنئے کے خاموش کاٹج میں آتشدان کے پاس لے جاتی ہے۔ ساون کی بارشوں نے مجھے جنوبی ہند کے جنگلوں سے ملایا تھا۔ موسم برسات کی بارشوں میں مجھے قدیم بارہ دریوں اور ویران مغلیہ محلات کی دیواروں پر چڑھی ہوئی جنگلی گلاب کی بیلوں کی یاد آتی ہے۔ آہ! سبزی مائل سفید جنگلی گلاب کے پھولوں پر گرتی بارش!

اس وقت ضرور گلاب کے پھولوں پر الہام کی کیفیت طاری ہو جاتی ہوگی۔ اگر مجھے پھولوں کی زبان آتی۔ اگر میں پھولوں کی خاموش زبان سمجھ سکتا تو اس وقت پھول مجھے ضرور بتاتے کہ وہ کہاں سے چلے تھے۔ انہوں نے کس حالت میں کس شکل میں اپنا سفر شروع کیا تھا اور کیسے مٹی سے پھول بن گئے۔ پھر وہ مجھے ضرور بتاتے کہ تم بھی مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ تم بھی اگر چاہو تو پھول بن سکتے ہو۔ پھر وہ مجھے اپنی خوشبو کی آواز میں بتاتے کہ دنیا کا پہلا پھول کب کھلا تھا اور وہ کونسی رات تھی جب جنت سے پہلے پھول کی خوشبو نکل کر زمین پر اتری تھی۔ مگر میں پھولوں کی زبان سے ناواقف تھا۔ میں بارش کی زبان سے بھی ناواقف تھا۔ میں بارش کی صرف آواز سن

رہا تھا۔ اپنی آواز میں جو کچھ بول رہی تھی جو کچھ کہہ رہی تھی وہ میں نہیں سمجھ رہا تھا۔

ہماری بند بگھی چھت پر بارش کے شور میں رنگون کے بازاروں میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نے روشندان والی کھڑکی سے دیکھا۔ رنگون بارش میں بھیگ رہا تھا۔ دکانوں کی روشنیوں میں بارش کے قطرے رنگ برنگے موتیوں کی طرح گرتے نظر آ رہے تھے۔ بارش رنگون کے رومانٹک بازاروں میں موتی لٹا رہی تھی۔ فضا میں رنگون کی خاص خوشبو۔ پان کے زردے اور سگار اور کوکو کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

رنگون کی فریئر سٹریٹ میں جہاں 39 نمبر والی گلی مڑتی ہے اس کے کونے پر ماتری بھنڈار نام کا ریستوران ہوا کرتا تھا۔ وہاں میں نے زندگی میں پہلی بار گرم کوکو پی تھی۔ اس کا ذائقہ کافی سے زیادہ تلخ اور کڑوا کڑوا تھا۔ مجھے ایسے لگا تھا جیسے میں بانس اور مہاگنی کے سیاہ درختوں کا جوس پی رہا ہوں۔ جب میں کوکو پی کر ریستوران سے باہر نکلا تھا تو مجھے اپنے اوپر کبھی بانس کے درخت کا اور کبھی مہاگنی کے درخت کا گمان ہوا تھا۔ آہ! گمنام تاریک جنگلوں میں بانس درختوں پر گرتی بارش۔ ان درختوں کی شاخوں سے دوسری شاخوں پر گرتی بارش ---- اور زمین سے' جنگل سے' دریاؤں سمندروں اور ہزاروں سال پرانے کھنڈروں اور چٹانوں سے باتیں کرتی بارش۔ ان کو زندگی کے بھید بتاتی' کائنات کے راز بتاتی بارش! یہ راز بارش آسمانوں سے لے کر زمین پر اترتی ہے۔ درخت' جنگل' دریا' سمندر' کھنڈر اور ہیبتناک چٹانیں بارش کی زبان سمجھتے ہیں۔ وہ یہ راز سنتے ہیں' سمجھتے ہیں اور ان کی خاموشی پہلے سے زیادہ گہری ہو جاتی ہے۔ اور اس گہری خاموشی' گہرے سکوت میں وہ کائنات کی ہر شے کو ایک دوسری سے جڑے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ زمان و مکاں سے باہر اربوں کھربوں سال سے پرے' جہاں نہ کوئی وقت ہے نہ کوئی غیر ہے' ابدی مسرتوں کے باغ دیکھتے ہیں۔ یہ اس ازلی اور ابدی نور کے باغ ہیں کہ روشنی جس نور کا سایہ ہے۔ میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ بارش میں بھیگ رہا ہوتا ہوں لیکن بارش سے محروم ہوتا ہوں۔

بند گاڑی کریم الدین کی دکان کے باہر آ کر رک گئی۔ ہم بارش میں بھیگتے ہوئے دکان میں داخل ہو گئے۔ کریم نے کہا۔

"یہ بارش تھمنے والی نہیں۔ تم آج رات دکان کے اوپر والے کمرے میں ہی سو جانا۔"

میں رنگون کی بارش میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ سوتے وقت آدمی مر جاتا ہے۔ میں بارش میں ساری رات رنگون کی بھیگتی سڑکوں پر پھرنا چاہتا تھا۔ میں اس بارش میں کسی ریستوران میں کافی کی پیالی سامنے رکھ کر ریستوران کے شیشوں میں سے سڑک پر گرتی بارش کو دیکھا چاہتا تھا۔ شہر کی پکی سڑکوں پر گرنے سے بارش زخمی ہو جاتی ہے۔ بارش جنگلوں' دریاؤں سمندروں وادیوں اور درختوں اور پھولوں پر گرنے کے لئے بادلوں سے اترتی ہے۔ میں درخت بن کر' گھنے درختوں والا جنگل بن کر بارش کے ہر قطرے کو اپنی نرم شاخوں' نرم پتوں پر گرانا چاہتا تھا۔ میں سولی پیگوڈا کے معبد میں جا کر اس کی سیڑھیوں پر پھول بیچنے والی اداس بری لڑکی کو بارش میں بھیگتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے سارے پھولوں کو بارش میں بھیگتے دیکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اس وقت وہاں نہیں تھی تو میں اس جگہ کو بارش میں بھیگتے دیکھنا چاہتا تھا۔ جہاں اس لڑکی نے پھولوں کے برتن رکھے ہوتے تھے۔ جہاں سے پھول چلے جاتے ہیں۔ وہاں کچھ دیر تک ان کی خوشبو ضرور باقی رہتی ہے۔ جس طرح سورج غروب ہونے کے بعد آسمان پر کچھ دیر کے لئے اپنی روشنی ضرور چھوڑ جاتا ہے۔

مگر رات کو بارش ہوتی رہی اور میں کریم الدین کی دکان کے اوپر والے ڈربہ نما کمرے میں بانس کی چارپائی پر لیٹا بارش سے ملنے کے بارے میں سوچتا ہی رہا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی۔ رات بھر رنگون کے درخت بارش میں شرابور ہوتے رہے۔ بارش میرے ڈربے کی کھڑکی پر آ کر رات بھر دستکیں دیتی رہی مگر میں سو چکا تھا۔ مر چکا تھا۔

دوسرے روز صبح دیر سے اٹھا۔ دکان کھل گئی تھی۔ کریم دکان پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگا۔

”میں تمہارے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے بھی ابھی ناشتہ نہیں کیا۔ چا ریستوران میں چل کر ناشتہ کرتے ہیں۔“

بازار رات بھر کی بارش کے بعد بھیگے ہوئے تھے۔ مگر پانی کہیں نہیں کھ تھا۔ رنگون کی سڑکیں اس طرح سے بنائی گئی تھیں کہ چاہے جتنی بارش ہو پانی کھ نہیں ہوتا تھا۔ ہم ایک ریستوران میں بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔ بازار میں فٹ پا کے ساتھ ساتھ جو درخت کھڑے تھے بارش میں بھیگنے کے بعد زیادہ سرسبز ہو ر تھے۔ اس وقت دن کے نو بج رہے تھے۔ میں نے کریم سے کہا۔

”میں اخبار کے دفتر میں نوکری کا پتہ کرنے جاتا ہوں۔“

وہ بولا۔

”تمہیں ایڈریس معلوم ہے ناں؟ وہاں اکیلے پہنچ جاؤ گے؟“

میں نے کہا۔

”رکشا لے لوں گا۔“

آسمان بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ مدراسی' بنگالی' بری عورتیں بالوں میں پھول لگائے گزر رہی تھیں۔ ایک ریستوران کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے کافی کی گرم خوشبو آئی۔ میں نے چوک میں آ کر رکشا لیا اور اسے وہاں کی ہندوستانی میں کہا کہ سولی پیگوڈا چلو۔ سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر میری بارش' میری بارش کا پھول' میرے پھول کی خوشبو بیٹھی ہوگی۔ میں رات بھر کی بارش کے بعد اس کے کنول ایسے اداس چہرے کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

”ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے؟ تو نے یہ رقص کہاں سے سیکھا تھا؟ ایراوتی تو اتنی اداس کیوں ہے؟“

سولی پیگوڈا کے ناریل اور دیودار کے گھنے درخت بارش میں بھیگ کر زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔ پیگوڈا کی سیڑھیوں کی دونوں جانب ترناری کی سبز بیلوں پر کاسنی پھول ہوا میں مسکرا رہے تھے۔ ناریل کے درختوں کے نیچے کچے ناریل گرے ہوئے تھے۔ میں پیگوڈا کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ ہر سیڑھی پر میرے دل کی دھڑکن میں تھوڑا سا اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ وفور محبت کی دھڑکن تھی۔ اس سے ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا۔ اس سے دل گرم ہو کر روشن ہو جاتا ہے۔ جس طرح بجلی کے بلب میں زیادہ حدت پہنچے تو وہ روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے آس پاس دوسری پھول بیچنے والی لڑکیاں اور عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ مگر ان ستاروں میں وہ چاند سب سے نمایاں تھا۔ میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ ہماری بات چیت بہت شکستہ اردو میں ہوئی تھی۔ مگر میں یہاں اس کے مکالموں کو آسان اردو میں ہی لکھوں گا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی۔ میں نے گیندے کا ایک ہار اٹھا کر اس سے دام پوچھے۔ اس نے کہا۔

”دس سینٹ“۔

میں نے کہا۔

”کنول کے پھول کے تو پانچ سینٹ تم نے لئے تھے۔ اس کے دس سینٹ

کیوں؟"

وہ مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"یہ پھول ہمیں بڑی دور سے جا کر لانے پڑتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔

"تم یہ پھول کہاں سے لاتی ہو؟"

اس نے کہا۔

"اپنے گاؤں سے۔"

"تمہارا گاؤں کہاں ہے؟"

"کمائیٹ کے پاس۔"

"کمائیٹ کہاں ہے؟"

وہ ہنسنے لگی۔

"تم پہلی دفعہ رنگون آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"ہاں۔"

اس نے گیندے کے پھول کیلے کے پتے میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

"کمائیٹ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ وہاں سے دو کوس پر ہمارا گاؤں ہے۔ کنول کے پھول ہم اپنے تالاب میں اگاتے ہیں۔ گیندے اور ترناری کے پھول ہمیں دور جا کر لانے پڑتے ہیں۔"

میں نے اسے دس سینٹ دے کر گیندے کے پھول لے لئے۔ وہ بولی۔

"تم بودھی ہو؟"

میں نے کہا۔

"میں مہاتما بدھ سے محبت کرتا ہوں۔"

میں اس سے باتیں کرنے کے بہانے تلاش کر رہا تھا۔ میں دوسرے پھولوں کو دیکھنے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"سائیں۔"

مجھے یہ نام اس پھول بیچنے والی برمی لڑکی کی طرح بڑا اچھا لگا۔ اس نام

ایسی آواز تھی جیسے ہوا کا تیز جھونکا ناریل کی شاخوں میں سے گزر گیا ہو۔

"سائیں۔ سائیں۔ بڑا اچھا نام ہے۔"

وہ شرما گئی۔ اس دوران ساتھ والی عورت اس سے برمی زبان میں باتیں کرنے لگی۔ میں پھول لے کر اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ کر بودھ معبد کے بڑے صحن میں آ گیا۔ معمول کے مطابق میں کونے والے ناریل کے درختوں کے نیچے جا کر بیٹھ گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ مگر بارش رکی ہوئی تھی۔ میرے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ رنگون میں ایک دن بارش ہوتی ہے تو بادل چار دن تک چھائے رہتے ہیں۔

میں سائیں کا نام دہرانے لگا۔ سائیں۔ یہ نام بڑا مختصر اور اداس تھا۔ اس نام کا رنگ زرد تھا۔ کنول کے زرد پھول کی طرح۔ سائیں کے خوبصورت معصوم چہرے کی طرح۔ میں نے گیندے کے پھول ناریل کے درخت کے پاس رکھ دیئے اور واپس چل پڑا۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے میں نے سائیں کو دور سے دیکھا۔ سیڑھیاں کافی کشادہ تھیں۔ سائیں نے بھی مجھے دیکھا۔ میں ذرا سا مسکرا دیا۔ سائیں بھی ذرا سا مسکرائی اور پھر منہ دوسری طرف کر کے پھولوں کو ادھر ادھر کرنے لگی۔ ہر روز جانے کی بجائے میں ایک دن چھوڑ کر کبھی دن کے وقت اور کبھی رات کے وقت پھول بیچنے والی سائیں کو دیکھنے سولی پیگوڈا جاتا۔

ایک روز میں شام ہونے سے ذرا پہلے سائیں کو دیکھنے گیا تو وہ وہاں پر نہیں تھی۔ اس کی پھولوں سے بھری ہوئی بالٹیاں اسی طرح پڑی تھیں۔ جس چوکی پر وہ بیٹھی تھی وہ بھی وہیں پر تھی۔ دوسری پھول بیچنے والی عورتیں پھول بیچ رہی تھیں۔ میں ذرا اوپر جا کر سیڑھیوں کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تین چار بھکشو جن کو برما میں پنگی کہا جاتا تھا زعفرانی لبادوں میں ملبوس بانس کی چھتریاں تانے ہاتھوں میں مٹی کے پیالے لئے سیڑھیاں چڑھ کر میرے قریب سے گزر گئے۔ مٹی کے پیالوں میں پھول اور زرد کیلے تھے۔ وہ اپنی زبان میں آہستہ آہستہ کوئی بھجن گا رہے تھے۔ آسمان اس روز بھی ابر آلود تھا۔ دن کے وقت تھوڑی سی بارش ہوئی تھی۔

سائیں ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میری نظریں بار بار اس طرف اٹھتیں جہاں وہ بیٹھتی تھی۔ اتنے میں میں نے دیکھا وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بانس کی چھوٹی سی ٹوکری تھی جو لمبے لمبے ڈنٹھلوں والے کنول کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔ جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گئی تو میں اس کے پاس گیا۔ میں نے

ٹوکری والے کنول کے سفید پھولوں کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ تم کہاں سے لائی ہو سائیں؟"

وہ کہنے لگی۔

"نیچے ایک جگہ ہم نے پھول رکھے ہوتے ہیں۔ جب یہاں پھول ختم ہو جاتے ہیں تو نیچے سے لے آتی ہوں۔"

میں نے کنول کا ایک پھول اٹھا لیا۔ بے حد سفید پاکیزہ پھول تھا۔ میں نے اس کے دام پوچھے۔ سائیں نے کہا۔

"پانچ سینٹ کا ایک پھول ہے۔"

میں نے کہا۔

"یہ اتنا مہنگا کیوں ہے؟"

وہ بولی۔

"یہ بڑا مقدس پھول ہے۔ کہتے ہیں یہ پھول بھگوان بودھ کو بڑا پسند تھا۔"

میں نے پانچ سینٹ دے کر پھول لے لیا۔

"سائیں! یہ پھول جب مرجھا جاتے ہیں تو تم ان کا کیا کرتی ہو؟"

سائیں نے رجنی گندھا پھولوں کی ٹہنیوں کے پتے توڑتے ہوئے کہا۔

"ہم اپنے پھول سورج نکلنے سے پہلے ایراوتی کے پانی میں ڈبو کر لاتی ہیں۔ میری ماں کہتی ہے کہ پھول اگر سورج نکلنے سے پہلے دریائے ایراوتی کے پانی میں بھگوئے جائیں تو وہ مرجھاتے نہیں۔"

میں نے کہا۔

"میں یہ پھول اپنے پاس رکھوں گا۔ کل پھر آؤں گا۔ تم ملو گی ناں؟"

سائیں نے کچھ شرما کر کچھ سنجیدہ ہو کر میری طرف دیکھا اور کوئی جواب دیا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور سیڑھیاں اترنے لگا مجھے خیال آیا کہیں سائیں کو میں ایسی بات تو نہیں کہہ دی جو مجھے نہیں کہنی چاہئے تھی۔

اس دوران میرے پیسے ختم ہو گئے۔

میں ملازمت کی تلاش میں رنگون کے اردو اخبار کے دفتر میں پہنچ گیا۔ گجرات کے شاہ جی دونوں اخباروں کو ایڈٹ کرتے تھے۔ بڑے شریف النفس انسان تھے۔ چہرے پر ہر وقت ایک شفقت آمیز مسکراہٹ رہتی تھی۔ انہوں نے مجھے اخبار کے پروف پڑھنے پر ملازم رکھ لیا۔ وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ پروف پڑھنے کے بعد میں آزاد ہوتا تھا۔ کبھی رنگون کی سڑکوں پر پھرتا رہتا۔ کبھی سائیں کو دیکھنے سولی پیگوڈا کی طرف چلا جاتا۔ سائیں اب مجھ سے تھوڑا بے تکلف ہو گئی تھی۔ میں اس سے پھول خرید کر اوپر معبد کے صحن میں ناریل کے درختوں کے قدموں میں رکھ آتا۔

ایک دن میں آوارہ گردی کرتا رنگون کی ایک مشہور مارکیٹ میں آ گیا۔ یہاں ہر قسم کی چیزیں بکتی تھیں۔ گروسری کی دکانیں بھی تھیں۔ کپڑے کی دکانیں بھی تھیں اور سبزی اور پھلوں کی دکانیں بھی تھیں۔ رنگون میں آسٹریلیا سے انگور اور سیب آیا کرتے تھے۔ سیب ترش ہوتے تھے مگر ان کا رنگ بڑا سرخ ہوتا تھا۔ میں ایک دکان کے پاس کھڑا سرخ سیبوں کو دیکھ رہا تھا کہ میری نظر سائیں پر پڑ گئی۔ وہ پھلوں والی دکان سے ایک دکان چھوڑ کر کپڑے کی دکان سے کپڑا خرید رہی تھی۔ بانس کی چھوٹی ٹوکری اس کے پاس تھی جس میں کچھ بھرے ہوئے لفافے رکھے تھے۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ سائیں میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں نے کہا۔

"کپڑا خرید رہی ہو سائیں؟"

"ہاں۔"

اس نے آہستہ سے کہا اور دکاندار برمی زبان میں کچھ کہا۔ دکاندار نے دوسرا تھان نکال کر دکھایا۔ سائیں کپڑا بھی دیکھتی رہی اور دکاندار سے اپنی زبان میں کچھ کہتی بھی رہی۔ میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے آج بالوں میں سفید موگرے کی

کلیاں سجائی ہوئی تھیں۔ مجھے ان کلیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ سائیں کپڑا خریدے بغیر آگے بڑھی تو میں بھی اس کے ساتھ چلنے لگا۔ مارکیٹ میں کچھ دور چلنے کے بعد سائیں نے کہا۔

"آج میں سولی پیگوڈا شام کو جاؤں گی۔"

میں نے فوراً" کہا۔

"میں شام کو پھول خریدنے آؤں گا۔"

سائیں نے چلتے چلتے گردن موڑ کر ایک نظر مجھے دیکھا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔

"تم بودھی نہیں ہو۔ پھر سولی پیگوڈا کیوں آتے ہو؟"

یہ سوال ایک بار پہلے بھی سائیں نے مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے اس وقت اسے کوئی اور جواب دیا تھا۔ اب میں نے کہہ دیا۔

"میں صرف تمہیں دیکھنے آتا ہوں۔"

میں نے یہ بات بے دھڑک کہہ دی تھی۔ سوچنے لگا کہیں سائیں برا نہ مان جائے۔ سائیں میرا جواب سن کر رک گئی۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔

"کیوں؟ مجھ میں ایسی کون سی بات ہے؟"

میں سائیں کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر میں کوئی ماہر نفسیات نہیں تھا۔ کچھ نہ سمجھ سکا کہ اس پھول بیچنے والی لڑکی پر میرے اظہار محبت کا کیا اثر ہوا ہے۔ میں نے کہہ دیا۔

"مجھے تم بڑی اچھی لگتی ہو۔"

اب وہ شرما گئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل پڑی۔ میں نے کہا۔

"اگر تمہیں اچھا نہیں لگتا تو میں نہیں آیا کروں گا۔"

سائیں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ہم مارکیٹ سے باہر نکل آئے تھے۔ سائیں ایک بس شاپ پر رک گئی۔ وہاں کچھ اور لوگ بھی کھڑے تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"سائیں! کیا میں تمہیں دیکھنے نہ آیا کروں؟"

سائیں اس طرف دیکھ رہی تھی جس طرف سے بس آنے والی تھی۔ خاموش رہی۔ اتنے میں بس آگئی۔ مسافر بس میں سوار ہونے لگے۔ سائیں بھی آ

بڑھی۔ میں اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ سائیں بس میں سوار ہو گئی۔ وہ کھڑکی والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بس چلنے لگی تو اس نے میری طرف دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہوا کے لطیف جھونکے نے مجھے زمین سے اوپر اٹھا لیا ہے۔ میں دل میں سائیں کی محبت کے احساس کو سمیٹے سرمستی کے عالم میں بازار میں ایک طرف چل پڑا۔

اسی روز شام کو میں سائیں سے ملنے سولی پیگوڈا چلا گیا۔ سائیں مجھے دیکھتے ہی مسکرائی۔ کہنے لگی۔

"آج کنول کے پھول ختم ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں میں گیندے کے پھول لے لوں گا۔"

وہاں یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی کہ جب میں سائیں سے باتیں کر رہا ہوتا تھا تو دوسری پھول بیچنے والی عورتیں ہماری طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی تھیں۔ وہ زیادہ تر اپنے گاہکوں کے ساتھ مصروف ہوتی تھیں۔ سائیں کیلے کے پتے میں گیندے کے پھول لپیٹ رہی تھی۔

"دس سینٹ پلیز۔"

سائیں مجھے پھول دیتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ میں نے پھولوں کا پیکٹ پکڑنے کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ بھی تھوڑی دیر کے لئے پکڑ لیا۔ سائیں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ میں نے جیب سے دس سینٹ نکال کر دیئے۔ سائیں نے آہستہ سے سر جھکا کر کہا۔

"تھینک یو۔"

میں اوپر جانے کی بجائے نیچے کی طرف سیڑھیاں اترنے لگا۔ تین چار سیڑھیاں اترنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ سائیں مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہماری آنکھیں ملیں تو سائیں نے جلدی سے منہ دوسری طرف کر لیا۔

شروع محبت کے یہ وہ انمول لمحات ہوتے ہیں جو تیز ہوا کے جھونکے کی طرح آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن جنہیں انسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتا۔ کئی برس گزر جانے کے بعد ویران کاٹیج میں بیٹھا اپنی داستان محبت رقم کرتے ہوئے جب ان لمحات کو یاد کرتا ہوں تو مجھے کل کی بات لگتی ہے۔ زندگی کی حسین یادوں کے

یہ وہ تاج محل ہیں جو کبھی ویران نہیں ہوتے۔ کبھی کھنڈر نہیں بنتے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ ان میں لافانی محبتوں کی نشانی ممتاز محل ضرور ہو۔

رنگون میں وقت گزرتا چلا گیا۔ یورپ میں جنگ تیز ہوتی گئی۔ جنگ کے شعلے بن غازی اور طبروق تک پہنچ گئے۔ مجاہد برما اور شیر رنگون اخباروں کے ایڈیٹر شاہ جی نے مجھے رنگون ریڈیو پر بھی جز وقتی کام دلا دیا۔ رنگون ریڈیو سے شام کے وقت اردو میں ایک گھنٹے کا پروگرام نشر ہوتا تھا۔ مجھے اس پروگرام میں پانچ منٹ کی پنجابی زبان میں خبریں پڑھنی ہوتی تھیں۔ میں اردو کے بلیٹن کو پنجابی میں ترجمہ کرتا اور پھر بوتھ میں جا کر خبریں پڑھ دیتا۔ یہ کام مجھے بہت اچھا لگا۔ پنجابی میں خبریں اس لئے رنگون ریڈیو سے نشر ہونا شروع ہوئی تھیں کیونکہ جنگ کا دائرہ وسیع ہو رہا تھا اور بن غازی طبروق کے محاذ پر برطانوی ہندوستان کی جو فوجیں جرمنوں کے خلاف لڑ رہی تھیں ان میں پنجابی رجمنٹوں کی تعداد نوے فی صد تھی۔ برٹش انڈین فوج کے ان پنجابی جوانوں کے لئے پنجابی میں گانے بھی نشر ہوتے تھے۔

رنگون ریڈیو کی دو منزلہ عمارت فریزر سٹریٹ میں میکسم بار والی سٹریٹ کے آخر میں جا کر تھی۔ آگے یہ سٹریٹ بند ہو جاتی تھی۔ کہنے کو یہ سٹریٹ تھی مگر یہ ایک چھوٹے بازار کی طرح تھی۔ اس میں دکان وغیرہ کوئی نہیں تھی۔ میں وقت سے بہت پہلے ریڈیو سٹیشن پہنچ جاتا۔ میکسم بار کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر جھانک کر ضرور دیکھتا۔ اس بار یا شراب خانے کے مدراسی مینجر کا نام مسٹر ہیپٹی تھا۔ درمیانے قد کا باکسر ٹائپ کا آدمی تھا۔ سر کے بال درمیان میں سے غائب تھے الماریوں میں لگی شراب کی بوتلوں کے پاس کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا کاک ٹیل وغیرہ بنا رہا ہوتا تھا۔ ملکی اور غیر ملکی لوگ میزوں کے گرد کرسیوں پر بیٹھے بادہ نوشی میں مصروف ہوتے۔ میں ان لوگوں کو بڑے شوق سے دیکھتا۔ ان میں سے اکثر نشے میں ہوتے تھے اور اونچا بول رہے ہوتے تھے۔ ایک گھنٹے کے اردو پروگرام میں ہفتے میں ایک دن بنگلہ گانے اور ایک دن تامل تلیگو گانے بھی نشر ہوتے تھے۔ کیونکہ انڈین برٹش آرمی میں مدراس، بنگال اور کیرالہ وغیرہ صوبوں کے فوجی بھی تھے۔ لیکن لڑنے والی فوج پنجابیوں اور گورکھوں کی ہی تھی۔ بنگالی اور مدراسی پیچھے سپلائی وغیرہ میں ہوتے تھے۔ مدراسی عام طور پر فوج میں لانگری ہوتے تھے جو لنگر میں فوجیوں کے لئے کھانا وغیرہ پکاتے تھے۔

ریڈیو سٹیشن پر بڑی رونق ہوتی۔ ریڈیو سٹیشن کی عمارت میں داخل ہوتے ہی بڑی نازک اندام سنگ مرمر جیسی برمی لڑکی کے درشن ہوتے۔ یہ برمی لڑکی ڈیوٹی آفیسر تھی۔ اردو پروگرام کے انچارج ضلع جھنگ کے ایک پرانے صحافی مسٹر ملک تھے جو رنگون کے اردو اخبار میں بھی نیوز ایڈیٹر تھے۔ بڑے زندہ دل شاہ خرچ آدمی تھے۔ شراب کے رسیا تھے۔ اکثر پئے ہوئے ہوتے تھے مگر اپنی ڈیوٹی کے بڑے پکے تھے۔ کام میں ذرا سی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر بنگالی نسل کے کرسچین مسٹر میکائے تھے۔ گہرا سانولا رنگ عمر چالیس کے اوپر تھی ہر وقت سگار منہ میں دبائے رکھتے۔ بات کرتے وقت بھی سگار منہ میں ہوتا۔ صرف قہقہہ لگاتے وقت سگار منہ سے نکالتے۔

ریڈیو انجینئر اسی عمر کے ایک زرد رنگ کے ولندیزی نسل کے عیسائی مسٹر ڈی کوسٹا تھے۔ بڑے نرم دم گفتگو تھے۔ ہم سب سے انگریزی میں بات کرتے۔ لہجہ بڑا دھیما ہوتا۔ وہ کبھی کبھی ہندوستانی میں بھی بات کر لیتے تھے۔ دریائے اراوتی کے پاس ناریل کے ذخیرے میں ان کا اونچی مچان والا بانس کا بنا ہوا چھوٹا سا بڑا خوبصورت سا گھر تھا۔ ان کی بیوی بھی بڑی کم گو اور دھیمے مزاج کی خاتون تھی۔ ان کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ ایک مدراسی نوکرانی گھر کا سارا کام کرتی تھی۔ رنگون ریڈیو اور اخبار کے دفتر کی آمدنی ملا کر میرے پاس کافی پیسے جمع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ میں اپنے دوست کریم کے ہاں سے اٹھ کر لیوس سٹریٹ کے ایک فلیٹ میں آ گیا تھا۔ یہ ایک کمرے کا فلیٹ تھا۔ باتھ روم ساتھ تھا۔ ایک طرف چھوٹا سا کچن تھا۔

اپنے حساب سے میں رنگون میں بڑا سیٹ ہو گیا تھا۔ اس شہر میں میرا جی بھی لگ گیا تھا۔ میرا دوست کریم الدین مجھے دوسری تیسرے دن ملنے کبھی ریڈیو سٹیشن اور کبھی میرے فلیٹ پر آ جاتا تھا۔ ہم کافی بنا کر پیتے۔ خوب باتیں کرتے۔ میں نے سائیں سے اپنی محبت کے بارے میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے سائیں کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنی محبت کو اپنے دل میں اس طرح چھپا کر رکھا ہوا تھا کہ اگر کسی سے ذکر کیا تو محبت کے پودے کو ہوا لگ جائے گی۔ اس کی شاخیں مرجھا جائیں گی۔ اور پودا مر جائے گا۔ میں ہفتے میں دو تین بار سائیر سے ملنے سولی پیگوڈا ضرور جاتا۔ اب وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگی تھی۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس نے ابھی تک مجھ

سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن اس کی باتوں سے اور جس طرح وہ میرا انتظار کرتی تھی اور مجھ سے مل کر جس طرح خوش ہوتی تھی اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔ یہاں میں ایک بات ضرور بیان کرنا چاہوں گا کہ میں اس زمانے میں گورا چٹا خوبصورت کشمیری لڑکا ہوا کرتا تھا۔

میری اور سائیں کی محبت کا سلسلہ ابھی تک صرف سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں تک ہی محدود تھا۔ ہم کبھی کسی ریستوران میں کافی وغیرہ پینے نہیں گئے تھے اور میں نے سائیں کو اپنے فلیٹ پر آنے کی بھی دعوت نہیں دی تھی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں رنگون ریڈیو پر نوکر ہوگیا ہوں اور پنجابی زبان میں شام کے وقت خبریں پڑھتا ہوں تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا تم برمی فلمی گانے بھی لگاتے ہو؟“

میں نے کہا۔

”نہیں سائیں! میں صرف اردو زبان کے پروگرام میں پانچ منٹ کے لئے خبریں پڑھتا ہوں۔“

کہنے لگی۔

”میں نے رنگون کا ریڈیو سٹیشن دیکھا ہے۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔

”تم وہاں کیسے گئی تھیں؟“

سائیں نے آنکھ سے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ایک برمی بوڑھا آکر پھولوں کو پسند کرنے لگا۔ اس نے کنول کے پھولوں کا گلدستہ اٹھا کر برمی زبان میں شاید اس کی قیمت پوچھی۔ سائیں نے بھی برمی زبان میں اسے کچھ کہا۔ پھر گلدستہ کیلے کے پتے میں لپیٹ کر اسے دیا۔ سینٹ لے کر چھوٹے سے ڈبے میں ڈالے اور میری طرف متوجہ ہوکر کہا۔

”جس سٹریٹ میں ریڈیو سٹیشن ہے اس کے سامنے ایک بہت بڑا ہوٹل بھی ہے ناں؟“

میں نے کہا۔

”ہاں ہے گرینڈ ہوٹل۔“

”ہاں ہاں۔ یہی نام ہے اس کا۔ میری ایک خالہ اس ہوٹل میں کپڑے تری کرنے پر نوکر ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک بار ریڈیو سٹیشن دیکھنے گئی تھی۔“

میں نے کہا۔

”سائیں! میں شام کو چار بجے کے بعد ریڈیو سٹیشن پر ہی ہوتا ہوں۔ تم کسی وز ضرور آؤ۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“

سائیں شرما سی گئی۔ کہنے لگی۔

”تم مجھ سے یہاں زیادہ دیر باتیں کرتے ہو تو دوسری عورتوں کو شک پڑ سکتا ہے۔“

میں نے پھول اٹھائے اور کہا۔

”اچھا۔ میں جاتا ہوں۔ پرسوں آؤں گا۔“

میں نے برمی انداز میں ہاتھ جوڑ کر اسے سلام کیا۔ اس نے مسکرا کر اسی طرح میرے سلام کا جواب دیا اور میں اپنے دل میں سائیں کی محبت کی گرمی، توانائی ور روشنی لئے وہاں سے واپس آگیا۔

تیسرے روز دوپہر کے وقت میں سائیں سے ملنے گیا تو وہ اپنی جگہ پر نہیں تھی۔ میں اس خیال سے کہ دوسری پھول بیچنے والی عورتوں کو شک نہ پڑ جائے اس طرح سیڑھیاں چڑھ کر بودھ پیگوڈا کے صحن میں چلا آیا۔ آسمان ابر آلود تھا۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں ناریل کے درختوں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ میں نے درختوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”سوری! سائیں نہیں تھی اس لئے تمہارے لئے پھول نہیں لا سکا۔“

ناریل کے درخت ہوا میں اپنی لمبی لمبی شاخیں آہستہ آہستہ لہراتے ہوئے مسکرائے۔ میری نظر پیگوڈا کے بڑے ہال کے دروازے کی طرف تھی جہاں لوگ عبادت کرنے کے لئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ فضا میں اگر بتیوں کی بوجھل خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہال کے اندر جہاں مہاتما بدھ کا سونے کا پترے والا یا شاید سارے کا سارا سونے کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا، روشنی ہو رہی تھی۔

اچانک میں نے سائیں کو دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑے جھکی جھکی معبد کے ہال کمرے سے الٹے قدموں واپس آ رہی تھی۔ دروازے کے باہر آکر اس نے تین بار جھک کر تعظیم کی اور پھر سیدھی ہوکر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اس کے دونوں

ہاتھوں میں گیندے کے پھول تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر اس کے پاس چلا گیا۔ مجھے
دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی۔ پھر مسکراتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر میرے قریب آ
گئی۔ میں نے کہا۔

"سائیں! تم نیچے نہیں تھیں۔ میں تمہیں دیکھنے یہاں آ گیا کہ شاید تم یہاں
ہو۔"

وہ میرے ساتھ چلتی ناریل کے درختوں والی دیوار کے پاس آ گئی۔ کہنے
لگی۔

"میں اس وقت روز بھگوان بدھ کی پوجا کرتی ہوں"۔

"یہ پھول تم اندر سے لائی ہو کیا؟"

"ہاں۔" سائیں نے پھولوں کو چوم کر کہا۔ "یہ بڑے مقدس پھول ہیں۔
میں یہ بھگوان بدھ کے قدموں کو چھوا کر لائی ہوں کہتے ہیں جس گھر میں یہ پھول ہوا
اس گھر میں کبھی کوئی مصیبت نہیں آتی۔"

میں نے کہا۔

"مگر یہ پھول تو دو تین دنوں میں سوکھ جائیں گے۔"

سائیں بولی۔

"یہ پھول سوکھ بھی جائیں تو ان میں بھگوان بدھ کے مقدس قدموں کا اثر
ضرور رہتا ہے۔"

میں نے سائیں سے پوچھا۔

"کیا میں ان پھولوں کو چوم سکتا ہوں؟"

"ہاں۔" سائیں نے اپنی ہتھیلی آگے کر دی۔ میں نے جھک کر پھولوں
بجائے سائیں کی ہتھیلیاں چوم لیں۔ سائیں نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کر لئے اور
سے کوئی بات کئے بغیر تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف چلی گئی۔ مجھے محسوس
کہ سائیں نے میری اس خوبصورت حرکت کو شاید پسند نہیں کیا۔ کہیں وہ مجھ
ناراض نہ ہو گئی ہو۔

میں نے ناریل کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے دونوں درختوں سے مخاطب ہو
پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

درخت خاموش رہے۔ ان کی بڑی بڑی شہ پروں ایسی شاخیں ہوا میں
آہستہ آہستہ لہراتی رہیں۔ میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ دل میں ایک پچھتاوا سا لگ
گیا تھا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ سائیں ضرور مجھ سے ناراض ہو گئی ہو گی۔
میں دوسری طرف سے ہو کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ میں اس پھول بیچنے والی برمی لڑکی
کی محبت میں سرشار تھا۔ رنگون کی بارشوں' رنگون کی بارشوں میں بھیگتے درختوں'
پارکوں' رنگون کے ریستوران اور بازاروں اور مارکیٹوں میں پھیلی ہوئی چائے' کافی'
سگار اور رجنی گندھا کے پھولوں کی خوشبو میں مجھے سائیں کا مسکراتا ہوا معصوم چہرہ نظر
آتا۔ رنگون کی فریزر سٹریٹ میں ایک ریستوران ہوا کرتا تھا۔ اس ریستوران کا نام
ترکی ہوٹل تھا۔ کبھی کبھی میں اپنے دوست کریم الدین کے ساتھ وہاں چائے پینے آ
جاتا تھا۔ اس ہوٹل میں ریکارڈنگ بھی ہوتی تھی اور سہگل' کانن دیوی اور پنکج کے
گانے لگا کرتے تھے۔ نیو تھیٹر کی ان فلموں کے گانے بڑے اداس تھے۔

ایک روز بارش ہو رہی تھی۔ میں اور کریم ترکی ہوٹل میں بیٹھے تھے کہ فلم
سپیرا کا ایک گانا لگا۔

"کون دیس ہے جانا بابو
کون دیس ہے جانا"

شام کا وقت تھا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ عجیب درد انگیز میوزک تھا۔ عجیب
رنگون کی شام کی بارش کی آواز تھی۔ عجیب چائے کی خوشبو تھی۔ پھر وہاں نہ ترکی
ہوٹل تھا نہ چائے کی خوشبو تھی۔ نہ بارش کی آواز تھی۔ نہ سائیں تھی' نہ چندر مکھی
تھی۔ نہ میری امرتسر کی پہلی محبت تھی۔ دیکھے ہوئے چہرے اجنبی لگتے تھے۔ اجنبی
چہرے غائب ہو گئے تھے۔ یہ کوئی خیال بھی نہیں تھا۔ یہ کوئی وہم بھی نہیں تھا۔ ایک
کشتی تھی جس پر میں بیٹھا تھا۔ ایک دریا تھا جس میں کشتی بہتی جا رہی تھی۔ پھر دریا
کشتی کے نیچے سے نکل گیا اور کشتی سمندر کی موجوں پر ہچکولے کھانے لگی۔ پھر یہ
سمندر میری کشتی کو لے کر ایک جنگل میں داخل ہو گیا۔ میں اسی دیس سے آیا تھا۔
مجھے اسی دیس میں جانا تھا۔ ----"اب میں چلتا ہوں۔ مجھے دکان پر بھی جانا
ہے۔"

اپنے دوست کریم کی آواز پر میں نے اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ بہت جانا پہچانا'
بہت اجنبی لگا۔ ہم ترکی ہوٹل سے اٹھ کر فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ کریم نے چھتری

کھول لی تھی۔ ہم دونوں اس کے نیچے ایک دوسرے سے لگ کر چل رہے تھے۔ بارش بڑی موسلا دھار تھی۔ وہ مجھے لیوس سٹریٹ میں میرے فلیٹ کے دروازے پر چھوڑ کر آگے نکل گیا۔ بارش فلیٹ کے دروازے پر ہی مجھ سے جدا ہو گئی۔ رنگون میں یہ اس قسم کی آخری موسلادھار بارش تھی۔ اس کے ساتھ ہی جنوب مشرقی ایشیا میں برسات کا موسم ختم ہو گیا۔ اکتوبر نومبر کے مہینوں میں کبھی کبھار بادل آتے اور ہلکی بارش ہو جاتی تھی۔

1939ء میں دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تھی۔ یورپ میں جنگ زوروں پر تھی۔ یہ 1941ء کا سال جا رہا تھا۔ دسمبر 1941ء کا مہینہ شروع ہوا تو رنگون میں ایسی ہوائیں پھیلنے لگیں کہ جاپان بھی اتحادیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے والا ہے۔ رنگون سیکرٹریٹ کے اردگرد خاردار باڑ لگا دی گئی۔ سڑکوں کے کنارے ہوائی حملے سے بچاؤ کے شیلٹر بننے لگے۔

دسمبر کی چھ یا سات تاریخ تھی کہ جاپان بھی میدان جنگ میں کود پڑا۔ جاپانی فوجیں طوفان کی طرح آگے بڑھیں اور دیکھتے دیکھتے سنگاپور' ہانگ کانگ' جاوا سماٹرا اور فلپائن پر جاپانیوں نے قبضہ کر لیا۔ اب ان کا رخ برما آسام کی طرف تھا۔ رنگون پر خوف و ہراس کی فضا چھا گئی۔ راتوں کو بلیک آؤٹ ہونے لگا۔ برمی عام طور پر بڑے خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جاپانی آئیں گے تو انہیں انگریزوں کی غلامی سے نجات مل جائے گی۔ رنگون ریڈیو سٹیشن پر رات کے وقت بھی اردو اور پنجابی خبروں کے بلیٹن نشر ہونے لگے۔ اخبار شیر رنگون اور مجاہد برما کے دفتر میں اس قسم کی باتیں ہونے لگیں کہ جاپان کا برما پر بھی قبضہ ہو جائے گا کیونکہ یہاں انگریزوں کا دفاع بے حد کمزور ہے۔ انڈیا کی ساری برطانوی فوجیں طبروق اور افریقہ کے محاذ پر لڑ رہی تھیں۔ جاپان کے اعلان جنگ سے جہاں تک مجھے یاد ہے تیسرے یا چوتھے دن جاپانی بمبار طیارے رنگون پر بمباری کرنے آ گئے۔

دن کا وقت تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں اخبار کے دفتر میں بیٹھا پروف ریڈنگ کر رہا تھا کہ اچانک شہر کے سائرن چیخ اٹھے۔ ایئر ریڈ سائرن بڑی دیر سے بجائے گئے تھے۔ جس وقت سائرن بجے جاپانی بمبار اس وقت رنگون کے اوپر پہنچ چکے تھے۔ ابھی ہم لوگ ہوائی حملے سے بچاؤ کے بنکرز کی طرف دوڑے ہی تھے کہ یکے بعد دیگرے تین دھماکے ہوئے۔ دھماکے اتنے زبردست تھے کہ زمین اوپر نیچے ہو گئی۔

اس کے بعد دھماکوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ زمین ایسے ہلنے لگی جیسے مسلسل زلزلہ آ رہا ہو۔ جاپانی جہاز عمارتوں کے درمیان غوطے لگاتے اور مشین گنوں کی تڑاخ تڑاخ فائرنگ کرتے نکل رہے تھے۔ میں ایئر ریڈ بنکر میں دفتر کے ایک کاتب کے ساتھ کانوں میں انگلیاں دیئے سر جھکائے بیٹھا' کلمہ طیبہ پڑھ رہا تھا۔ کسی بھی وقت جاپانی طیارے میں سے کوئی بم نکل کر ہمارے بنکر کے اوپر گر کر ہمارے پرزے اڑا سکتا تھا۔ جب جاپانی طیارے اپنے سارے بم رنگون پر گرا کر چلے گئے تو آل کلیر کا سائرن بجا۔ ہم بنکر سے باہر نکلے۔ شاہ جی گھبرائے ہوئے دفتر کے دروازے پر آئے اور کہنے لگے۔

"کوئی ریڈیو سٹیشن پر جا کر ملک صاحب کی خبر لائے۔"

ایڈیٹر ملک صاحب اس وقت رنگون ریڈیو پر کوئی پراپیگنڈا تقریر کرنے گئے ہوئے تھے۔ میں ریڈیو سٹیشن کی طرف دوڑ پڑا۔ وہاں سے رنگون ریڈیو زیادہ دور نہیں تھا۔ سڑک پر ایک بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ فریزر سٹریٹ پر آیا تو دور آسمان پر گہرے سیاہ دھوئیں کے بادل اٹھتے نظر آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رنگون کی جیٹی پر ایک آئیل ٹینکر کھڑا تھا۔ ایک بم اس پر گرنے کے بعد پھٹا تو اسے آگ لگ گئی۔

فریزر سٹریٹ پر ذرا آگے گیا تو دیکھا کہ ایک بم ترکی ہوٹل کے باہر گرا تھا۔ وہاں بہت بڑا گڑھا پڑ گیا تھا۔ ترکی ہوٹل تباہ ہو گیا تھا اور اس کی پیسٹریاں اور سموسے سڑک پر دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ میکسم سٹریٹ کے کونے والی عمارت بھی آدھی ڈھے گئی تھی اور اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے گھبرائے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔ میکسم بار بچ گیا تھا لیکن اس گلی میں ریڈیو سٹیشن کی بلڈنگ کا سامنے والا حصہ تباہ ہو چکا تھا۔ جاپانیوں نے رنگون ریڈیو سٹیشن کو سب سے پہلے ٹارگٹ بنایا تھا۔ میں دوسری طرف سے ہو کر ریڈیو سٹیشن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ڈیوٹی روم کی دیوار گر گئی ہوئی تھی اور فرش پر نازک اندام برمی لڑکی کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ ایک صاحب گھبرائے ہوئے ایک طرف جاتے نظر آئے تو میں نے ملک صاحب کا پوچھا۔ انہوں نے صرف اتنا کہا۔

"وہ چلا گیا تھا۔"

میں ریڈیو سٹیشن کی تباہ حال عمارت سے نکل کر فریزر سٹریٹ پر آ گیا۔ میرا خیال سائیں کی طرف چلا گیا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہو گی۔ کہیں جاپانیوں نے پیگوڈا پر بم نہ پھینک دیئے ہوں۔ میں سولی پیگوڈا کی طرف تیز تیز چلنے لگا۔ چوک

میں کئی عمارتوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ آگ بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سڑک کے عین درمیان میں ایک بم پھٹا تھا جہاں گڑھا پڑ گیا تھا اور اندر سے پانی نکل آیا تھا۔ ایک ٹرام کار الٹی پڑی تھی۔ ٹرام کے نیچے مجھے کچھ لوگوں کی دبی ہوئی لاشیں دکھائی دیں۔ میں نے پہلی بار ہوائی جہازوں کی بم باری دیکھی تھی۔ کئی لوگ فٹ پاتھ پر مرے پڑے تھے۔ یہ جاپانی طیاروں کی مشین گن فائرنگ سے ہلاک ہوئے تھے۔ لوگ بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

میں سولی پیگوڈا کے چوک میں آیا تو دیکھا کہ پیگوڈا اسی طرح تھا۔ اس پر کوئی بم نہیں گرا تھا۔ پیگوڈا کی سیڑھیاں خالی پڑی تھیں۔ وہاں نہ پھول تھے نہ پھول بیچنے والیاں تھیں۔ میں پیگوڈا کے اوپر والے صحن میں گیا۔ وہاں بری بودھی برآمدے اور اندر کے بڑے ہال کمرے میں بدھ کے مجسموں کے آگے ہاتھ باندھے سر جھکائے بیٹھے مناجات پڑھ رہے تھے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں مگر مجھے سائیں کہیں نظر نہ آئی۔ پیگوڈا کی سیڑھیاں اترتے ہوئے میں اس جگہ تھوڑی دیر کے لئے رک گیا جہاں سائیں دوسری عورتوں کے ساتھ بیٹھی پھول بیچا کرتی تھی۔

خدا جانے وہ بمباری کے وقت کہاں تھی۔ ہوائی حملے کے سائرن کی آواز پر وہ ضرور دوسری عورتوں کے ساتھ پھولوں کی بالٹیاں اٹھا کر وہاں سے بھاگ گئی ہوگی۔ اس نے کہا تھا کہ وہاں قریب ہی کسی جگہ وہ اپنا سامان رکھا کرتی ہے۔ اب مجھے اپنے فلیٹ والی سٹریٹ کا خیال آیا جاپانیوں نے شہر پر بھی بم گرائے تھے۔ کہیں میرا فلیٹ بھی ----- تباہ نہ ہو گیا ہو۔

میں واپس فریزر سٹریٹ سے ہوتا ہوا اپنی سٹریٹ میں آیا۔ یہ گلی اور اس کے فلیٹ سلامت تھے مگر لوگوں میں افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ضروری سامان گاڑیوں وغیرہ میں لاد کر وہاں سے نکل رہے تھے۔ میرا فلیٹ بالکل ٹھیک حالت میں تھا۔ میں نے غسل خانے میں جا کر پانی پیا اور صوفے پر آ کر بیٹھ گیا لیکن دل کو چین نہیں تھا۔ کبھی ملک صاحب کا خیال آتا، کبھی اخبار کے عملے اور شاہ جی کا خیال آتا میں نے فلیٹ کو تالا لگایا اور دوبارہ اخبار کے دفتر میں آ گیا۔ وہاں شاہ جی دفتر کے عملے کے درمیان بیٹھے کوئی ضروری میٹنگ کر رہے تھے ---- ملک صاحب وہاں موجود تھے۔ میں بھی ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ شاہ جی کہہ رہے تھے۔

"برٹش آرمی کا دیوالہ نکل چکا ہے۔ سارے شہر میں تین اینٹی ایئر کرافٹ

گئیں تھیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ انگریزی حکومت سیکرٹریٹ سے تمام ضروری فائلیں لے کر شملے کی طرف بھاگ رہی ہے۔"

اس زمانے میں جب جاپانیوں نے برما پر قبضہ کر لیا تھا تو انگریزوں نے شملے میں برما گورنمنٹ کا سیکرٹریٹ بنا لیا تھا۔ ایک کاتب نے شاہ جی سے پوچھا۔

"شاہ جی! ہمارا کیا بنے گا؟ ہم تو اپنے وطن سے ہزاروں میل دور سمندر پار بیٹھے ہیں۔"

شاہ جی نے کہا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ بری لوگ جاپانیوں کا بے تابی سے انتظار کر رہے ہیں۔ برمیوں نے جاپانیوں کے لئے زبردست جاسوسی کی ہے انہوں نے جاپانیوں کو رنگون میں انگریزی فوج کے سب خفیہ ٹھکانوں کی اطلاع پہنچا دی تھی۔ جاپانی طیاروں کو یہ بھی اطلاع تھی کہ رنگون کی بندرگاہ پر ایک آئیل ٹینکر کھڑا ہے۔ چنانچہ انہوں نے سب سے پہلے اسے ہی نشانہ بنایا۔"

ملک صاحب نے کہا۔

"شاہ جی! میرا خیال ہے کہ دو ایک دن میں جاپانی رنگون میں پہنچ جائیں گے۔ ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ابھی تو شاید ہمیں کلکتے جانے والا سمندری جہاز مل جائے گا۔ اگر دیر کر دی تو ہم یہاں پھنس جائیں گے۔"

شاہ جی کہنے لگے۔

"ملک صاحب! ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میری اطلاع کے مطابق انگریزوں نے ایک ڈویژن فوج برما کی مشرقی سرحد پر جاپانیوں کی یلغار روکنے کے لئے روانہ کر دی ہے اور ایک ڈویژن برٹش انڈیا کی فوج طبروق سے برما کی طرف چل پڑی ہے۔"

شاہ جی کی یہ اطلاعات بالکل غلط تھیں۔ انگریزوں نے اپنی ساری فوجی طاقت اتحادیوں کے ساتھ شمالی افریقہ کے محاذ پر جھونک رکھی تھی۔ برما کے محاذ پر صرف چند ایک یونٹ ہی تھے۔ علاوہ ازیں جاپانی اسقدر تیز رفتاری کے ساتھ سنگاپور، فلپائن اور جاوا سماٹرا کو روندتے ہوئے برما کی طرف بڑھے چلے آ رہے تھے کہ انگریزوں نے برما سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا ہوا تھا۔ اس کا ثبوت دو دن کے بعد ہی مل گیا۔ دوسرے روز جاپانی طیاروں نے رنگون کی بندرگاہ اور رنگون کے ایک کالج پر زبردست بمباری کی۔ اس کالج میں انگریزی فوج کا بہت بڑا اسلحے کا ڈپو تھا۔ اس کی اطلاع جاپانیوں کو

برمی مخبروں نے دی تھی۔ بمباری سے اسلحے کا ڈپو اور رنگون کی بندرگاہ بالکل تباہ
گئی۔ وہاں جتنے جہاز کھڑے تھے سب کو آگ لگ گئی۔

تیسرے روز جاپانی طیارے سورج نکلتے ہی نمودار ہوئے اور انہوں نے ا
بار پھر شہر پر اندھا دھند بم گرانے شروع کر دیئے۔ اس بمباری نے رنگون میں
ہندوستانیوں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ لوگوں نے اپنے بال بچوں کو اور تھوڑا بہت
سامان ہاتھ لگا، ساتھ لیا اور رنگون شہر سے نکل کر پروم کی طرف سفر شروع کر د
یہ کوئی معمولی سفر نہیں تھا۔ آگے چل کر میں آپ کو اس سفر کی صعوبتوں اور نا
تصور اذیتوں کی تفصیلات بتاؤں گا۔ کیونکہ میں بھی ایک قافلے کے ساتھ برما
خوفناک اور انتہائی دشوار گزار جنگلوں میں چالیس دن تک پیدل سفر کر کے بڑ
کا کس بازار پہنچا تھا۔

رنگون میں میرا صرف ایک ہی دوست کریم الدین تھا۔ میں ان کی دکان پر گیا تو دیکھا دکان جل چکی تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ شہر میں ایسی بھگدڑ مچی ہوئی تھی کہ کریم الدین کا پتہ کرنے میں ان کی کوٹھی پر نہیں جا سکتا تھا۔ ان کی کوٹھی شہر سے باہر تھی۔ میں اخبار کے دفتر کی طرف دوڑا کہ وہاں جا کر معلوم کرتا ہوں کہ شاہ جی اور ملک صاحب اور اخبار کا ہندوستانی عملہ وہاں موجود ہے یا نہیں۔ وہاں آیا تو دیکھا کہ برمی لوگ اخبار کے دفتر میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ پیچھے جو پریس لگا تھا اس کو توڑ رہے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ جاپانیوں کی یلغار کے بعد معلوم ہوا کہ برمی لوگ ہندوستانیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں ہندوستانیوں نے انڈیا سے آ کر برما میں ان کے کاروبار پر قبضہ کر رکھا تھا۔ حالانکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ برما کے لوگ سست اور کاہل تھے اور محنت مشقت سے گریز کرتے تھے۔ جبکہ ہندوستان کے مختلف صوبوں خاص طور پر پنجاب اور صوبہ سرحد سے آئے ہوئے لوگ جفاکش اور محنتی تھے اور انہوں نے برس ہا برس کی محنت اور لگن سے رنگون میں کاروبار کو عروج پر پہنچایا تھا۔

بمباری کے بعد برمیوں نے ہندوستانیوں کی دکانوں اور مکانوں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی بے چینی سے جاپانیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ کئی برمیوں نے اپنی دکانوں اور مکانوں پر جاپانی جھنڈے بھی لہرا دیئے تھے۔ ان حالات میں ہندوستانیوں کے پاس سوائے وہاں سے اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانیں بچا کر نکل جانے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ شاہ جی اور ملک صاحب بھی وہاں نہیں ہیں اور کریم کا بھی کچھ پتہ نہیں کہ زندہ بھی ہے یا نہیں تو میں نے بھی رنگون سے بھاگنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اپنے فلیٹ پر آیا۔ میرے پاس چند کپڑوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ کپڑے میں ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ کچھ انگریزی کرنسی جو انڈیا میں بھی چلتی تھی میں نے بچا کر رکھی ہوئی تھی۔ سو سوا سو روپے تھے۔ دس دس روپے کے

کچھ نوٹ تھے۔ باقی چاندی کے گول روپے تھے۔ انہیں ایک رومال میں لپیٹ کر اپنی کمر کے گرد باندھا۔ دس بارہ روپے جیب میں رکھ لئے تھے کہ راستے میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے میری بش شرٹ کی جیب میں وائٹ ہارس سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس تھی۔ دو سگریٹ میں نے پی لئے ہوئے تھے۔ رنگون میں وائٹ ہارس سگریٹ بڑا مشہور تھا اور اس کا شمار اچھے سگرٹوں میں ہوتا تھا۔ میرے پاس ایک درمیانے سائز کا چاقو بھی تھا جسے میں نے کچن میں رکھا ہوا تھا۔ وہ چاقو بھی بند کر کے میں نے پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ ناشتہ میں نے اپنی عادت کے مطابق صبح صبح ہی کر لیا تھا۔

اللہ کا نام لیا اور فلیٹ سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔

سڑک پر سوائے برمی لوگوں کے ہر کوئی بدحواس اور گھبرایا ہوا تھا۔ ہماری سٹریٹ کے کچھ مدراسی بنگالی اور سورتی میمن لوگ بھی اپنے اپنے بال بچوں کو لئے افراتفری کے عالم میں جس طرف دوسرے ہندوستانی جا رہے تھے اس طرف چلے جا رہے تھے۔ ابھی تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ کس طرف جا رہے ہیں اور مجھے رنگون سے نکلنے کے لئے کس طرف جانا ہے۔ جس طرف دوسرے لوگ جا رہے تھے میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا تھا۔ فریزر سٹریٹ کے چوک میں آئے تو وہاں کچھ اور لوگ مل گئے جن کی عورتیں اور بچے بھی ساتھ تھے۔ مردوں نے چھوٹی چھوٹی گٹھڑیاں اور تھیلے وغیرہ اٹھا رکھے تھے۔ بچے رو رہے تھے۔ عورتیں پریشان تھیں۔ برمی لوگ انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ ہمارا چھوٹا سا قافلہ بن گیا تھا جو سڑک کے کنارے کنارے فٹ پاتھ کے ساتھ جا رہا تھا۔ سڑک پر گاڑیاں اور وکٹوریہ آ جا رہی تھیں مگر ان میں زیادہ تر برمی لوگ سوار تھے اور لوٹا ہوا سامان لئے جا رہے تھے۔ رنگون میں کپڑے اور اجناس کی بڑی بڑی مارکیٹیں تھیں جو زیادہ تر سورتی میمن اور مدراس کے مسلمانوں کی ملکیت تھیں۔ کہتے ہیں کہ ان پر جب برمیوں نے حملہ کیا تو وہ تین کپڑوں میں اپنے کنبے کو لے کر نکل کھڑے ہوئے تھے۔ آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ میں نے رنگون کے اس زمانے کے ایک کروڑ پتی سورتی مسلمان تاجر کو کس حالت میں جنگل میں بھوکا پیاسا پڑے دیکھا۔

ابھی تک میں اسے ایک ایڈونچر ہی سمجھ رہا تھا کہ چلو میرا کیا ہے۔ اکیلا مرد ہوں۔ نوجوان ہوں۔ ایڈونچرس آدمی ہوں۔ ہندوستان کے جنگلوں کی بھی آوارہ

گردی کر چکا ہوں۔ اب برما کے جنگلوں کی بھی سیر ہو جائے گی۔ قافلے کے ساتھ ہوں۔ جہاں یہ کھائیں پئیں گے میں بھی کھا پی لیا کروں گا۔ ایک نہ ایک دن تو برما سے نکل کر بنگال پہنچ ہی جاؤں گا۔ مجھے تو آگے چل کر معلوم ہوا کہ میں موت کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔ اور مجھے جن جنگلوں میں سے پیدل گزرنا پڑے گا وہاں ہر قدم پر موت میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ لیکن ابھی مجھ پر ایک اور قیامت ٹوٹنے والی تھی۔ یہ قیامت جاپانی فوجیوں کی شکل میں مجھ پر نازل ہونے والی تھی۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں جاپانی ایک طوفان کی طرح برما کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جس وقت انہوں نے تیسرے دن رنگون پر بمباری کی تو ان کی ایک انفنٹری ڈویژن اپنے توپ خانے کی مدد سے برما کی سرحد میں داخل ہو چکی تھی۔ رنگون کے ہندوستانی مہاجرین کو اس کی بالکل خبر نہیں تھی۔

ہم لوگ رنگون سے نکل آئے تھے۔ ہمارا قافلہ کوئی چھوٹا سا سو آدمیوں کا ہو گا جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ اتنا ضرور پتہ چل گیا تھا کہ ایک آدمی قافلے کی راہ نمائی کر رہا ہے اور رنگون سے پروم تک کے جنگلاتی راستے کو اچھی طرح سے جانتا ہے اور ہم لوگ اگر اسی طرح چلتے رہے تو چھ سات دنوں میں پروم پہنچ جائیں گے۔ ہم رنگون سے پروم جانے والی شاہراہ سے کافی ہٹ کر کھیتوں' میدانوں اور ندی نالوں پر سے ہوتے ہوئے سفر طے کر رہے تھے۔ کیونکہ شاہراہ پر خطرہ تھا کہ جاپانی طیارے قافلے کو دیکھ کر بمباری نہ کرنی شروع کر دیں۔

وہاں کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ اتنے مہاجرین کے چلنے سے راستہ بنتا ضرور جا رہا تھا اور ہمارے پیچھے آنے والے رنگون کے مہاجرین کے لئے آسانی پیدا ہو رہی تھی۔ سفر بڑی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے طے ہو رہا تھا۔ ابھی تک ہمارے اوپر آسمان پر کوئی جاپانی بمبار طیارہ رنگون کی طرف جاتا نظر نہیں آیا تھا۔ ہم ابھی جنگل میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ درختوں کے جھنڈ ضرور نظر آتے تھے۔ کوئی ندی آتی تو وہاں برمی ملاح چھوٹی چھوٹی کشتیاں لئے کھڑے ہوتے۔ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ رنگون سے ہندوستانی لوگ انڈیا کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ یہ ملاح کاروبار کرنے وہاں آ گئے تھے۔ ایک ایک سواری کا پانچ پانچ روپیہ وصول کرتے اور ندی نالہ پار کرا دیتے۔ ایک جگہ کافی بڑی ندی آ گئی تو برما ملاحوں نے ایک ایک آدمی اور بچے کا بیس بیس روپیہ کرایہ وصول کیا۔ قافلے میں شامل بعض لوگ کہہ رہے تھے کہ ان

برمی دیہاتیوں سے ہرگز تکرار نہ کرنا۔ یہ ہندوستانیوں کے دشمن ہیں۔ میرا ساتھ لدھیانے کے ایک لڑکے کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ انیس برس کی ہو گی۔ وہ رنگون کے کسی ہوٹل میں ملازم تھا۔ ہم دونوں آپس میں پنجابی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔

ایسا معاملہ نہیں تھا کہ سارے لوگ ایک رجمنٹ کی شکل میں مارچ کرتے چلے جا رہے ہوں۔ مختلف کنبوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بن گئی تھیں۔ جن کے پاس کافی روپے تھے انہوں نے راستے میں بانس کی بیل گاڑیاں خرید لی تھیں جن کے آگے بھینس یا بیل جتا ہوا تھا۔ گاڑی پر انہوں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو بٹھا دیا تھا اور خود بیل گاڑی کی گاہدی پر بیٹھ کر بیلوں کو چلا رہے تھے یا باگ ہاتھ میں تھامے بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اس طرح ہمارے قافلے میں دس بارہ بیل گاڑیاں ہو گئی تھیں۔ ہر بیل گاڑی کے درمیان فاصلہ تھا جو چلتے ہوئے گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ ہمارے آگے آگے کلکتے کی ایک بنگالی فیملی کی بیل گاڑی جا رہی تھی۔ ہم کسی وقت تھوڑی دیر کے لئے بیل گاڑی کے پیچھے تھوڑی سی جگہ دیکھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ میرے لدھیانے والے ساتھی کا نام غلام احمد تھا۔ آسمان صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ چلتے رہنے سے ہم پسینے میں نہا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے لئے کسی جگہ رک جاتے۔ قافلہ چلتا رہتا۔ ہم اس کے بعد پھر قافلے میں شامل ہو جاتے۔ دوپہر کے بعد قافلہ ایک جگہ رک گیا۔

آگے سے بیل گاڑیاں رکیں تو پیچھے والوں نے بھی بیل گاڑیاں روک دیں۔ وہیں درختوں کے نیچے روٹیاں وغیرہ پکنے لگیں۔ جو لوگ بچوں کے ساتھ گھروں سے بھاگے تھے وہ جتنا اٹھا سکتے تھے اتنا آٹا چاول دال چینی اور نمک وغیرہ ساتھ لیتے آئے تھے۔ قافلہ ایک ایسی جگہ رکا تھا جہاں قریب ہی چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ یہاں لوگوں نے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کیا اور دوبارہ سفر شروع ہو گیا۔ آہستہ آہستہ دن ڈھلنے لگا۔ شام کے سائے اترنا شروع ہو گئے تو قافلے نے ایک جگہ پڑاؤ ڈال لیا۔ یہاں اردگرد کے دیہات کے برمی لوگ قافلے والوں کے لئے پینے کا پانی اور دوسری کھانے پینے کی چیزیں ٹوکریوں اور تھیلوں میں لے کر آ گئے۔ پانی وہ مفت پلاتے مگر دوسری چیزوں کے پیسے وصول کرتے۔ میں اور غلام احمد بھی پیدل چلتے چلتے تھک گئے تھے۔ میرے ایک پاؤں کے جوتے کا تلوا ٹوٹ گیا تھا۔ میں نے اس پر رسی باندھ لی

تھی۔ غلام احمد کے پاس بھی کچھ پیسے تھے۔ ہم نے ایک برمی سے بھنے ہوئے چاول خرید کر کھائے اور پانی پی کر ایک درخت کے نیچے لیٹ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ غلام احمد کو رنگون میں رہتے تین چار سال ہو گئے تھے۔ کہنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے کہ یہ برما میں مون سون کا موسم نہیں ہے۔ اگر مون سون کا موسم ہوتا تو ہمارے لئے پیدل چلنا ناممکن تھا۔ اب تو امید ہے کہ گرتے پڑتے کسی نہ کسی طرح بنگال پہنچ جائیں گے۔"

جیسے جیسے شام کا اندھیرا چھا رہا تھا مچھروں کے ہجوم حملہ آور ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کا علاج یہ کیا گیا کہ جگہ جگہ آگ کے الاؤ روشن کر دیئے گئے۔ ان کے دھوئیں سے مچھر کافی بھاگ گئے۔ غلام احمد اپنی کہانی سنانے لگا کہ وہ کیسے سوتیلی ماں کے مارنے پیٹنے سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ کر کلکتے چلا آیا۔ پھر وہاں گھروں اور ہوٹلوں میں نوکریاں کرتا رہا۔ کسی نے کہا رنگون چلے جاؤ وہاں اچھی نوکری مل جائے گی اور وہ رنگون آ کر ایک ہوٹل میں ملازم ہو گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا اب تم واپس اپنی سوتیلی ماں کے پاس جاؤ گے؟"

وہ بولا۔

"بالکل نہیں۔ میں کلکتے میں ہی کوئی کام تلاش کر لوں گا۔"

میں نے بھی اسے اپنی فرضی کہانی تھوڑا نمک مرچ لگا کر سنا دی کہ میں بھی سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آ کر گھر سے بھاگا ہوں۔ غلام احمد خوش ہو کر بولا۔

"پھر تو ہم دونوں بھائی بھائی ہوئے۔"

رات گزر گئی۔ دوسری دن بیل گاڑیاں پھر چل پڑیں۔ پیدل چلنے والے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مگر اب ان میں وہ بات نہیں رہی تھی۔ سبھی تھک چکے تھے۔ گھربار، زمین جائیداد، مکان دکانیں اور کاروبار چھوڑ کر بھاگے ہوئے بلکہ رنگون سے زبردستی نکالے ہوئے لوگ تھے۔ کئی ایسے بھی تھے جن کے عزیز بمباری میں ہلاک ہو گئے تھے۔ چہروں پر شدید بے بسی اور محرومی اور تھکن کے اثرات تھے۔ انہوں نے آپس میں بات بات پر لڑنا جھگڑنا بھی شروع کر دیا تھا۔

دوسرے دن تیسرے پہر کے وقت قافلے نے ایک بڑے قصبے کے قریب ایک جھیل کے کنارے پڑاؤ ڈال لیا۔ معلوم ہوا کہ ہم نے ابھی تک رنگون سے آگے صرف تیس بتیس میل کا فاصلہ ہی طے کیا ہے۔ میں نے غلام احمد سے کہا۔

"اس طرح تو خدا جانے ہم کب انڈیا پہنچیں گے۔"

وہ بولا۔

"کچھ پتہ نہیں یار۔"

اب غلام احمد بھی مایوس مایوس اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ میں بھی یہ سوچ کر کسی وقت پریشان ہو جاتا کہ ہمارے پاس تو کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسرے قافلے والے تو ہمیں پیسے لے کر بھی کچھ نہیں دیں گے اور ان کے پاس بھی جب آٹا دال ختم ہو گئے اور راستے میں کوئی گاؤں قصبہ بھی نہ آیا تو پھر کیا ہوگا؟ ایک آدمی جو قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا اس کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ آگے ایسا ایسا جنگل آ رہا ہے کہ جہاں پینے کو نہ پانی ملے گا نہ کھانے کو کوئی جنگلی پھل ہی ملے گا۔

پھر خیال آتا کہ اللہ مالک ہے۔ جہاں یہ سارے لوگ ہیں وہیں ہم بھی ہیں۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں نے قافلے میں شریک ایک عمر رسیدہ آدمی سے پوچھا کہ کیا برما کے جنگل شروع ہو گئے ہیں۔ اس نے بتایا کہ ابھی ہم رنگون سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ برما کے جنگل دو تین دن کے بعد شروع ہوں گے۔ راستے میں ہمیں کئی ہاتھی ملے جنہیں برمی لوگ قطار میں لئے جا رہے تھے۔ میں صحت مند نوجوان تھا پھر بھی دو ڈھائی دن سے پیدل چل چل کر تھک گیا تھا۔ اگرچہ میں اور غلام احمد کبھی کبھی بیل گاڑی پر بھی بیٹھ جاتے تھے۔ اس کے باوجود طبیعت اس آفت ناگہانی کی طرح نازل ہونے والے سفر سے اکتا گئی تھی۔ چونکہ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا اس لئے مجبوری تھی اور چلے جا رہے تھے۔ رنگون سے کاکس بازار تک کی اس تاریخی ہجرت کے گواہ آج بھی پاکستان میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوں گے۔

ہو سکتا ہے انہیں مجھ سے شکایت بھی پیدا ہو کہ انہوں نے اس قیامت کے سفر میں جو مصیبتیں جھیلیں تھیں جو اذیتیں برداشت کی تھیں اور زندگی کے جس انتہائی دردناک دور میں سے انہیں گزرنا پڑا تھا میں اسے پوری طرح بیان نہیں کر سکا۔ اس تاریخی انخلا میں مشہور صحافی باری علیگ اور ان کی بیگم صاحبہ کے علاوہ باری صاحب کی چھوٹی بچی بھی شامل تھی جن کا حال ہی میں لاہور میں انتقال ہوا ہے۔ باری صاحب رنگون کے اردو روزناموں کے ایڈیٹر ہو کر ابھی رنگون پہنچے ہی تھے کہ رنگون پر یہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ کسی دوسرے قافلے میں شامل ہو کر رنگون سے بنگال پیدل

پہنچے تھے۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ رنگون سے بنگال کی طرف پیدل روانہ ہونے کے تین دن بعد ہی مجھ پر مایوسی اور بد دلی کی کیفیت طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ کبھی لگتا کہ ہم کسی نہ کسی طرح بنگال پہنچ جائیں گے اور کبھی محسوس ہوتا کہ یہ قیامت کا سفر ہمیں برما کے جنگلوں ہی میں موت کے گھاٹ اتار دے گا۔ کسی وقت جاپانیوں کا کوئی فوجی طیارہ آسمان پر سے گزرتا تو میں سوچتا کہ یہ ہم سے زیادہ خوش قسمت ہے کہ اس میں سوار فوجیوں کو ان دشوارگزار بھیانک جنگلوں میں پیدل نہیں چلنا پڑ رہا۔ ہم چڑچڑے ہو گئے تھے۔ بات بات پر میں اور غلام احمد ایک دوسری سے الجھ پڑتے تھے۔ ایک روز میری اس کی لڑائی ہو گئی۔ میں نے اسے زور سے ٹکر ماری۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ قافلے میں شامل دوسرے لوگوں نے ہمیں چھڑوا دیا لیکن ہماری بول چال بند ہو گئی۔ میں نے غلام احمد کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قافلہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ میں ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گیا۔ جب قافلے کی آخری ٹولی گزر رہی تھی تو میں اس میں شامل ہو گیا۔ یوں میں قافلے میں سب سے پیچھے اور غلام احمد سے دور ہو کر سفر کرنے لگا۔

بظاہر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ قافلے میں آگے چلنے والوں کی حالت بھی ویسی ہی ابتر اور خستہ تھی جیسی پیچھے آنے والوں کی تھی۔ ہمارے پیچھے دوسرے قافلے بھی رنگون سے نکل کر پیدل مارچ کرتے چلے آ رہے تھے مگر ہمارے اور ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ ہمارے آگے بھی کچھ قافلے نکل چکے تھے جن کے چھوڑے ہوئے نشان گرے پڑے چیتھڑوں، ٹوٹے ہوئے برتنوں اور بہت آگے جانے کے بعد انسانی لاشوں کی شکل میں ہمیں ملے تھے۔

چوتھے روز ہمارا قافلہ ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے رک گیا۔ قافلے میں ایسے لوگوں کی تعداد کم نہیں تھی جو مدتوں سے برما میں آباد تھے اور برمی زبان روانی سے بولتے اور سمجھتے تھے۔ وہ راستے میں برمی دیہاتیوں سے بات چیت کر کے راستے کے بارے میں معلومات حاصل کر لیتے تھے۔ ان لوگوں کی زبانی معلوم ہوا کہ آگے برما کے دشوارگزار جنگلات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور وہاں ہمیں کھانے پینے کو شاید ہی کچھ ملے۔ اس لئے ہمیں پانی کے کنستر اور مٹکے بھر کر بیل گاڑیوں میں رکھ لینے چاہئیں۔ لوگوں نے قریبی دیہات میں جا کر مٹی کے مٹکے خریدے اور انہیں جھیل کے

پانی سے بھر کر بیل گاڑیوں پر رکھ لیا۔ وہاں سے سوکھے چاول اور چنے وغیرہ جو کچھ بھی ملا وہ بھی ساتھ رکھ لیا۔ راستے میں جنگلی کیلے بھی توڑ کر سنبھال کر رکھ لئے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ تمام چیزیں بہت جلد ختم ہو جائیں گی۔ اگر ختم نہیں ہوں گی تو قافلے میں شریک جن لوگوں کے پاس کھانے کو کچھ نہیں بچے گا وہ ساری چیزیں لوٹ لیں گے اور لوگ جنگلوں میں بھوک اور پیاس سے بلک بلک کر دم توڑنے لگیں گے ----- اور جو پیچھے رہ جائے گا اسے جنگلی درندے ہڑپ کر جائیں گے۔ آگے جا کر برمی ڈاکوؤں کی مصیبت بھی نازل ہونے والی تھی جو قافلے پر حملہ کرتے، لوگ جو جمع پونجی چھپا کر ساتھ لے جا رہے تھے انہیں لوٹ سکتے اور کئی مقامات پر تو وہ لوگوں کی عورتیں بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔

اس چھوٹی سی جھیل کے کنارے قافلے کے پڑاؤ ڈالنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہاں پینے اور نہانے دھونے کے لئے پانی وافر مقدار میں تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہاں نہ صرف ایک گاؤں قریب ہی تھا بلکہ جھیل کے پاس دو چار جھونپڑے بھی تھے جو خالی پڑے تھے۔ ان جھونپڑوں میں خواتین آرام کرنے کے لئے چلی گئیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہماری ٹولی میں چالیس کے قریب لوگ تھے۔ ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ عورتوں نے چاول وغیرہ ابال لئے۔ مجھے بھی ایک مسلمان میمن فیملی نے کھانے میں اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ کھانا کھانے کے بعد میں ایک طرف ہو کر دیوار کے درخت کے نیچے گھاس پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ مجھے نیند آنے لگی۔ سوچا جب تک لوگ کھانے پینے میں اور عورتیں کپڑے وغیرہ دھونے میں مصروف ہیں میں تھوڑی دیر آرام کر لیتا ہوں۔ چنانچہ میں وہیں گھاس پر لیٹ گیا۔

لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی۔

جس وقت میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ رات کا اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ واقعی رات ہو گئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درخت کے نیچے سے اٹھ کر جھیل کی طرف گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ قافلے والے آگے نکل گئے تھے۔ میں درخت کی اوٹ میں سویا ہوا تھا کسی کی مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ ورنہ شاید مجھے کوئی نہ کوئی ضرور جگا دیتا۔ سوچا دوڑ کر قافلے تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ لیکن وہاں اندھیرا اسقدر گہرا اور خوفناک تھا کہ میری ہمت نہ پڑی۔ آخر یہ فیصلہ کیا کہ اسی جگہ بیٹھ کر پیچھے سے آنے والے قافلے کا انتظار کرتا ہوں۔ اس

راستے پر قافلے چلے آ رہے تھے۔ کسی دوسرے قافلے میں شامل ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر میں ایک خالی جھونپڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہاں مچھروں نے حملہ کر دیا۔ ان سے بچنے کے لئے باہر نکل آیا۔ باہر بھی مچھروں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جہاں عورتوں نے پتھر جوڑ کر آگ جلائی تھی۔ وہاں آگ بجھ چکی تھی۔ میں نے اندھیرے میں ادھر ادھر سے درختوں کی ٹہنیاں اور پتے اکٹھے کئے۔ ماچس میرے پاس تھی۔ میں نے آگ روشن کر دی اور اور ذرا پرے ہو کر بیٹھ گیا۔ دھوئیں کی وجہ سے مچھروں سے کافی حد تک نجات مل گئی۔ تین چار گھنٹے سو چکا تھا۔ نیند بالکل نہیں تھی۔ اردگرد خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جھیل کے کنارے اونچے اونچے درخت اندھیری رات میں جن بھوتوں کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ جس طرف دن کے وقت دور گاؤں کے جھونپڑے نظر آتے تھے اس طرف کہیں کوئی روشنی جھلملاتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس خیال سے دل کو تھوڑا اطمینان تھا کہ ابھی برما کے اصلی جنگل شروع نہیں ہوئے اس لئے جنگلی درندوں سے یہ علاقہ محفوظ ہے۔

اس کے باوجود تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں بیٹھے بیٹھے پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا کہ کہیں کوئی ریچھ یا جنگلی درندہ میری طرف تو نہیں بڑھ رہا۔ آگ کا الاؤ آہستہ آہستہ بجھنے لگتا تو میں ادھر ادھر سے سوکھی ٹہنیاں اور پتے لا کر ڈال دیتا مگر میں ساری رات یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بار الاؤ کے شعلے بجھے تو میں وہیں بیٹھا رہا۔ الاؤ کی آگ اور دھوئیں کی وجہ سے مچھروں سے ضرور نجات مل گئی تھی۔ الاؤ میں آگ ابھی نہیں بجھی تھی۔ دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں نے کچھ سوکھے پتے اکٹھے کر کے الاؤ میں ڈالے اور وہیں زمین پر لیٹ گیا کہ اگر نیند آ جائے تو باقی رات کٹ جائے گی۔ بہت دیر تک مجھے نیند نہ آئی۔ چونکہ مچھر وہاں نہیں تھے اس لئے کچھ وقت کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ مجھے معلوم تھا کہ پیچھے سے جو قافلہ آ رہا ہے اس نے بھی رات کے وقت کہیں پڑاؤ ڈالا ہو گا اور وہ یہاں دن کے وقت ہی پہنچے گا۔

مجھے ایک بار پھر نیند آ گئی۔

اب دوبارہ آنکھ کھلی تو دھوپ درختوں کی شاخوں میں سے چھن کر میرے اوپر آ رہی تھی۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سورج کافی اوپر آ چکا تھا۔ آس پاس کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جھیل پر جا کر منہ ہاتھ دھویا، پاؤں دھوئے۔ جوتا جو پھٹ گیا اس کی رسی کھول کر کپڑے کو دوبارہ اچھی طرح سے لپیٹا۔ رسی

باندھی اور ایک جھونپڑے کے باہر بیٹھ کر پیچھے رنگون کی طرف سے آنے والے کسی قافلے کا انتظار کرنے لگا۔

میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ خیال آیا کہ دیہات قریب ہی ہے۔ کیوں نہ وہاں سے کچھ کھا پی لوں۔ پھر پتہ نہیں قافلے کے ساتھ آگے جا کر کچھ کھانے کو ملے یا نہ ملے۔ پیسے میری جیب میں تھے۔ مجھے اس بات کی بھی تسلی تھی کہ پیچھے سے رنگون کے مہاجرین کا جو قافلہ بھی آیا وہ جھیل کے پاس تھوڑی دیر قیام ضرور کرے گا۔ اتنی دیر میں میں واپس آ کر قافلے میں شامل ہو جاؤں گا۔

یہ سوچ کر میں گاؤں کی طرف چل پڑا۔

گاؤں زیادہ دور نہیں تھا۔ دس بارہ جھونپڑیاں تھیں۔ ایک جگہ جھیل سے پکڑی ہوئی مچھلیاں سکھانے کو ڈالی ہوئی تھیں۔ کچھ آدمیوں نے میری طرف دیکھا تو میں ان کے پاس چلا گیا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں سے مہاجرین کے قافلے گزرتے ہیں۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں انہیں بتایا کہ میں قافلے سے بچھڑ گیا ہوں اور اگر کچھ کھانے کو مل جائے تو میں اس کے پیسے ادا کر دوں گا۔ ان لوگوں نے مجھے مچھلی اور چاول کھانے کو دیئے ہیں۔ میں نے انہیں پیسے دینے چاہے تو انہوں نے نہ لئے اور میری طرف دیکھ کر مسکراتے رہے۔ میں واپس جھیل کے پاس آ کر قافلے کا انتظار کرنے لگا۔ میں کافی دیر بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ کوئی قافلہ نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی خیال آیا کہ ہو سکتا ہے اس روٹ پر پیچھے سے کوئی قافلہ نہ آیا ہو۔ مگر میں اکیلا آگے بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ آگے جانے والے لوگوں نے جنگل میں ایک راستہ ضرور بنا لیا تھا مگر اسی پر اکیلے سفر کرنے میں مجھے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ اسی سوچ بچار میں سورج مغرب کی طرف ٹیلوں کے پیچھے چھپ گیا۔ شام کا وقت ہو رہا تھا۔ اب تو میں بالکل ہی آگے نہیں جا سکتا تھا۔ میں نے اسی جھونپڑے میں رات بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گاؤں میں جا کر تھوڑے بہت ابلے ہوئے چاول وغیرہ کیلے کے پتوں میں لپیٹ کر لے آیا۔ رات کا اندھیرا چھانے لگا تو میں نے مچھروں اور جنگلی جانوروں سے بچنے کے لئے آگ روشن کر دی۔ الاؤ سے کچھ دور بیٹھ کر تھوڑے سے چاول کھائے اور باقی کیلے کے پتے میں لپیٹ کر رکھ لئے کہ صبح کو کام آئیں گے۔
ایک بار پھر پہاڑ ایسی رات سامنے تھی۔ میں مناظر قدرت سے محبت کرتا تھا

مگر اس وقت درختوں کی طرف دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اپنا گھر، ماں باپ اور بہن بھائی یاد آ رہے تھے۔ سوچتا کہ کیا میں زندہ سلامت ان لوگوں کے پاس پہنچ سکوں گا؟

رات نہ جانے کتنی گزر چکی تھی کہ ہوائی جہازوں کی گونج سنائی دی۔ میں نے اوپر درختوں کی طرف دیکھا اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کچھ جہاز اوپر سے گزر گئے۔ یہ رنگون کی طرف جا رہے تھے۔ یہ جاپانی جہاز ہی ہو سکتے تھے جو رنگون پر بمباری کرنے جا رہے تھے۔ جہاز گزر گئے تو ایک بار پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ الاؤ کی آگ بجھنے لگی تھی۔ میں نے جھاڑیوں کی کچھ شاخیں توڑ کر الاؤ میں ڈال دیں' اس سے دھواں اٹھنے لگا۔ اس دھوئیں کی وجہ سے مچھروں سے نجات مل جاتی تھی۔ میں وہیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا کسی وقت درختوں طرف سے ایسی آہٹ سی محسوس ہوتی جیسے کوئی میری طرف دبے پاؤں چلا آ رہا ہو۔ اٹھ کر دیکھتا تو کوئی بھی نہ ہوتا پھر لیٹ جاتا۔ پھر کسی وقت مجھے نیند آ گئی۔ ایسی نیند آئی کہ سورج نکل آیا تھا جب آنکھ کھلی۔ یہ دیکھ کر میری پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا کہ رنگون سے آنے والے کسی قافلے کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ میں نے جو چاول کیلے کے پتے میں لپیٹ کر الاؤ کے پاس ہی پتھروں میں چھپا کر رکھے تھے رات کو کسی جانور نے نکال کر کھا لئے تھے۔ کیلے کے پتے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ میں نے جھیل پر جا کر پانی پیا منہ ہاتھ دھویا اور یہ سوچ کر ایک بار پھر قریبی گاؤں کی طرف چل پڑا کہ تھوڑا بہت کھا کر بھوک مٹالوں - پھر سوچوں گا کہ مجھے قافلے کا انتظار کرنا چاہئے یا اکیلے ہی چل پڑنا چاہئے

جب میں گاؤں کے قریب پہنچا تو مجھے گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ آواز دور سے آ رہی تھی میں سمجھا کہ جاپانی جہاز رنگون پر بمباری کرنے آ رہے ہیں۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ گڑگڑاہٹ کی آواز بھی رک گئی تھی۔ گاؤں کی مختصر سی جھونپڑیاں کھلی جگہ پر صاف نظر آ رہی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے برمی مرد اور عورتیں جھونپڑیوں سے نکل نکل کر ایک طرف دیکھ رہے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا کہ یہ کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں چلتے چلتے ان کے پاس آ گیا جیسے ہی میں ان کے پاس آیا سامنے والے اور دونوں پہلوؤں کے درختوں میں سے فوجی وردیوں والے چھوٹے قد کے آدمی عجیب آوازیں نکالتے دوڑتے ہوئے نکلے اور انہوں نے ایک دو سیکنڈ کے اندر ہمیں گھیرے میں لے لیا۔ یہ جاپانی فوجی تھے۔

انہوں نے آتے ہی مردوں کو دھکے دے کر گرانا شروع کر دیا۔ ایک فوجی نے میری طرف دیکھا تو میری طرف رائفل تان کر چیخ کر کچھ کہا اسکی آواز پر تین چار فوجی دوڑ کر وہاں آگئے۔ ان میں ان کا ایک فوجی افسر بھی تھا جس کے کندھے پر مختلف نشان لگے تھے

اس جاپانی افسر نے مجھے گھور کر دیکھا اور شکستہ اردو میں پوچھا۔

"تم ہندوستانی"۔

میں کیسے کہتا کہ میں ہندوستانی نہیں ہوں اور برمی ہوں مجھے معلوم تھا کہ جاپانی برمیوں کے ساتھ نسبتاً" بہتر سلوک کرتے۔ شکل سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ میں برمی نہیں ہوں بلکہ ہندوستان کا رہنے والا ہوں۔ میں ایک تو اتنے سارے جاپانی فوجیوں کو اچانک یلغار کرتے دیکھ کر حیران پریشان ہو گیا تھا۔ میں کچھ بولا بھی نہیں تھا کہ جاپانی افسر نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ میں گرتے گرتے سنبھل گیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب زندگی کے ایک دو لمحے ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اس نے مجھے گریبان سے پکڑ کر ایک جاپانی فوجی کی طرف دھکا دے کر اپنی زبان میں اسے کچھ آرڈر کیا۔ جاپانی فوجی نے اسی وقت میرے ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دیئے اور مجھے دھکیلتا ہوا درختوں کی طرف لے گیا۔ درختوں میں آکر میں نے دیکھا کہ وہاں ایک ٹینک اور تین فوجی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مجھے ایک گاڑی میں دھکا دے کر گاڑی کا دروازہ بند کر دیا گیا۔

ٹینک کے اوپر دو جاپانی فوجی رائفلیں تانے بیٹھے تھے۔ تین چار جاپانی فوجی گاڑیوں کے آس پاس درختوں کی آڑ لے کر بیٹھے تھے۔ جس گاڑی میں مجھے بند کیا گیا تھا اس کی اگلی سیٹ پر بھی دو مسلح جاپانی بیٹھے تھے۔ میں ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

میں جاپانی فوج کا قیدی بن چکا تھا۔ ابھی تک میں نے جاپانی فوج کے اس ظلم اور درندگی کی کہانیاں اور واقعات اخباروں اور رسالوں میں نہیں پڑھے تھے جو وہ اپنے جنگی قیدیوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ کیونکہ ابھی ایسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات اخباروں کی زینت نہیں بنے تھے۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ ان لوگوں نے اگرچہ مجھے پکڑ لیا ہے لیکن جب میں جاپانی افسر کو بتاؤں گا کہ میں کوئی فوجی نہیں ہوں بلکہ ایک بے ضرر شہری ہوں تو مجھے چھوڑ دیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مجھ سے یہی پوچھیں گے کہ رنگون میں انگریزوں نے کہاں کہاں اپنے فوجی گیریزن بنائے

ہوئے ہیں۔ انگریزوں کا ایک فوجی گیریزن میں نے دیکھا ہوا تھا یہ رنگون سے کوئی دو ایک میل دور میکائے میں تھا۔ میں انہیں فوراً" ان کے بارے میں بتادوں گا کہ وہ کس جگہ پر ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے چھوڑ دیں گے۔ میں صرف اسی وجہ سے پریشان ہو رہا تھا کہ رنگون سے مجھے دوبارہ پیدل چل کر اس مقام تک آنا پڑے گا۔

گاڑی میں سے مجھے گاؤں کے جھونپڑے دکھائی دے رہے تھے۔ جاپانی فوجیوں نے ان جھونپڑوں کی تلاشی لی مگر سوائے گاؤں والوں کو دھکے دینے کے انہیں کچھ نہ کہا اور واپس آکر فوجی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ مختصر سا فوجی قافلہ آگے کی طرف چل پڑا۔ میری گاڑی میں بھی چھ سات جاپانی آکر بیٹھ گئے تھے اور میری طرف دیکھ کر آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ان کا جاپانی افسر کسی دوسری گاڑی میں بیٹھا تھا۔ وہ جاپانی افسر اردو تھوڑی تھوڑی بول لیتا تھا مگر یہ جاپانی فوجی صرف جاپانی میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک جاپانی نے میری جیبوں کی تلاشی لی۔ میں نے کرنسی نوٹ اپنی کمر سے کھول کر پتلون کی جیب میں رکھ لئے ہوئے تھے اور چاقو بھی جیب میں ہی تھا۔ اس نے میرے نوٹ اور چاقو نکال لئے۔ چاقو کھول کر اس نے ہوا میں لہرایا اور پھر اسکی نوک میری گردن پر رکھ دی۔ میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ سب جاپانی قہقہے لگانے لگے اس نے چاقو بند کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور کرنسی نوٹ آپس میں وہیں بانٹ لئے۔ اب میرے پاس سوائے تین کپڑوں کے اور کچھ نہیں تھا۔

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ابھی برما کے گنجان جنگل شروع نہیں ہوئے تھے اور یہ رنگون سے شمال کی طرف کوئی چالیس پچاس میل کا علاقہ تھا جہاں درخت، جنگلی جھاڑیاں اور تالاب جھیلیں تو ضرور تھیں مگر یہ جنگل نہیں تھا۔ ٹینک ہمارے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ گاڑیاں اس رفتار سے چل رہی تھیں کہ ٹینک پیچھے رہ جائے۔ ٹینک کے اوپر دونوں جاپانی رائفلیں سیدھی کر کے اب لیٹے ہوئے تھے کہ جنگل سے اگر کوئی فائر آئے تو انہیں نہ لگے اور وہ جوابی فائر کر سکیں۔ گاڑیاں ایک جگہ ناریل کے اونچے اونچے درختوں کے درمیان آئیں تو دو دیہاتی قسم کے برمی ایک طرف سے نکل کر سامنے آگئے۔ وہ ہاتھوں سے کچھ اشارے کر رہے تھے۔ اگلی گاڑی میں جاپانی افسر بیٹھا تھا۔ گاڑی رک گئی۔ جاپانی افسر باہر نکل کر برمیوں سے باتیں کرنے لگا۔ برمی دیہاتی ہاتھ سے ایک طرف اشارہ کر رہے تھے۔ وہ جاپانی فوجیوں کی راہ نمائی کر رہے تھے۔ گاڑیاں وہاں سے ایک طرف ہو کر جھاڑیوں پر سے گزرتی ایک چھوٹی سی سڑک

پر آگئیں۔ برمی دیہاتی جاپانیوں کو اس سڑک کے بارے میں اطلاع دے رہے تھے۔ سڑک کچی تھی۔ تینوں فوجی گاڑیاں اور ٹینک اس سڑک پر چل پڑے۔ ان کا رخ رنگون شہر کی طرف تھا۔

دن کا وقت تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کافی دیر تک فوجی گاڑیاں چلتی رہیں۔ ایک جگہ بہت بڑی ندی کا پل عبور کیا۔ اس کے بعد رنگون شہر کے باہر کا علاقہ شروع ہوگیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ ابھی رنگون یہاں سے کافی دور تھا۔ یہاں ہمیں راستے میں کئی جاپانی فوجی ٹرک ملے۔ ان میں جاپانی فوجی کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر وہ نعرے لگاتے اور ہاتھ ہلاتے۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ ہوگیا ہے۔ اس کا ثبوت رنگون شہر پہنچ کر مل گیا۔ سڑکوں پر برمی جلوس نکال کر جاپانی فوجیوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ہندوستانیوں کے مکان اور دکانیں لوٹی جا رہی تھیں۔ جگہ جگہ گھروں اور دکانوں کا ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا تھا۔ سڑک میں جہاں کوئی چوک آتا وہاں دو تین جاپانی فوجی ٹرک کھڑے دکھائی دیتے۔ ایک جگہ سڑک کنارے درختوں کے نیچے میں نے دو جاپانی ٹینک بھی دیکھے۔ ٹینک ہم سے الگ ہوگیا تھا اور تینوں جاپانی گاڑیاں ایک دوسری کے پیچھے کسی فوجی کیمپ کی طرف دوڑتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ رنگون کا شمالی علاقہ تھا جو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

گاڑیاں ایک جگہ سے گزریں جہاں دونوں جانب درختوں میں گھری ہوئی کوٹھیاں اور بنگلے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ سارے بنگلے کوٹھیاں خالی ہیں۔ یہاں کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فوجی گاڑیاں ایک چھوٹی سڑک پر آئیں تو میں نے اس سڑک کو پہچان لیا۔ اس کی پہچان اس طرح سے ہوئی کہ سڑک کی ایک جانب مہاتم بدھ کا بہت بڑا مجسمہ لیٹا ہوا تھا۔ یہ اتنا بڑا مجسمہ تھا کہ اس کے پاؤں کے ایک انگوٹھے کے نیچے کسی نے چائے کا کھوکھا بنایا ہوا تھا۔ یہ سیلز بیریکس کا علاقہ تھا۔ یہاں برٹش انڈیا آرمی کا سپلائی کا ڈپو ہوا کرتا تھا اور میں ریڈیو رنگون کی اردو سروس کے انچارج ملک صاحب کے ساتھ یہاں دو تین مرتبہ آچکا تھا اور جب بھی اس سڑک پر سے گزرتا تو مہاتما بدھ کے آرام کرتے مجسمے کو بڑی محبت سے دیکھا کرتا تھا۔ اس فو سپلائی ڈپو پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ ادھر ادھر جاپانی فوجی ٹرک اور جیپیں کھڑ تھیں۔ جاپانی سپاہی چل پھر رہے تھے۔ ڈپو کے پیچھے جاپانیوں نے ایک مختصر سا

قیدیوں کا کیمپ بنایا ہوا تھا۔ مجھے گاڑی سے اتار کر اس کیمپ میں داخل کر دیا گیا۔ میرے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ یہاں بانس کے چھ سات چھوٹے چھوٹے جھونپڑے بنے ہوئے تھے' جن کے باہر جنگی قیدی مختلف کام کر رہے تھے۔ یہ سب انڈین تھے۔ کچھ پھٹی پرانی فوجی وردیوں میں تھے اور کچھ سویلین کپڑوں میں تھے۔ مجھے ایک پھاوڑا دے دیا گیا اور میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ ایک جگہ مٹی کے ڈھیروں کو ہموار کرنے میں لگ گیا۔ ہمارے گرد جاپانی سپاہی رائفلیں اٹھائے پہرہ دے رہے تھے۔ کیمپ کے اردگرد بھی خاردار تار کا جنگل لگا تھا۔

مجھ سے دس پندرہ قدموں کے فاصلے پر ایک ہندوستانی فوجی کام کررہا تھا۔ ہم نے سرسری طور پر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کوئی بات نہ کی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے بعد ہمیں ڈبل روٹی کے دو دو سوکھے ٹکڑے اور پتلا شوربہ دیا گیا۔ ہم وہیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ کر کھانے لگے۔ میرے قریب جو ہندوستانی سپاہی تھا ، اس کی مونچھیں تھیں۔ چہرے کی ہڈیاں چوڑی تھیں۔ وہ پنجابی لگ رہا تھا۔ اب ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت تھی۔ جاپانی سپاہی ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور سگریٹ پی رہے تھے۔ میں نے فوجی وردی والے قیدی سے اردو میں پوچھا۔

"کیا آپ کا تعلق پنجاب کی رجمنٹ سے ہے؟"

فوجی نے آہستہ سے پنجابی میں جاپانیوں کو گالی دے کر کہا۔"کوئی پتہ نہیں"۔

پھر اس نے بتایا کہ وہ برٹش انڈیا آرمی کی سپلائی کور کا حوالدار میجر ہے اور اسکا نام صوبہ خان ہے اور وہ دینہ ضلع جہلم کا رہنے والا ہے۔ میں نے بھی اسے بتایا کہ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں اور رنگون کے اخبار کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ رنگون پر بمباری کے بعد قافلے کے ساتھ جا رہا تھا کہ راستے میں جاپانیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ صوبہ خان کہنے لگا۔

"بات کرتے ہوئے زیادہ میری طرف منہ نہ کرو۔ منہ نیچا کر کے کھاتے رہو اور آہستہ آہستہ بات کرتے جاؤ۔"

جب میں نے اسے کہا کہ کیا ہم یہاں سے فرار نہیں ہو سکتے تو حوالدار نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

"میں دو دن سے سوچ رہا ہوں۔ تم بھی سوچو۔ موقع ملا تو ضرور بھاگ نکلیں گے۔"

مگر دوسرے دن ہی وہاں جتنے دس بارہ جنگی قیدی تھے انہیں ایک ٹرک میں ڈال کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ میں اور حوالدار صوبہ خان بھی اس ٹرک میں تھے۔ ہم سب کے پاؤں میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے گئے تھے جس کی وجہ سے چلنا مشکل ہو گیا تھا۔ بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ رات کے وقت ہمارا ٹرک رنگون سے روانہ ہوا تھا۔ ساری رات ٹرک چلتا رہا۔ دوسرے دن جنگل میں ایک جگہ رکا۔ ہمیں نیچے اتار کر ہمیں تھوڑا بہت کھانے کو دیا گیا۔ یہاں ہمیں ایک دوسرے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

ہمارے آگے پیچھے دو فوجی ٹرک تھے جن پر مسلح جاپانی سپاہی سوار تھے۔ ان کی مشین گنوں کا رخ ہمارے ٹرک کی طرف تھا۔ دوپہر کے بعد جنگل میں ایک ایک جگہ پہنچ کر فوجی ٹرک رک گئے جہاں درختوں کو کاٹ کر سڑک بنائی جا رہی تھی۔ یہاں پہلے ہی سے سو ڈیڑھ سو کے قریب جنگی قیدی کام کر رہے تھے۔ ہمیں بھی کام پ لگا دیا گیا۔ ہم سارا دن درختوں کی کٹائی کرتے۔ انہیں ایک طرف لگا کر سڑک کے لئے راستہ ہموار کرتے اور جھاڑیاں صاف کرتے۔ یہاں بانس کی چھت والی ایک لم بیرک بنی ہوئی تھی۔ رات کو ہمیں اس میں بھیڑ بکریوں کی طرح دھکیل دیا جاتا۔ دا نکلتے ہی جاپانی سپاہی رائفلیں تانے اندر آکر ٹھڈے مار کر ہمیں جگاتے اور ہمار مشقت شروع ہو جاتی۔ سورج غروب ہونے تک مشقت جاری رہتی۔ اس دورا ہمیں تھوڑا سا پانی، تھوڑا سا پتلا شوربہ اور سوکھی ڈبل روٹی کے دو تین ٹکڑے کھا کو دیئے جاتے۔ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی کیمپ میں جگہ جگہ بڑے بڑ بلب روشن ہو جاتے اور دن کی طرح روشنی ہو جاتی۔ اس جنگی قیدی کیمپ کے ا گرد بھی کانٹے دار تار کی اونچی دیوار بنی ہوئی تھی جس کے اندر اور باہر کی جانب وقت جاپانی سپاہی گشت لگاتے رہتے تھے۔ جس وقت ہم مشقت کر رہے ہوتے تھ اس وقت بھی جاپانی سپاہی رائفلیں سنبھالے بڑے چوکس ہو کر ہماری نگرانی کر تے۔

اس کیمپ میں برٹش انڈیا کی فوج کے سپاہی بھی تھے جن میں سکھ بھی اور سویلین بھی تھے۔ یہ سویلین بھی میری طرح جاپانیوں کے قابو آگئے تھے اور ا

جنگی قیدیوں کے ساتھ مشقت پر لگا دیا گیا تھا۔

میں بچپن ہی سے سخت جانیوں کا عادی تھا مگر جس قسم کی مشقت مجھے جاپانیوں کی قید میں رہ کر کرنی پڑ رہی تھی اس نے ایک ہفتے میں ہی مجھے نڈھال کر دیا اور میں وہاں سے بھاگنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ حوالدار صوبہ خان مجھ سے الگ ہو گیا تھا اور دن کے وقت سڑک پر کام کرتے ہوئے کبھی کبھار اس کی شکل دور ہی سے نظر آتی تھی۔ اب مجھے اکیلے ہی وہاں سے بھاگنا تھا۔ میں نے ماحول کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ سب سے بڑی مشکل کانٹے دار تار کی تھی جس کی ڈیڑھ میٹر اونچی دیوار قیدی کیمپ کے چاروں طرف کھنچی ہوئی تھی۔ اس دیوار کے اندر اور باہر دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی جاپانی سپاہی رائفلیں لئے گشت لگاتے رہتے تھے۔ رات کو اونچی مچانوں پر سرچ لائٹیں روشن دیوار کے آس پاس گردش کرتی رہتی تھیں۔ اس قسم کے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں قید ہونے کا یہ میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا۔ خاردار تاروں کی دیوار میں سے نکلنے کی ذرا سی جگہ بھی نہیں تھی۔ قیدی کیمپ کا صرف ایک گیٹ تھا جس کی دونوں جانب مشین گن پوسٹیں تھیں۔ یہاں ہر وقت فوجی پہرہ لگا رہتا تھا۔ دن کے وقت جب قیدی مشقت کر رہے ہوتے تھے تو جاپانی سپاہی رائفلیں لئے ان کے سروں پر موجود ہوتے تھے۔ وہاں سے بھاگنے کی کوئی ترکیب میرے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ مشقت کرتے وقت ہمارے پاؤں میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے جاتے تھے۔ اس طرح کوئی قیدی بھاگ نہیں سکتا تھا۔ رات کو کڑے اتروا لئے جاتے اور جاپانی سپاہی گشت لگاتے رہتے۔ بیرک کا ایک ہی دروازہ تھا جو باہر سے بند کر کے تالا لگا دیا جاتا تھا۔ بیرک کی چھت بانس کی تھی۔ دیواریں لکڑی کی تھیں۔ جن کی اونچی کھڑکیوں میں بھی سلاخیں لگی تھیں۔ رات کے وقت بیرک کے اندر بھی جاپانی سپاہی چل پھر کر پہرہ دیتے تھے۔ رات کو جیسے ہی قیدی لمبی بیرک میں داخل ہوتے بیرک کی روشنیاں گل کر دی جاتیں۔ سب کو آرڈر تھا کہ روشنی کے بجھتے ہی قیدی سو جائیں اور ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کریں۔

اس دوران ایک دردناک واقعہ ہو گیا۔ ایک سویلین قیدی نے دن کے وقت مشقت کے دوران فرار ہونے کی کوشش کی تو اسے جاپانی سپاہیوں نے تھوڑے فاصلے پر ہی پکڑ لیا۔ اسے پکڑ کر جہاں سڑک بن رہی تھی وہاں ایک جگہ لا کر بٹھا دیا گیا۔ پھر سارے قیدیوں کو جمع کیا گیا۔ ایک جاپانی افسر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا کہ

اس قیدی نے کیمپ سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اس کو اس کی سزا دی جائے گی۔ میں بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ بدنصیب سویلین قیدی کو دوزانو بٹھا کر اس کے دونوں ہاتھ رسی سے پشت پر باندھ دیئے گئے۔ پھر ایک جاپانی سپاہی لمبی تلوار لے کر پیچھے سے بدنصیب قیدی کے پہلو کی طرف آیا۔ دونوں ہاتھوں سے تلوار کا دستہ پکڑ کر تلوار کو اوپر اٹھایا اور ایک ہی بھرپور وار سے قیدی کی گردن الگ کر ڈالی۔ کئی سویلین قیدیوں کی چیخیں نکل گئیں۔ میرا تو دہشت کے مارے بدن ٹھنڈا پڑ گیا۔ جاپانی افسر نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں باقی قیدیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھو۔ جو قیدی بھاگے گا۔ ہم اسے پکڑ کر اسی طرح اس کی گردن کاٹ دیں گے۔"

اس المناک واقعے کے بعد مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں نے وہاں سے فرار ہونے کا خیال ترک کر دیا۔ دس بارہ دن گزر گئے۔ سڑک پر اب بجری بچھائی جا رہی تھی۔ ایک روز مشقت کے دوران میں سڑک پر ایسی جگہ پر آ گیا جہاں پنجاب رجمنٹ کا حوالدار صوبہ خان مجھ سے تھوڑے فاصلے پر ہی کام کر رہا تھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کا حال پوچھا اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

دوپہر کو کھانا تقسیم ہونے لگا تو میں کھسکتا ہوا حوالدار کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ ہم سر جھکائے کچھ دیر خاموشی سے باسی چاول کھاتے رہے۔ جاپانی سپاہی ذرا دور بیٹھے سگریٹ وغیرہ پی رہے تھے۔ میں نے موقع دیکھ کر حوالدار صوبہ خان سے کہا۔

"جاپانی بڑے ظالم ہیں۔ اس بے چارے کی گردن کاٹ ڈالی۔"

حوالدار نے میری طرف نظر اٹھائے بغیر آہستہ سے پنجابی میں کہا۔

"وہ سویلین تھا۔ اسے پتہ نہیں تھا کہ فرار کے لئے سکیم بنانی پڑتی ہے۔"

میں نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔

"کیا سکیم ہو سکتی ہے؟"

حوالدار بولا۔

"پھر کسی وقت بتاؤں گا۔ ابھی خاموش رہو۔ جاپانی ہماری طرف دیکھ ر ہے۔"

اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی۔ حوالدار صوبہ خان

سے یہ سن کر کہ وہ فرار کی سکیم تیار کر سکتا ہے میرے دل میں امید کی کرن دوبارہ روشن ہو گئی تھی۔ حوالدار فوجی تھا اور فوجیوں کو معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کی قید سے کس طرح فرار ہوا جاتا ہے۔ کم از کم میں یہی سمجھ رہا تھا کہ حوالدار کو معلوم ہو گا۔ اس بات کو بھی کئی دن گزر گئے۔ حوالدار سے ملنے کا موقع نہ مل سکا۔ میرے دل میں قیدی کیمپ سے فرار ہونے کی جو امید کی کرن روشن ہوئی تھی وہ آہستہ آہستہ بجھ گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے قدرت کو یہی منظور ہے۔ میں نے اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر دیا۔

ایک دن ایک عجیب واقعہ ہو گیا۔

دن کے وقت مجھے مشقت کے لئے سڑک کے ایک ایسے حصے پر لگا دیا گیا جہاں سڑک ایک چھوٹے سے ٹیلے کے دامن سے ہو کر مڑ جاتی تھی۔ یہاں ایک گہرا گڑھا تھا۔ یہ جگہ ذرا نیچے تھی۔ میرا کام اوپر روڑی کے ڈھیر سے ٹوکری میں روڑی بھر کر لانا اور اس گڑھے میں ڈال کر اسے کوٹنا تھا۔ دوسرے قیدی مجھ سے ذرا فاصلے پر کام کر رہے تھے۔ ایک جاپانی سپاہی اوپر روڑی کے بہت بڑے ڈھیر کے قریب چل پھر کر میرے کام کی نگرانی کرتا تھا۔ ویسے بھی میرے پاؤں میں لوہے کے کڑے پڑے تھے اس لئے جاپانیوں کو معلوم تھا کہ میں بھاگ نہیں سکتا۔ اگر بھاگا بھی تو فوراً پکڑ لیا جاؤں گا۔ میں نے بھی دل سے بھاگنے کا خیال نکال دیا تھا اور خاموشی سے اپنے کام میں لگا رہتا تھا۔ جہاں میں روڑی کوٹتا تھا وہاں نشیب میں ایک پہاڑی نالہ بہتا تھا۔ یہ نالہ چھوٹی سی ندی کی طرح تھا۔ پانی اوپر سے آ کر ندی میں گرتا تھا۔ یہاں دن کے وقت کبھی کبھی کسی قریبی دیہات کی بوڑھی بری عورتیں آ کر کپڑے وغیرہ دھویا کرتی تھیں۔ یہ عورتیں مجھے صاف نظر آتی تھیں مگر میں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ وہ عورتیں بھی ہماری طرف کم ہی دیکھتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اوپر سڑک پر جنگی قیدی کام کر رہے ہیں۔ وہ کچھ دیر ندی کے کنارے بیٹھ کر کپڑے وغیرہ دھوتیں اور پھر چلی جاتیں۔

مجھے اس مقام پر روڑی کوٹتے دوسرا دن تھا۔ دوپہر کے بعد کا وقت تھا کہ کام کرتے کرتے میں نے ذرا دم لینے کے لئے اور منہ پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے کے لئے کمر سیدھی کی تو میری نگاہ نیچے ندی کی طرف چلی گئی۔ وہاں میں نے ایک لڑکی کو کپڑے دھوتے دیکھا تو اس کا چہرہ اور جسم مجھے شناسا سا لگا۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا

تو میرے دل کی دھڑکن اچانک تیز ہو گئی۔ میں نے اس طرف سے نظریں ہٹالیں اور روڑی کوٹنے لگا۔ اس لڑکی کو میں نے پہچان لیا تھا۔ یہ وہی لڑکی ہو سکتی تھی جس کی وہاں موجودگی کا مجھے وہم و گمان تک نہیں تھا۔ میں نے کام کرتے کرتے اوپر نگاہ ڈالی۔ میری نگرانی کرنے والا جاپانی سپاہی روڑی کے ڈپو کے پاس کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے جلدی سے گردن موڑ کر نیچے دیکھا۔

اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ ندی کنارے جو لڑکی کپڑے دھو رہی ہے وہ سائیں تھی۔ یعنی وہی لڑکی جو رنگون کے سولی پیگوڈا کی سیڑھیوں پر پھول بیچا کرتی تھی اور جس سے میں محبت کرنے لگا تھا۔ میں سائیں کو دیکھ رہا تھا اور اس کے نقوش زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ وہ سائیں ہی تھی۔ اب میں چاہتا تھا کہ وہ بھی میری طرف دیکھے۔ میں نے کام کرتے کرتے ایک روڑا اس کی طرف لڑھکا دیا۔ روڑا سائیں کے قریب ہی ندی میں گرا تو اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر اس طرف دیکھا جہاں سے یہ روڑا نیچے گرا تھا۔ اوپر میں کھڑا تھا اور مسلسل اس کی طرف تک رہا تھا۔ جب ہماری نگاہیں ملیں تو میں نے آہستہ سے ہاتھ نیچے کر کے ہلایا۔ میں نے دیکھا کہ سائیں اپنا جگہ پر ساکت سی ہو گئی تھی۔ کپڑے دھوتے دھوتے اس کے ہاتھ وہیں رک گئے تھے۔ پھر وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے میری اس دگرگوں حالت میں بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے اوپر نگاہ ڈالی۔ جاپانی سپاہی بدستور پشت میری طرف کئے سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے ہاتھ ہلا کر سائیں کو ایسا اشارہ کیا کہ وہ میرے قریب بالکل نہ آئے۔ ہمارا فاصلہ تیس چالیس گز کا ہو گا۔ سائیں نشیب میں تھی۔ وہ میرا اشارہ پاتے ہی جلدی سے بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ کپڑے دھونے لگے لیکن وہ مسلسل میری طرف چہرہ کئے دیکھ رہی تھی۔ اس خیال سے کہ کہیں سائیں جذبات میں آکر کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ جس سے جاپانی سپاہی کی توجہ اس طرف ہو جائے اور سائیں پر کوئی مصیبت نازل نہ ہو جائے۔ میں نے ٹوکری اٹھائی اور روڑی لینے اوپر چلا گیا۔ جب میں ٹوکری میں روڑی بھر کر اسے سر پر اٹھائے نیچے اتر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ سائیں وہاں نہیں تھی۔ وہ چلی گئی تھی۔ میرا دل اداس ہو گیا۔ سائیں کو دیکھکر میرے بدن میں خوشی کی جو لہر دوڑ گئی تھی وہ بھی غائب ہو گئی۔ مجھے ایراوتی کے ملاحوں کا گیت یاد آنے لگا۔

ایراوتی! تو اتنی اداس کیوں ہے

تجھے کون سا غم ہے ایراوتی

اگر اس وقت ایراوتی کا کوئی ملاح یہ سوال مجھ سے کرتا تو میں اسے بتاتا کہ ایراوتی اداس کیوں ہے — صدیوں سے غمگین کیوں ہے — اسے کونسا غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ مگر میں ایراوتی کے دریا سے، ایراوتی دریا کے ملاحوں سے اور ان کے گیتوں سے بہت دور ہو چکا تھا۔ اتنی دور کہ نہ ایراوتی کے ملاحوں کے گیت مجھ تک پہنچ سکتے تھے اور نہ ایراوتی میری آواز سن سکتی تھی۔ ایک دریا تھا۔ ناقابل عبور دریا اور عبور دریائے شور کی سزا تھی۔

دوسرے روز مجھے دوبارہ اسی جگہ مشقت پر لگا دیا گیا۔ وہاں آتے ہی سب سے پہلے میری نظریں نشیب میں بہتے نالے کی طرف اٹھ گئیں۔ سائیں وہاں نہیں تھی وہاں کوئی بھی بری عورت نہیں تھی۔ میں بوجھل دل کے ساتھ کام کرنے لگا۔ اوپر ابھی روڑی کے ڈھیر لگے تھے۔ گڑھا ابھی نہیں بھرا تھا۔ میں تیسری یا چوتھی بار اوپر سے روڑی کی ٹوکری بھر کر نیچے لا رہا تھا کہ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ نالے پر سائیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ اس کا چہرہ میری طرف تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ اوپر کر کے ذرا سا ہلایا۔ میں نے گڑھے میں روڑی کی ٹوکری الٹ دی اور سب سے پہلے اوپر دیکھا کہ جاپانی سپاہی تو ہمیں نہیں دیکھ رہا تھا۔ مگر حسب معمول اسکی پیٹھ میری طرف تھی۔ میں نے سائیں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا جیسے اسے خوش آمدید کہہ رہا ہوں۔

مگر میں نے محسوس کیا کہ سائیں ہاتھ کے اشارے سے مجھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اوپر جاپانی سپاہی کو دیکھا۔ وہ دوسری طرف منہ کئے کسی قیدی کو اونچی آواز میں ڈانٹ رہا تھا۔ میں نے سائیں کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے نیچے بلا رہی تھی۔ وہ ہاتھ کو اوپر سے نیچے لے جاتی اور پھر اس کے قریب ہی جو چھوٹا سا ٹیلہ تھا ہاتھ کو اس کی طرف لے جاتی۔ جیسے کہہ رہی ہو اس ٹیلے کے نیچے آ جاؤ۔ وہ جو کچھ مجھے کہہ رہی تھی میں اس پر اتنی جلدی عمل نہیں کر سکتا تھا۔ اول تو میرے پاؤں میں لوہے کے کڑے پڑے ہوئے تھے۔ میں اتنی تیزی سے نیچے اتر کر ٹیلے کے پاس یا اس کے پیچھے نہیں جا سکتا تھا۔ دوسرے یہ خطرہ ہر لحہ میرے سر پر منڈلا رہا تھا کہ جاپانی سپاہی کی نظر کسی وقت بھی مجھ پر پڑ سکتی تھی۔ جیسے ہی اس نے مجھے گڑھے سے نکل کر نالے کی طرف جاتے دیکھا وہ اوپر سے

مجھ پر گولی چلا دے گا۔

میرے دماغ میں ایک ہل چل ضرور مچ گئی تھی۔ میرے سامنے فرار کا راستہ کھلا تھا۔ فرار کا دروازہ دو قدم کے فاصلے پر تھا مگر یہ دو قدموں کا فاصلہ مجھے موت کے پیٹ میں سے گزر کر طے کرنا تھا۔ میں لوہے کے دموسے سے روڑی کوٹ کر برابر کر رہا تھا اور کنکھیوں سے سائیں کو بھی دیکھ رہا تھا۔ وہ کپڑے دھوتے دھوتے میری طرف تھوڑی دیر کے لئے دیکھ لیتی تھی۔ اس کے چند لمحوں کے بعد میں نے نیچے دیکھا تو سائیں وہاں نہیں تھی۔ میری آنکھوں کے آگے جیسے ایکدم اندھیرے کا پردہ گر پڑا۔ اوپر سے جاپانی سپاہی نے مجھے شاید اپنی زبان میں گالی دے کر کچھ کہا۔ میں جلدی جلدی کام کرنے لگا۔ سارا دن گزر گیا۔ مگر سائیں دوبارہ دکھائی نہ دی۔ مجھے ایسے محسوس ہونے لگا جیسے میں نے اپنی زندگی کا ایک سنہری موقع کھو دیا ہے۔ اب میں کبھی وہاں سے نجات حاصل نہ کر سکوں گا۔ سورج غروب ہو جانے پر ہماری ایک جگہ گنتی ہوئی اور ہمیں معمول کے مطابق بیرک میں بند کر دیا گیا۔

ساری رات میں سخت الجھن کا شکار رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا کہ میں نے سائیں کے اشارے پر عمل کیوں نہ کیا۔ مجھے نیچے اتر جانا چاہیے تھا۔ سائیں کو معلوم تھا کہ میں جاپانیوں کی قید میں ہوں اور اس نے میرے فرار کا کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور ڈھونڈ نکالا ہوگا۔ وہ جاپانی سپاہی کی موجودگی سے بے خبر نہیں تھی۔ جاپانی سپاہی تو اسے مجھ سے زیادہ اوپر کھڑا نظر آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں جاپانی سپاہی کی آنکھ بچا کر نیچے بھاگ آؤں۔ اگرچہ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میرے پاؤں میں بیڑی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے سونے سے پہلے فیصلہ کر لیا کہ اگر کل مجھے سائیں وہاں مل گئی تو میں اس کا اشارہ پاتے ہی نیچے اتر جاؤں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ مرنا تو یہاں بھی ہے۔ مگر سسک سسک کر مرنے سے فرار کی کوشش کرتے ہوئے مر جانا زیادہ اچھا تھا۔ اس طرح کم از کم یہ امید تو تھی کہ میں فرار ہونے میں کامیاب ہو سکتا ہوں۔

میری قسمت میرا ساتھ دے رہی تھی۔ اگلے روز بھی مجھے اسی جگہ کام پر لگا دیا گیا۔ اس روز اس مقام پر کوئی دوسرا جاپانی سپاہی نگرانی پر تھا۔ میں نے وہاں آتے ہی سب سے پہلے نیچے دیکھا۔ سائیں نالے پر نہیں تھی۔ میں گہرا سانس بھر کر خاموشی سے اپنے کام پر لگ گیا۔ گڑھا کافی بھر چکا تھا اور یقینی بات تھی کہ دوپہر کے

بعد مجھے وہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کر دیا جانا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پھر میں سائیں کو اور سائیں مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں دل میں دعائیں مانگنے لگا کہ یا اللہ سائیں وہاں آ جائے۔ کیونکہ اس کے اشارے کے بغیر میں وہاں سے نیچے نہیں جا سکتا تھا۔ میں ٹوکری میں تھوڑی روڑی بھر کر گڑھے میں لے جاتا تھا کہ اسے بھرنے میں کافی دیر لگے۔ کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے سائیں نظر آ گئی۔ وہ ایک ٹوکری میں کپڑے رکھے آئی اور نالے کے پاس پتھروں پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے آتے ہی مجھے دیکھا۔ میں نے بھی اسے دیکھا۔ اس نے ہاتھ سے کوئی اشارہ نہ کیا۔ شاید اوپر سے جاپانی سپاہی اس کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اوپر نگاہ نہ اٹھائی اور روڑی کوٹنے میں لگا رہا۔ پھر خالی ٹوکری لے کر اوپر گیا۔ ٹوکری میں روڑی بھری اور جب آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا تو سائیں ہاتھ کے اشارے سے مجھے نیچے بلا رہی تھی۔ میں نے روڑی گڑھے میں الٹ دی اور اسے برابر کرنے لگا۔ ایک نگاہ سائیں پر ڈالی۔ وہ کپڑے نچوڑ کر ٹوکری میں رکھ رہی تھی۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے اس نے ٹوکری بغل میں دبائی اور نالے کی دوسری طرف جھاڑیوں کی طرف چل دی۔ میری امیدوں پر ایک بار پھر اوس پڑنے لگی۔ میرا جی چاہا کہ میں آواز دے کر سائیں سے کہوں۔

”سائیں! میں ابھی آ رہا ہوں۔ میں آ رہا ہوں خدا کے لئے ابھی نہ جانا۔“

میں اسے مشقت کرتے ہوئے آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ سائیں جھاڑیوں کی اوٹ میں جا کر چھپ کر بیٹھ گئی تھی اور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جب میں نے اپنا چہرہ اس کی طرف کیا تو اس نے دو تین بار زور زور سے ہاتھ ہلا کر مجھے اپنی طرف بلایا۔ یہ میری زندگی کی فیصلہ کن گھڑی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ نہیں سوچنا تھا۔ کچھ غور نہیں کرنا تھا۔ صرف فیصلہ کرنا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس پر عمل کر دینا تھا۔ یہ فیصلے کا عمل تھا یا عمل کا فیصلہ تھا۔ بس یوں سمجھ لیں کہ مجھے کھولتے ہوئے لاوے والے آتش فشاں پہاڑ کے دہانے کے اوپر سے چھلانگ لگا کر گزرنا تھا۔ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی ذرا سی بھول مجھے موت کی نیند سلا سکتی تھی۔

جیسے ہی سائیں نے جھاڑیوں کی اوٹ میں سے ہاتھ ہلا کر مجھے بلایا۔ میں نے اوپر سڑک کی طرف دیکھا۔ جاپانی سپاہی دوسری طرف منہ کئے پتھروں پر بیٹھا کسی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ میں تھاما ہوا بانس وہیں چھوڑا اور نشیب میں اترنے کی بجائے اپنے آپ کو نشیب کی جھاڑیوں میں لڑھکا دیا۔ میں اونچی گھاس اور جھاڑیوں پر گیند کی طرح لڑھکتا ہوا نیچے چلا گیا۔ نالے پر رکتے ہی میں وہیں ساکت ہو کر پڑا رہا۔ پھر اونچی گھاس میں سے اوپر دیکھا۔ جاپانی سپاہی اسی طرح میری طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ میں نے سائیں کی طرف دیکھا۔ وہ جھاڑی کی اوٹ میں سے اٹھ کر کچھ اور پیچھے چلی گئی تھی اور زور زور سے ہاتھ ہلا کر مجھے بلا رہی تھی۔ میں بجلی کی تیزی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا مگر بجلی کی تیزی کے ساتھ چل نہ سکا۔ پاؤں کی بیڑیاں مجھے تیز چلنے نہیں دے رہی تھیں۔ ان کی وجہ سے پہلے ہی میرے ٹخنے زخمی ہو کر سوج گئے تھے۔ بس جتنی تیز چل سکتا تھا چل کر میں ندی میں اتر گیا۔ پھر پانی میں سے گزرتا دوسرے کنارے پر پہنچا۔ پھر دوسرے کنارے سے نکل کر سائیں کی طرف بڑھا اور جیسے ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں سائیں کے پاس پہنچا میں گر پڑا۔

سائیں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے گھبرائی ہوئی آواز میں اپنی خاص ہندوستانی زبان میں کہا کہ جلدی اٹھو۔ اس طرف آ جاؤ۔ اس طرف آ جاؤ۔

میں فوراً سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سائیں تیز تیز چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اونچی اونچی جھاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ میں بھی اپنے بوجھل قدم اٹھاتا اس کے پیچھے پیچھے گھسٹتا جا رہا تھا۔ سائیں میرے آگے آگے جھاڑیوں اور اونچی گھاس کو ہٹاتی جلدی جلدی چل رہی تھی اور ہاتھ سے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ بھی کر دیتی تھی۔ یہاں کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ اونچی اونچی گھاس تھی اور جنگلی جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اوپر درختوں کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ جھاڑیاں ختم ہو گئیں۔ سامنے ایک ٹیلے کی ڈھلان تھی۔ سائیں وہاں سے نیچے اتر گئی۔ میں نیچے اترتے ہوئے گر پڑا اور نیچے

تک لڑھکتا چلا گیا۔ اب سائیں کو معلوم ہوا کہ میرے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں یا کڑے پڑے ہوئے ہیں۔ اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھا لیا اور میرا ہاتھ اپنے کاندھے پر رکھ کر مجھے چلانے لگی تو میں نے کہا۔

"میں چل سکتا ہوں سائیں۔ یہاں سے نکلنے کی کرو۔"

سائیں نے ٹیلے کی طرف اشارہ کیا اور کپڑے والی ٹوکری ہاتھ میں لٹکائے جہاں ٹیلے کی ڈھلان زمین کے ساتھ مل جاتی تھی وہاں آ کر رک گئی۔ میں بھی قدم قدم چل کر اس کے پاس آ گیا۔

عین اس وقت پیچھے کی جانب سے شور کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں سیٹیوں کی آواز بھی تھیں۔ پھر اوپر تلے تین چار فائروں کے دھماکے ہوئے۔ جاپانیوں کو میرے فرار کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے سائیں کی طرف گھبراہٹ میں دیکھا۔

"انہیں پتہ چل گیا ہے۔"

سائیں بھی ساری آوازیں سن رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"آ جاؤ۔ آ جاؤ۔"

ٹیلے کے نشیب میں زمین سے چند فٹ اوپر جھاڑیوں کی ایک دیوار سی بنی ہوئی تھی۔ وہ مجھے اس کے نیچے لے گئی۔ جھاڑیاں اتنی گھنی تھیں کہ ہمیں ہاتھوں کی مدد سے ٹہنیوں کو ادھر ادھر ہٹا کر راستہ بنانا پڑ رہا تھا۔ سائیں مجھے ان جھاڑیوں کے پیچھے چھپانا چاہتی تھی۔ مجھے اس کی سادگی پر رونا آ گیا۔ جاپانی بڑی آسانی سے ہم دونوں کو یہاں پکڑ سکتے تھے۔ میرے ساتھ سائیں بھی موت کے گھاٹ اترنے والی تھی۔ میں نے سائیں سے کہا۔

"سائیں، پلیز! تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو۔"

سائیں نے کوئی جواب نہ دیا اور جھاڑیوں کے پیچھے ہٹاتی گئی۔ جھاڑیاں ختم ہوئیں تو سامنے ایک غار کا دہانہ نمودار ہو گیا۔ یہ اوپر نیچے پڑے ہوئے تین چار بڑے بڑے پتھروں کی سلوں کے درمیان بنا ہوا تکونا سوراخ تھا۔ سائیں نے کپڑوں کی ٹوکری سوراخ کے اندر غار میں پھینک دی اور خود بھی رینگتی ہوئی اندر چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے رینگ کر غار میں گھس گیا۔ ہمارے اندر جاتے ہی جھاڑیاں واپس اپنی جگہ پر آ گئیں اور غار کے منہ کے آگے ایک دیوار سی بن گئی۔

میں غار میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہاں اندھیرا تھا۔ سائیں نے کہا۔

"میں موم بتی اور ماچس ساتھ لائی ہوں مگر یہاں موم بتی نہیں جلانی چاہئے میرا ہاتھ پکڑ کر چلے آؤ۔"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور غار میں چلنے لگی۔ غار کی فضا میں رطوبت اور حبس تھا۔ جاپانی سپاہیوں کی آوازیں اب دور سے آتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کے بعد کوئی فائر بھی نہیں ہوا تھا۔ ظاہر ہے جاپانی میری تلاش میں نکل پڑے تھے۔ ایک جگہ سائیں غار کے ساتھ گھوم گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے وہاں آچکی ہے اور اس نے مجھے جاپانیوں کی قید میں دیکھنے کے بعد اس غار میں میرے چھپنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ غار کا موڑ مڑتے ہی سائیں رک گئی۔ اس نے موم بتی روشن کر دی۔ یہ ایک قدرتی غار تھا جو پہاڑیوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ غار میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے سائیں سے کہا۔

"سائیں! جاپانی اس غار میں بھی آسکتے ہیں۔"

وہ کہنے لگی۔

"جہاں میں تمہیں لے جا رہی ہوں وہاں وہ نہیں آئیں گے۔"

جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ سائیں مجھ سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بات کرتی تھی جس کو اس زمانے میں ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ مجھے چونکہ اب اس کی ٹوٹی پھوٹی اردو پوری طرح سے یاد نہیں رہی اس لئے میں اس کے مکالموں کو سادہ اردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔

اس غار کے اندر ایک اور چھوٹا سا غار تھا جو بند ہو جاتا تھا اور بالکل ایک گپھا یا حجرے کی طرح تھا۔ اس میں داخل ہونے کا راستہ غار کی دیوار کے ذرا نیچے اتر کر آتا تھا۔ نیچے اترنے کے لئے پتھر کی ایک سل کو پیچھے ہٹانا پڑتا تھا۔ سائیں نے موم بتی ایک طرف لگا دی۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر سل کو ایک طرف ہٹایا۔ نیچے ایک شگاف تھا جس کے پہلو میں بند حجرہ تھا۔ ہم حجرے میں آگئے۔

سائیں نے یہاں پہلے سے ہی زمین پر ناریل کی چھال سے بنائی گئی صف بچھا رکھی تھی۔ ایک مٹی کے مٹکے میں پانی بھر کر رکھا ہوا تھا۔ حجرہ اگرچہ چاروں طرف سے بند تھا اور پتھر کی سل شگاف کے منہ پر رکھنے سے وہ اور زیادہ بند ہو گیا تھا مگر

اندر تازہ ہوا کا احساس ہو رہا تھا۔ میں صف پر بیٹھ گیا۔ سائیں نے موم بتی ایک پتھر پر لگا دی اور میرے پاس بیٹھ کر میرے پیروں کی بیڑیاں اور سوجے ہوئے ٹخنوں کو دیکھنے لگی۔

"میں یہاں لگانے کے لئے مرہم لاؤں گی۔ ہم زخموں پر لگانے کے لئے ایک جڑی بوٹی کوٹ کر اس کی مرہم بناتے ہیں۔ اس سے زخم بڑی جلدی اچھا ہو جاتا ہے۔"

اس نے مجھے مٹکے میں سے پانی نکال کر پلایا۔ کہنے لگی۔

"میں نے تمہیں دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ تم ہو۔ کیا تم نے بھی مجھے پہچان لیا تھا؟"

میں نے کہا۔

"ہاں سائیں۔ میں نے بھی تمہیں پہچان لیا تھا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں سائیں کو دیکھ رہا ہوں۔"

وہ بولی۔

"مجھے بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ اوپر جنگل میں جاپانیوں نے قیدیوں کے لئے کیمپ بنایا ہے اور سڑک پر قیدی لوگ کام کرتے ہیں۔ مگر مجھے تم یہاں مل جاؤ گے یہ مجھے خیال تک نہیں تھا۔"

پھر ہم رنگون پر جاپانی طیاروں کی بمباری کی باتیں کرنے لگے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ پہلی بمباری کے فوراً بعد میں اسے دیکھنے سولی پیگوڈا گیا تھا تو وہ کہنے لگی۔

"ہمارے ایک ماما نے ہمیں ایک دن پہلے کہہ دیا تھا کہ کل جاپانی جہاز رنگون پر بمباری کرنے آئیں گے۔ ہم ایک دن پہلے رنگون سے نکل گئے تھے۔"

میں نے اس سے پوچھا۔

"کیا تمہارا گاؤں یہاں سے قریب ہی ہے؟"

اس نے کہا۔

"نہیں۔ یہ ہمارا گاؤں نہیں ہے۔ جاپانیوں کے آجانے کے بعد میرے ماما مجھے اور ہم سب کو گاؤں سے نکال کر یہاں لے آئے تھے۔ یہاں میرے ماما کا ناریلوں کا باغ ہے۔ ہم لوگ دریا پر مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ دریا ہمارے گاؤں کے پاس

ہی بہتا ہے۔"

باہر سے آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے سائیں کو خاموش ہو جانے کا اشارہ کیا۔ یہ جاپانی فوجی تھے جو مجھے تلاش کر رہے تھے۔ وہ اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ جاپانیوں کو اس جنگل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ جس غار میں میں چھپا ہوا تھا اس کا منہ جھاڑیوں کی آڑ کی وجہ سے ویسے بھی باہر سے نظر نہیں آتا تھا۔ جاپانی فوجی آگے نکل گئے۔ جب ان کی آوازیں دور چلی گئیں تو میں نے سائیں سے کہا۔

"میں یہاں زیادہ دیر تک نہیں چھپ سکتا۔ گاؤں کے کسی آدمی نے جاپانیوں کو بتا دیا کہ یہاں ایک غار بھی ہے تو میں پکڑا جاؤں گا۔"

سائیں سوچ میں پڑ گئی۔ کہنے لگی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے گاؤں کے دو ایک آدمی جاپانی سپاہیوں کے پاس اکثر جاتے رہتے ہیں۔ لیکن تم فکر نہ کرو اگر کوئی ایسی بات ہوئی تو میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گی۔"

میں نے کہا۔

"سائیں! میں چاہتا ہوں کہ رنگون سے بنگال کی طرف جانے والے کسی قافلے میں شامل ہو جاؤں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں۔"

سائیں نے کہا۔

"ماما نے بتایا تھا کہ دریا پار ایسے قافلے سفر کر رہے ہیں۔ میں تمہیں دریا پار کرا دوں گی مگر ابھی تم اسی جگہ چھپے رہو۔ میں جاتی ہوں۔ تمہارے لئے کچھ کھانے کو لے کر جلدی آ جاؤں گی۔ یہاں سے باہر مت نکلنا۔"

سائیں چلی گئی۔ میں غار کے حجرے میں بیٹھا رہا۔ یہ حجرہ کسی بڑی قبر کی طرح لگ رہا تھا۔ مگر اس کی وجہ سے میری جان بچی ہوئی تھی۔ اندر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ دن ہے یا رات۔ موم بتی جل رہی تھی۔ میں نے اپنے پاؤں سے بیڑیوں کے کڑے نکالنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کافی دیر بعد سائیں آئی۔ وہ میرے لئے ابلے ہوئے چاول اور مچھلی لائی تھی۔ اس نے ٹوکری میں سے ناریل کے تیل کی شیشی نکالی اور کہا۔

"پاؤں آگے کرو۔ میں لوہے کے کڑوں میں سے تمہارے پاؤں نکالنے کی

کوشش کرتی ہوں۔"

وہ میرے ٹخنوں اور پاؤں پر تیل کی مالش کرنے لگی۔ پھر اس نے بیڑی اتارنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ میں نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔"

میں نے ٹخنوں پر تھوڑا سا اور تیل لگایا اور کافی جدوجہد کے بعد میرا پاؤں لوہے کے کڑے میں سے باہر نکل آیا۔ اس طرح میں نے دوسرے پاؤں کو بھی بیڑی کے کڑے سے نکال لیا۔ میں نے سائیں سے کہا۔

"سائیں میرے جوتے پھٹ گئے ہیں۔ کیا یہاں کہیں سے جوتے مل جائیں گے۔"

سائیں کہنے لگی۔

"ہم لوگ بہت کم جوتے پہنتے ہیں۔ ماما ایک بار شہر سے ربڑ کے جوتے لایا تھا میں وہ لا کر تمہیں دکھاؤں گی۔"

میں نے سائیں سے کہا۔

"کیا تم اپنے گھر والوں کو میرے بارے میں بتاؤ گی؟ مجھے خطرہ ہے کہ کہیں یہ خبر جاپانیوں تک نہ پہنچ جائے۔"

سائیں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ میرے ماما بھی جاپانیوں کے ساتھ ہیں اور وہ ان کے لئے قیدی کیمپ میں مچھلیاں لے کر جایا کرتے ہیں۔"

میں نے جلدی سے کہا۔

"پھر خدا کے لئے کسی کے آگے میرا ذکر نہ کرنا۔"

وہ بولی۔

"میں بیوقوف نہیں ہوں۔"

اور وہ مسکرانے لگی۔ موم بتی کی پاکیزہ روشنی میں اس کے دانت موتیوں کی طرح چمکنے لگے۔ اس کا چہرہ زرد کنول کے پھول کی طرح لگ رہا تھا۔ اس نے جوڑے میں سفید پھول لگائے ہوئے تھے اور کرتی کے اوپر نسواری رنگ کا لہنگا باندھا ہوا تھا۔ کہنے لگی۔

"اگر تم ضرور اپنے ملک جانا چاہتے ہو تو میں تمہارے دریا پار کرنے کا سارا

بندوبست کرا دوں گی۔ میری ایک سہیلی کا باپ مچھیرا ہے۔ ان کی تین چار کشتیاں ہیں۔ تم ایک کشتی میں بیٹھ کر رات کے اندھیرے میں دریا پار کر سکتے ہو۔"

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ کیا واقعی تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ میں سائیں سے کبھی جدا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ لیکن میں اس کے پاس رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ جاپانی میرا سر قلم کرنے کے واسطے میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اگر انہیں علم ہو گیا کہ اس لڑکی نے مجھے پناہ دی تھی تو وہ سائیں کا بھی سر قلم کر دیتے۔ میں نے سائیں سے کہا۔

"اگر ایسا کوئی انتظام ہو جائے تو بڑا اچھا ہو گا۔"

سائیں نے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا میری سہیلی ضرور میری مدد کرے گی۔ اب میں جاتی ہوں۔ ابھی تک ہمارے گاؤں میں کوئی جاپانی فوجی نہیں آیا۔ لیکن میرے ماما کو جاپانیوں نے بلا بھیجا تھا۔ جاپانیوں نے ماما کو ضرور بتا دیا ہو گا کہ ایک قیدی کیمپ سے فرار ہو گیا ہے۔ گاؤں کے آس پاس نظر آئے تو اسے پکڑ لینا۔ میں رات کو سارا پتہ کر کے آؤں گی۔"

سائیں چلی گئی۔ کافی دیر گزر گئی۔ باہر ضرور شام ہو گئی تھی۔ اس کے بعد باہر سے کسی جاپانی سپاہی کی آواز نہیں آئی تھی۔ کوئی آدمی ادھر سے گزرا بھی نہیں تھا۔ اس دوران میں تھوڑی دیر وہیں فرش پر پڑے پڑے سو بھی گیا۔ سائیں آئی اس نے بتایا کہ باہر رات ہو گئی ہے۔ وہ جنگل کے کسی محفوظ راستے سے ہو کر وہاں تک آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ دو جاپانی فوجی ماما کے ساتھ گاؤں میں آئے تھے انہوں نے سب کو جمع کر کے کہا کہ قیدی بھاگ گیا ہے۔ اگر کسی نے اسے اپنے گھر میں چھپایا تو اس کے سارے گھر والوں کے سر کاٹ دیئے جائیں گے۔ میں خاموشی سے سائیں کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"میرے دریا پار کرنے کا کوئی انتظام ہوا ہے سائیں؟"

سائیں میرے لئے کھانا لائی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں صبح اپنی سہیلی کے ہاں جاؤں گی۔ اس کا گاؤں دریا کے کنارے زیادہ دور نہیں ہے۔ میں کل آ کر تمہیں بتاؤں گی۔"

سائیں کے جانے کے بعد میں نے وہ رات بڑی بے چینی کی حالت میں

بند حجرے میں گزاری۔ سائیں مجھے باہر نکلنے سے منع کر گئی تھی۔ لیکن میں حجرے میں بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا۔ میں نے پتھر کی سل کو ہٹایا اور غار میں آ کر اندھیرے میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا غار کے دہانے پر آ گیا۔ یہاں جھاڑیوں کی دیوار پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ابھی دن نہیں نکلا تھا۔ میں نے جھاڑیوں کو ادھر ادھر ہٹا کر تھوڑا سا باہر سر نکال کر دیکھا۔ جنگل میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ تازہ ہوا میں آنے سے مجھے ایک نئی توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی تو میں جلدی سے جھاڑیوں کی دیوار میں سے پیچھے ہٹ کر غار میں آ گیا اور وہاں سے چل کر واپس اپنے حجرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ سائیں مجھے چھ سات موم بتیاں دے گئی تھی۔ پتھر پر موم بتیوں کے جلنے سے موم جمع ہو گئی تھی۔ میرے کان باہر کی آواز پر لگے تھے۔ کوئی غار کے قریب سے ہو کر گزر گیا تھا خدا جانے یہ کوئی دیہاتی تھا یا کوئی جنگلی جانور تھا۔

دوسرے دن سائیں نے آ کر مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ میرے دریا پار کرنے کا انتظام ہو گیا ہے۔

"میں آدھی رات کے بعد تمہارے پاس آؤں گی اور تمہیں اپنے ساتھ دریا پر لے جاؤں گی۔ وہاں میری سہیلی موجود ہو گی چھوٹی کشتی بھی ہو گی۔"

سائیں کچھ دیر میرے پاس بیٹھی رہی۔ وہ میرے لئے جنگلی کیلے اور کھچڑی لائی تھی۔ جب وہ چلی گئی تو میں سوچنے لگا کہ اگر فرار ہونے کے بعد سائیں مجھے نہ ملتی تو میں ان جنگلوں میں خدا معلوم اس وقت کہاں بھٹک رہا ہوتا۔ سائیں اپنے وعدے کے مطابق آ گئی۔ اس نے بتایا کہ رات آدھی گزر چکی ہے۔ وہ میرے لئے ربڑ کے پرانے جوتے بھی لائی تھی۔ میں نے انہیں پہن لیا۔ بس کچھ پورے تھے پورے نہیں بھی تھے لیکن میرے پاؤں جنگل کے سفر کے لئے کسی حد تک محفوظ ہو گئے تھے۔ کہنے لگی۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

غار سے باہر نکل کر میں نے لمبا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ مجھے خفیہ راستے سے اس علاقے سے نکال کر لے گئی۔ ہم جنگل سے باہر آ گئے تھے۔ یہاں تاروں بھرا آسمان بہت وسیع نظر آ رہا تھا۔ ہم ایک کچے راستے پر چلے جا رہے تھے۔ سائیں آگے آگے چل رہی تھی۔ ہم ایک گھاٹی میں اتر گئے۔ یہاں کافی دور تک چلنے

کے بعد باہر نکلے تو سامنے دریا کا چوڑا پاٹ ستاروں کی روشنی میں دکھائی دیا۔ دریا کے کنارے ایک جانب اونچے اونچے سرکنڈوں کی بہت سی جھاڑیاں تھیں۔ جب اس کے قریب آئے تو ستاروں کی دھندلی روشنی میں ایک دبلی سی عورت نکل کر سامنے آ گئی۔

یہ سائیں کی سہیلی تھی۔ سائیں نے اس سے برمی زبان میں کوئی بات کی۔ لڑکی ہمیں سرکنڈوں کے پیچھے لے گئی۔ یہاں دریا میں ایک چھوٹی کشتی جس کو وہاں کے لوگ سمپان کہتے تھے کھڑی تھی۔ سائیں میرے قریب آگئی۔ کہنے لگی۔

"میں نے بھنے ہوئے چاول کشتی میں رکھ دیئے ہیں۔ دریا پار تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو گھاٹ ہیں۔ وہاں اونچے اونچے بانس لگے ہوئے ہیں۔ اندھیرے میں تمہیں وہ بانس نظر آ جائیں گے۔ دوسرے گھاٹ سے تم دائیں جانب چل پڑنا۔ آگے پتھروں کا ایک چھوٹا چبوترہ آ جائے گا۔ چبوترے پر بھگوان بدھ کا مجسمہ ہو گا۔ تم رات وہاں بسر کرنا۔ دن نکلنے پر مجسمے کے پیچھے کی جانب چل پڑنا۔ تھوڑی دور چل گے تو ایک گاؤں آ جائے گا۔ ماما نے بتایا تھا کہ رنگون سے آنے والے لوگ قافلوں کی شکل میں ادھر سے گزرتے ہیں۔"

میں سائیں کو تک رہا تھا۔ یہ جدائی کی گھڑی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ م اس معصوم کنول کے پھول ایسی لڑکی سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہوں اور اب شا زندگی میں کبھی یہ چہرہ آمنے سامنے دیکھنا نصیب نہیں ہوگا۔ ستاروں کی روشنی سائیں کا زرد چہرہ کنول کے زرد پھول کی طرح اداس تھا۔ اس کی آنکھوں ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی چمک تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے ل میں نے کہا۔

"سائیں! میں تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

سائیں نے چہرہ نیچے کر لیا۔ پھر آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔

"اب دیر نہ کرو۔ جاپانی سپاہی تمہاری تلاش میں ہیں۔ مجھے بھی جلدی پہنچنا ہے۔ سب کو سوتا چھوڑ کر نکل آئی ہوں۔"

میں نے سائیں کا نیم گرم چھوٹا سا ہاتھ چوم لیا اور سمپان میں بیٹھ گیا چپو تھام لئے۔ سائیں کی سہیلی نے کشتی کی رسی کھول دی۔ سائیں نے کہا۔

"سمپان کو دوسرے کنارے کسی جگہ باندھ دینا۔"

رسی کے کھلتے ہی کشتی دریا کی لہروں پر چل پڑی۔ میں چپو چلانے لگا۔ میری آنکھوں سائیں کو دیکھ رہی تھیں۔ رات کے دھندلے اندھیرے میں وہ مجھ سے دور ہو رہی تھی۔ پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کشتی دریا میں آگے نکل گئی تھی۔ میں نے چپو چلاتے ہوئے کشتی کا رخ دوسرے کنارے کی طرف کر دیا۔

دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح چپو چلاتے ہوئے کشتی کو دوسرے کنارے تک لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کافی آگے نکل آیا ہوں۔

دوسرے کنارے پر پہنچنے کے بعد میں نے کشتی کو کھینچ کر جھاڑیوں میں چھپا دیا اور ایک جگہ سے تھوڑی سی چڑھائی چڑھ کر کنارے کے اوپر آگیا۔ یہاں دریا کا کنارا اونچا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دریا کے کنارے پر دونوں جانب اندھیرا تھا۔ مجھے اس گھاٹ کی تلاش تھی جہاں سے مجھے دائیں جانب جنگل میں اترنا تھا۔ دریا میں گاڑے ہوئے بانس بھی کہیں نظر نہ آئے۔ میں کنارے کنارے، پیچھے کی جانب چلنے لگا۔ کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد اندھیرے میں مجھے اونچے اونچے بانس دریا میں سے باہر نکلے ہوئے نظر آ گئے۔ یہاں ایک چھوٹا سا گھاٹ بنا ہوا تھا اور پانی میں بتیاں لگی ہوئی تھیں۔ میں یہاں سے دائیں جانب ہو کر درختوں میں اتر گیا۔ مجھے اس چبوترے تک پہنچنا تھا جہاں مہاتما بدھ کا مجسمہ نصب تھا۔ سمپان میں سے میں نے بھنے ہوئے چاولوں کی چھوٹی سی تھیلی اٹھالی تھی۔ یہاں درختوں کے کافی جھنڈ تھے۔ میں رک رک کر راستہ دیکھ دیکھ کر چل رہا تھا۔ اندھیرے میں آنکھیں کھول کر دیکھ رہا تھا۔ آخر میری نظر ایک ٹیلے پر پڑی۔ اونچے اونچے درختوں کے درمیان یہ ایک چبوترا تھا۔ قریب آیا تو دیکھا کہ چبوترے کے درمیان میں گوتم بدھ کا مجسمہ نصب تھا۔ مہاتما بدھ آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے شہزادہ گوتم تھوڑی دیر پہلے اپنے محل کی عشرت گاہ سے نکل کر یہاں مراقبے میں آکر بیٹھ گیا ہے اور انسانوں کے دکھ درد کی اصل وجہ معلوم کرنے کے لئے گہری سوچ میں گم ہے۔

مجھے یہاں باقی رات بسر کرنی تھی۔ میں مجسمے کے پیچھے اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ جاپانیوں کی قید سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اگرچہ جاپانی سپاہیوں کا خطرہ ٹلا نہیں تھا کیونکہ سارے برما پر جاپانیوں کا قبضہ ہو چکا تھا مگر اس جنگل میں کسی جاپانی سپاہی کا میری تلاش میں آنے کا امکان بہت کم تھا۔ کچھ جاگتے، کچھ سوتے ہوئے رات کٹ گئی۔ درختوں میں دن کا اجالا پھیل گیا۔ پرندوں کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے دیکھا کہ چبوترے کی پشت کی جانب درختوں میں ایک پگڈنڈی جا رہی تھی۔ یہ پگڈنڈی اس بات کی علامت تھی کہ آگے ضرور کوئی گاؤں ہے۔ لوگ دریا کے گھاٹ پر سے آتے ہوئے یہاں سے گاؤں کی طرف جاتے ہوں گے۔ راستے میں ایک جانب مجھے ایک گاؤں کے جھونپڑے نظر آئے۔ میں ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ پگڈنڈی میں سے ایک شاخ نکل کر گاؤں کی طرف چلی گئی تھی۔ یہ اتنا گھنا جنگل نہیں تھا۔ درختوں کے جھنڈ بھی آ جاتے تھے اور گھاس کے میدان بھی آ جاتے تھے۔ دن کے وقت بھی وہاں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس بات کا خطرہ ضرور لگا ہوا تھا کہ کہیں جاپانی فوجی نہ اچانک سامنے آ جائیں۔ چلتے چلتے آخر میں ایک سڑک پر نکل آیا۔ یہاں مجھے سڑک کی دونوں جانب بکھرے ہوئے کاغذ اور پرانے کپڑوں کے چیتھڑے نظر پڑے۔ ایک جگہ پتھروں کو جوڑ کر آگ جلائی گئی تھی جو اب بجھ چکی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ رنگون سے آنے والے قافلے اسی سڑک پر سے گزرتے ہیں۔

میں تھک گیا تھا۔ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا کہ اتنی دیر میں شاید پیچھے سے کوئی قافلہ آ جائے اور میں اس میں شامل ہو جاؤں۔ مجھے پیاس محسوس ہوئی تو اٹھ کر ادھر ادھر پانی تلاش کرنے لگا۔ اس جگہ کوئی ندی تالاب یا جھیل وغیرہ نہیں تھی۔ واپس آ کر پھر اسی درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے جب مجھے کافی وقت گزر گیا تو میں نے سوچا کہ مجھے آگے چل پڑنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کسی قافلے نے آگے پڑاؤ ڈال رکھا ہو۔ یہ سوچ کر میں اٹھا ہی تھا کہ سڑک پر پیچھے کی جانب کچھ آوازیں سی سنائی دیں۔ یہ بیل گاڑیوں کے پہیوں کی آواز تھی۔ میں وہیں رک گیا اور پیچھے دیکھنے لگا۔ سڑک کچھ دور پیچھے جا کر ایک طرف مڑ جاتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی۔ آگے ایک بیل جتا ہوا تھا۔ گاڑی پر سامان بھی لدا تھا اور کچھ عورتیں اور بچے بھی بیٹھے تھے۔ اس کے پیچھے ایک اور بیل گاڑی تھی۔ پھر ایک اور بیل گاڑی تھی۔ یہ مہاجرین کا قافلہ تھا۔ مرد گاڑیوں کے ساتھ ساتھ پیدل بھی چل رہے تھے۔ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں بیل گاڑیوں پر بیٹھی تھیں۔

قافلہ جوں کی چال چل رہا تھا۔ دو تین سو آدمیں کا قافلہ تھا۔ میں بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا اور ایک بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یہ سارے لوگ ہندوستانی یعنی انڈیا کے رہنے والے تھے۔ بے حد خستہ حال تھے۔ ایک دوسرے سے بیزار نظر آ رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی گاڑی میں کوئی بچہ رونے لگتا تو کسی مرد کے اسے جھڑکنے کی آواز سنائی دیتی۔ ایک بوڑھا وھیل چیئر پر بیٹھا ہوا تھا جسے ایک نوجوان آہستہ آہستہ چلا رہا تھا۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا کہ یہاں کسی کے پاس پانی ہو گا۔ اس نے پیچھے ایک بیل گاڑی کی طرف بیزاری کے ساتھ اشارہ کیا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

پچھلی بیل گاڑی پر ایک فیملی سفر کر رہی تھی۔ ساڑھی والی عورتیں بھی تھیں اور شلوار قمیض والی عورتیں بھی تھیں۔ ایک بزرگ عورت کے پاس مٹی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ بیل گاڑیاں ہچکولے کھاتی ہوئی بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ میں نے اس عورت سے پانی مانگا تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور کہا۔

"صرف ایک پیالی پانی ملے گا۔"

میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔"

اس نے مٹکے میں ڈونگا ڈال کر پانی نکالا اور ایک چینی کی پیالی میں ڈال کر مجھے اس طرح دیا جیسے کوئی تبرک ہو۔ میں نے پانی پی کر شکریہ ادا کیا۔ وہ بزرگ عورت شکل سے شمالی ھند کی رہنے والی لگ رہی تھی۔ رنگ گورا تھا اور جسم بھاری تھا۔ اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ سر پر سفید دوپٹہ تھا۔ ماتھے پر کالے کپڑے کی پٹی باندھی ہوئی تھی۔ میں پانی پی کر بیل گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس عورت نے پوچھا۔

"تم رنگون میں کہاں رہتے تھے؟"

میں نے کہا۔

"جی میں لیوس سٹریٹ میں رہتا تھا جو فریزر سٹریٹ کے ساتھ ہی ہے۔"

عورت نے دوسرا سوال کیا۔

"کیا تم پنجاب کے رہنے والے ہو؟"

میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ میں امرتسر کا ہوں۔"

"ہم بھی لدھیانے کے ہیں۔ سارا کچھ وہیں رہ گیا ہے۔ پندرہ برسوں میں جو کچھ کمایا تھا وہیں چھوڑ آئے ہیں۔"

بزرگ عورت کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دوپٹے سے آنسو پونچھنے لگی۔ اس کے پہلو میں دو نوجوان لڑکیاں بھی سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ ان کے چہروں پر رنج و غم کے تاثرات تھے۔ ان میں سے ایک چھوٹی لڑکی تھی۔ دوسری کی عمر اٹھارہ انیس برس کی ہو گی۔ بڑی لڑکی نے بزرگ عورت سے کہا۔

"اماں! اب حوصلہ کرو۔ سب کے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔"

جو بوڑھا بیل گاڑی کے آگے بیٹھا بیلوں کو چلا رہا تھا وہ بولا۔

"خدا کا شکر کرو عزت آبرو ابھی تک محفوظ ہے۔ جاپانی تو نہ جانے کتنی عورتوں کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔"

معلوم ہوا کہ رنگون سے نکلنے کے بعد کسی جاپانی پلٹن کے کچھ سپاہی فائرنگ کرتے قافلے میں گھس آئے تھے اور کئی ایک نوجوان عورتوں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

رات کے وقت اس قافلے نے ایک تالاب کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا۔ وہاں قریبی گاؤں کے بری لوگ بھنے ہوئے چاول اور چنے لے کر آ گئے۔ یہ چیزیں انہوں نے بوریوں میں ڈال رکھی تھیں اور بغیر کوئی پیسہ لئے انہیں مہاجرین میں تقسیم کرنے لگے۔ یہ بڑے دردمند دل رکھنے والے لوگ تھے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ آگے بڑے خطرناک جنگل شروع ہو رہے ہیں۔ آپ لوگ راتوں کو آگ روشن کر کے سوئیں اور مرد پہرہ دیتے رہیں۔ ادھر شیر بہت ہیں۔

لوگوں نے وہاں بھی رات کو آگ کے الاؤ روشن کر دیئے اور نوجوان مرد رات کو باری باری پہرہ دیتے رہے۔ کچھ لوگوں کے پاس شکاری بندوقیں اور کارتوس بھی تھے۔ وہ بندوقوں کو بھر کر رکھتے تھے۔ دوسرے دن قافلہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ دوپہر کے وقت گھنا جنگل شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ہاتھیوں کی ایک ڈار دیکھی جو سڑک پار کر رہی تھی۔ قافلہ وہیں رک گیا۔ دس بارہ ہاتھی تھے۔ ان کے بچے بھی ساتھ تھے۔ جب ہاتھی گزر گئے تو قافلہ آگے روانہ ہوا۔ جیسے جیسے قافلہ آگے بڑھ رہا تھا کچا راستہ پگڈنڈی کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ یہ پگڈنڈی بھی آگے جو قافلے نکل

گئے تھے ان کے چلنے کی وجہ سے بن گئی تھی۔ حقیقت میں ہم گھنے جنگل میں سے گزر رہے تھے۔ یہ سفر بڑا اذیت ناک تھا۔ ان دنوں کو یاد کر کے میں آج بھی حیران ہوتا ہوں کہ جو لوگ قافلے میں سفر کر رہے تھے وہ کیسے زندہ سلامت بنگال پہنچ سکے تھے۔ میری اپنی یہ حالت تھی کہ کپڑے پھٹ گئے تھے۔ پاؤں سوج گئے تھے۔ جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چالیس دن کے سفر کے بعد جب کاکس بازار پہنچے تو وہاں انگریزی حکومت کی جانب سے کیمپ لگے تھے۔ ہمیں میڈیکل ایڈ دی گئی، کھانا کھلایا گیا۔ انجکشن لگائے گئے۔ بڑے بڑے ٹرکوں میں بٹھا کر کلکتے پہنچایا گیا۔ کلکتے پہنچنے کے بعد میں امرتسر جانے کی بجائے سیدھا اپنے انکل خواجہ صاحب کے گھر چلا گیا۔

ان لوگوں نے مجھے دیکھا تو پہلی نظر میں بالکل نہ پہچانا۔ چچی رونے لگی۔ خواجہ صاحب نے بتایا کہ میرے گھر والے سخت پریشان رہے تھے۔ ہر ہفتے ان کا خط آتا تھا کہ میری کوئی خبر ہے یا نہیں۔ انہوں نے اسی وقت امرتسر تار دے دیا کہ لڑکا خیریت سے کلکتے پہنچ گیا ہے۔ میں تین دن خواجہ صاحب کے پاس ٹھہرا اور امرتسر روانہ ہو گیا۔ گھر والوں نے مجھے دیکھا تو سوائے والد صاحب اور بھائیوں کے سبھی مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ والد صاحب نے ان سب کو ڈانٹ دیا۔

"اس آوارہ گرد کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ تم لوگ کیوں روتے ہو۔"

کچھ روز گھر پر میری خوب آؤ بھگت ہوئی۔ اس کے بعد سب مجھ سے بے نیاز ہو گئے۔ میں نے ناویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے تو جنگ ختم ہو گئی۔ بھائی جان کو فوج میں اعزازی کمشن مل گیا اور وہ ریڈیو سیلون کی اردو سروس کے انچارج کے طور پر منتخب ہو کر کولمبو جانے لگے تو انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا کہ یہ رنگون ریڈیو پر کام کر چکا ہے وہاں میرے ساتھ کام کرے گا۔ میں دسویں جماعت پاس کر چکا تھا۔ میں بڑا خوش ہوا کہ ایک بار پھر مجھے سیاحت کا موقع مل رہا تھا۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ کولمبو کی طرف روانہ ہو گیا۔

جاپان پر اتحادیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وہاں امریکی اور برٹش آرمی کی رجمنٹیں مقیم تھیں۔ برٹش آرمی کی رجمنٹوں میں پنجاب، بنگال، سرحد اور مدراس وغیرہ سبھی صوبوں کے فوجی جوان تھے۔ ان لوگوں کی تفریح اور معلومات کے واسطے امریکہ کی

ِجی ہائی کمانڈ نے کولمبو میں ایک ریڈیو سٹیشن قائم کیا تھا جہاں سے ان فوجیوں کے لئے بنگلہ، تامل تلیگو، پنجابی، پشتو گانوں کے ریکارڈ بجائے جاتے تھے اور دوسرے ِوگرام بھی نشر ہوتے تھے۔ اس ریڈیو سٹیشن کا نام ریڈیو سی ایک سیلون تھا۔ سی ایک SEAC سے مراد ساؤتھ ایسٹ ایشیا کمانڈ تھا۔ یہ فوجی ریڈیو سٹیشن تھا اور یہاں سے نگریزی اور اردو سروس کے پروگرام ہوتے تھے۔ ریڈیو سٹیشن کے دو سیکشن تھے۔ یک اردو سیکشن تھا اور دوسرا امریکی سیکشن تھا۔ یہی وہ ریڈیو سٹیشن ہے جو قیام کستان کے بعد ریڈیو سیلون کے کمرشل ادارے میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو سیلون برصغیر کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی بڑے شوق سے سنا جاتا تھا۔ اس کے کمرشل اناؤنسروں میں سنیل دت بھی شامل تھا جس نے بعد میں بطور اداکار شہرت اصل کی۔ بہرحال اس ریڈیو سٹیشن کی مزید تفصیلات میں آگے چل کر بیان کروں گا۔

امرتسر سے ہم ایک ٹرین میں بیٹھ کر دلی پہنچے۔ دلی سے ایک ایسی ٹرین بدلی لی جو ہندوستان کی جنوبی تکون کے آخری سٹیشن دھنش کوڑی تک جاتی تھی۔ یہ بڑا با سفر تھا۔ بڑا لمبا روٹ تھا۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ راستے میں کون کون سے شہر ائے تھے۔ مجھے اس روٹ کے سارے بڑے بڑے شہر آج بھی یاد ہیں۔ دلی سے ازی آباد آیا۔ پھر مراد آباد، بریلی، شاہ جہان پور، سیتا پور پھر لکھنؤ آیا۔ بڑا وبصورت اور خالص مشرقی طرز کا سٹیشن تھا۔ لکھنؤ سے آگے کانپور کا سٹیشن آیا۔ انپور سے ٹرین جھانسی اور بھوپال سے ہوتی ہوئی ہوشنگ آباد پہنچی۔ یہاں سے اس کا رخ وسطی ہندوستان کی طرف ہو گیا تھا۔ آگے بڑا شہر ناگ پور آیا۔ پھر واردھا سٹیشن آیا۔ پھر ایک سٹیشن عادل آباد آیا جہاں میں نے خاکی وردی اور لال ترکی ٹوپیوں الے پولیس کے سپاہی دیکھے۔ بھائی جان نے بتایا کہ ہم ریاست حیدر آباد دکن میں اخل ہو گئے ہیں۔ پھر حیدر آباد کا سٹیشن آگیا۔ یہاں ٹرین کافی دیر تک رکی رہی۔ ں کے بعد ایک سٹیشن محبوب نگر آیا۔ پھر کرنول آیا۔ اس کے بعد ایسے سٹیشن آنے لگے جن کے نام تامل تیلگو زبان میں تھے۔ ان میں سے مجھے چند ایک سٹیشنوں کے ام ہی یاد رہ گئے ہیں۔ بڑے مشکل نام تھے۔ خدا کا شکر ادا کیا جب گاڑی دراس کے سٹیشن میں داخل ہوئی۔ ہمیں ٹرین میں سفر کرتے تین دن اور دو راتیں گزر گئی تھیں۔ بھائی جان نے بتایا کہ ابھی ایک رات اور ایک دن کا سفر باقی ہے۔ گر میں اسی لمبے سفر سے زیادہ بور نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ راستے میں کئی دریا، جنگل اور

پہاڑ آئے تھے۔ راستے میں بارشیں بھی ہوئی تھیں اور ہماری گاڑی جنگل کی بارشوں سے بھی گزری تھی۔ مدراس سے آگے جن سٹیشنوں کے نام مجھے یاد رہ گئے ہیں ان میں ترچناپلی اور مجورا یا مدورائی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ نام بھی اس لئے یاد رہ گئے کہ ان میں ایک میوزک تھا۔ ترچناپلی کا سٹیشن مجھے اس لئے بھی یاد رہ گیا ہے کہ اس سٹیشن پر میں نے ایک ایسی گہرے سانولے رنگ کی لڑکی کو دیکھا تھا جس نے میری طرف بھی مسکرا کر دیکھا تھا۔ ایسا ہوا نہیں کرتا۔ مشرقی لڑکیاں غیر مردوں کی طرف دیکھ کر مسکرایا نہیں کرتیں۔ مگر یہ لڑکی عجیب تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر ایسے مسکراتی تھی جیسے مجھے پہلے سے جانتی ہو۔ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ کے جواب میں بالکل نہ مسکرا سکا تھا۔ بس حیرت زدہ سا ہو گیا تھا۔ میں آپ کو سارا سکرین پلے سناتا ہوں۔

ترچناپلی کا سٹیشن بہت بڑا تھا۔ جس پلیٹ فارم پر ہماری گاڑی کھڑی ہوئی وہاں سے کئی پلیٹ فارم نظر آتے تھے۔ میں ہمیشہ ٹرین میں کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سفر کرتا تھا۔ اس طرح مجھے باہر کے جنگل دریا اور پہاڑ دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس وقت بھی میں ڈبے میں کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر پلیٹ فارم پر مسافروں کو ٹرین سے اترتے چڑھتے دیکھ رہا تھا۔ ہمارے اگلے ڈبے سے ایک مدراسی فیملی نیچے اتری۔ ایک بوڑھی عورت تھی۔ ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا اور ایک لڑکی جس نے ہلکے کاسنی رنگ کی سرخ بارڈر والی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ بالوں کے جوڑے میں سفید پھول لگے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں بانس کی چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ ٹرین سے اترنے کے بعد جیسا کہ ہوا کرتا ہے اس نے یونہی پچھلے ڈبوں کی طرف دیکھا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا یا اس کے بالوں میں لگے ہوئے سفید پھولوں کو دیکھ رہا تھا جو گجرا تھا اور جس کے پھول ذرا ذرا مرجھائے ہوئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھٹھک گئی ہے۔ اس کے فوراً بعد وہ سامان وغیرہ ایک طرف لگانے میں مصروف ہو گئی۔ وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ یہ اچھا لگنا بالکل ایسا ہی تھا جیسے ٹرین میں سفر کرتے ہوئے آپ کو کھیتوں میں کوئی پھولوں والا درخت نظر آ جائے۔ آپ اسے تھوڑی دیر کے لئے دیکھیں اور پھر ٹرین آگے نکل جائے۔ اتنی دیر میں وہ لڑکی اپنی فیملی کے ساتھ پلیٹ فارم پر آگے چل پڑی۔ چند قدم چلنے کے بعد لڑکی نے چلتے چلتے ایک لمحے کے لئے گردن پیچھے موڑ کر میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرائی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دور بادلوں میں

ایک لمحے کے لئے بجلی چمک گئی ہو۔ لڑکی اپنی فیملی کے ساتھ بانس کی چھوٹی سی ٹوکری ہاتھ میں لٹکائے سیڑھیوں والے اس پل کی طرف جا رہی تھی جس طرف سارے مسافر جا رہے تھے اور جو ریلوے لائن کے اوپر سے ہو کر دوسرے پلیٹ فارم کو جاتا تھا۔ میں اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ لڑکی پل کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اوپر جا کر اس نے پھر میری طرف دیکھا۔ مگر اب وہ مجھ سے دور تھی۔ معلوم نہیں وہ میری طرف دیکھ مسکرائی تھی یا نہیں مسکرائی تھی۔ دوسرے پلیٹ فارم پر سٹیشن کا گیٹ تھا۔ میری نگاہیں برابر اس لڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر ٹکٹ چیکر کھڑا تھا۔ جب وہ اپنی فیملی کے ساتھ ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے کر گیٹ کی طرف بڑھی تو یقین کریں کہ اس نے ایک بار پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ آپ کو یقین نہیں آئے گا۔ مجھے بھی اس وقت یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے بعد وہ مسافروں کے ہجوم میں گم ہو گئی اور اس کا چہرہ، اس کا جسم، اس کے جوڑے کے مرجھائے ہوئے سفید پھول میری نظروں سے ہمیشہ کے لئے اوجھل ہو گئے۔ اس وقت میرے دل نے کہا۔

"ٹرین سے اتر آؤ۔ اس لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑو۔ تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جو اس کے بعد تمہیں کبھی نہیں ملے گا۔ دماغ کو بند کر دو۔ میرے کہنے پر عمل کرو۔ بس چھلانگ لگا دو۔ زندگی کی اصلی خوشبو مسکراتے ہوئے تمہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے گزر گئی ہے۔ سوچتے رہو گے تو کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ سوچنے سے غور کرنے سے خوشبوؤں کا سراغ نہیں ملا کرتا۔ تمہارے سامنے ایک ان دیکھے جنگل کا دروازہ اچانک کھل گیا ہے۔ ٹرین سے اتر کر اس لڑکی کے پیچھے اس کے مرجھائے ہوئے سفید پھولوں کی خوشبو کے پیچھے چل پڑو۔ اس جنگل میں اگر تمہیں دکھ بھی ملیں گے تو وہ تمہاری اپنی مرضی کے دکھ ہوں گے۔ دوسروں کی مرضی سے خوش رہنے میں بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اپنی مرضی سے اپنی مرضی کے دکھوں میں بھی ایک خوشی ہوتی ہے۔ سب کچھ چھوڑ کر ڈبے سے نکل آؤ۔ اس کے بعد ساری زندگی تمہیں ترچناپلی کے پلیٹ فارم پر یہ خوشبو کبھی نہیں ملے گی..."

لیکن میں دل کی آواز بھی سنتا رہا اور اپنے دماغ سے بھی سوچتا رہا۔ دل نے مجھے ایک خوشبوؤں سے مہکتا ہوا جنگل دکھایا تھا۔ دماغ نے مجھے اندیشوں اور طرح طرح کے خطروں کی ایسی خوفناک تصویریں دکھائیں کہ میں ڈبے میں ہی کھڑکی کے پاس بیٹھا اس گیٹ کو دیکھتا رہا جہاں میری زندگی کے سیاہ بادلوں میں ایک بجلی ایک

لمحے کے لئے چمک کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی۔ میں گیٹ کی طرف دیکھتا رہا اور انجن نے سیٹی دی۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور ٹرین ترچناپلی کے پلیٹ فارم سے چل پڑی۔ آج اسی بات کو نہ جانے کتنے برس گزر گئے ہیں۔ مگر ترچناپلی سٹیشن کے پلیٹ فارم کا وہ حسین منظر اپنی تمام خوشبوؤں اور رنگوں کے ساتھ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس منظر کو یاد کرتا ہوں تو مجھے اس لڑکی کے جوڑے کے مرجھائے ہوئے سفید پھولوں کی اداس خوشبو آتی ہے۔ اس خوشبو کی اداسی میں بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ کسی وقت خیال آتا ہے کہ میں نے بڑی عقل مندی کی کہ ٹرین سے سے اتر کر اس لڑکی کے پیچھے نہیں گیا۔ اگر حماقت سے کام لے کر ٹرین سے اتر کر اس لڑکی کے پیچھے چل پڑتا تو خوامخواہ نہ جانے کن مصیبتوں میں پھنس جاتا۔ پھر خیال آتا ہے کہ زندگی اگر دوسروں کی مرضی کی خوشیوں اور خوامخواہ کی مصیبتوں میں ہی گزرنی تھی تو اس وقت حماقت کر ہی لیتا تو اچھا تھا۔

ترچناپلی کے آگے مدورائی کا شہر آیا۔ یہ بھی کافی بڑا سٹیشن تھا۔ ٹرین بڑے بڑے کارخانوں کے قریب سے گزری تھی۔ مدورائی کے آگے ٹرین جنوبی ہند کی تکون کے علاقے میں داخل ہو گئی۔ اب دونوں طرف کا سمندر قریب ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں کوئی جنگل وغیرہ نہیں تھا۔ زمین ریتلی تھی۔ جیسے ساحل سمندر پر ہوتی ہے۔ کہیں کہیں ناریلوں اور تاڑی کے درختوں کے جھنڈ نظر آ جاتے تھے۔ کوئی بڑا قصبہ وغیرہ گزرتا تو تھوڑا سبزہ نظر آ جاتا موسم بھی گرم ہو گیا تھا۔

ٹرین منڈاپم کے ایک ویران سے سٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ کولمبو جانے والے مسافر ٹرین سے اتر آئے۔ بھائی جان نے بتایا یہاں ایک کیمپ ہے۔ وہاں ہمیں ٹیکے لگائے جائیں گے اور میڈیکل چیک اپ ہو گا۔ اب یاد آیا اس سٹیشن کا نام منڈاپم کیمپ تھا۔ کچھ برس گزرے سری لنکا میں تامل ٹائیگرز چھاپہ ماروں کی تخریبی سرگرمیاں کافی تیز ہو گئی تھیں جس کے جواب میں سری لنکا کی فوج نے جوابی کارروائی کر کے لنکا کے شمالی علاقے جافنا وغیرہ میں باغی تاملوں کی گرفتاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس زمانے میں سری لنکا سے بے شمار تامل لوگ بھاگ کر ہندوستان آ گئے تھے۔ ہندوستان کی حکومت نے ان کے واسطے ایک مہاجر کیمپ بنا دیا تھا۔ یہ کیمپ منڈاپم کیمپ نامی اسٹیشن کے قریب ہی بنایا گیا تھا۔ ایک مدت بعد میں نے اخباروں میں منڈاپم کیمپ کا نام پڑھا تو مجھے وہ ویران سٹیشن اور ریتلا میدان یاد آ گیا۔ ان

دنوں یہ میدان بہت ویران ویران تھا۔ ہر طرف ریت ہی ریت تھی۔ سمندر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ کچھ فاصلے پر ٹین کی چھت والا ایک کیمپ بنا ہوا تھا۔ وہاں کالے رنگ کی پیلی اور شربتی آنکھوں والی نرسوں اور ڈاکٹروں نے ہمارا سرسری سا میڈیکل چیک اپ کیا۔ ہمیں انجکشن لگائے اور سب مسافروں کو گولیاں کھانے کو دیں اور پھر سب کو ایک ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ دے دیا۔ یہ ایک طرح کا پروانہ راہداری تھا۔ ہم یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ دکھا کر سری لنکا کے ملک میں داخل ہو سکتے تھے جس کا نام اس زمانے میں سیلون ہوا کرتا تھا۔ وہاں بھی ہندوستان کی طرح انگریزوں کی حکومت تھی۔ جو کرنسی نوٹ ہندوستان میں چلتے تھے وہی سیلون میں بھی چلتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سیلون میں روپے کا بھان آنے دونیوں اور چونیوں کی بجائے سینٹوں میں ملتا تھا۔ یعنی 25 سینٹ کی ایک چونی ہوتی تھی۔ سو سینٹ کا وہی جارج پنجم اور ملکہ وکٹوریہ کی تصویر والا روپیہ ملتا تھا۔ ہندوستان سے سری لنکا یعنی سیلون جانے کے لئے صرف اسی ایک طبی سرٹیفکیٹ کی ضرورت ہوتی تھی۔ کسی ویزا پاسپورٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم واپس آ کر ٹرین میں سوار ہو گئے اور ٹرین منڈاپم کیمپ سے دھنش کوڑی کی طرف چل پڑی۔

سارا راستہ دونوں جانب ریت ہی ریت تھی۔ کہیں کہیں کوئی کھیت آ جاتا تھا۔ ناریل کے درختوں کے جھنڈ بھی آ جاتے تھے۔ دھنش کوڑی ہندوستان کی جنوبی تکون میں ذرا اوپر کر کے ساحل سمندر پر واقع ہے۔ یہاں ہندوستان کا تکونی ساحل انڈیکس کی طرح سمندر میں کچھ دور تک چلا گیا ہے۔ اس کے آگے بحر ہند اور خلیج بنگال کے دونوں سمندر آ کر مل جاتے ہیں اور یہاں موجیں بہت ہیجان خیز ہوتی ہیں۔ تکونی ساحل سے سمندر میں دور تک گیا ہوا ساحل پتھریلا ہے۔ یہاں ٹرین بڑی بڑی چٹانوں کے اوپر سے گزرتی ہے۔ یہاں سمندر کے اوپر ایک پل بھی بنا ہوا ہے۔ یہ پل انجینئرنگ کے کمال کا نمونہ ہے۔ جب ٹرین اس پل پر سے گزر رہی تھی تو میں کھڑکی میں سے مسلسل نیچے دیکھتا رہا۔ دونوں جانب سے سمندر کی جھاگ اڑاتی موجیں ان چٹانی پتھروں سے دیوانہ وار ٹکرا رہی تھیں جن پر ریلوے لائن بچھی ہوئی تھی۔ کوئی کوئی سمندری موج ٹرین کے پہیوں سے بھی ٹکرا جاتی تھی۔ یہاں دائیں جانب سمندر میں اونچے اونچے ستون بھی دکھائی دیئے۔ یہ ستون ساحل سے شروع ہو کر سمندر میں کچھ دور تک چلے گئے تھے۔ بھائی جان نے بتایا یہ ایڈمیز برج ہے۔ اور

اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پل راون سے بھی پہلے زمانے کا ہے۔

سمندری چٹانوں کے پل پر سے گزرنے کے بعد ٹرین دھنش کوڑی کے درختوں اور سبزے میں گھرے ہوئے چھوٹے سے سٹیشن پر جا کھڑی ہوئی۔ ہم ٹرین سے اتر کر سٹیشن کے جنگلے سے باہر نکلے تو سامنے سمندر ہی سمندر تھا۔ دائیں طرف بھی سمندر سامنے بھی سمندر اور بائیں طرف بھی سمندر تھا۔ اس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر بادل چھا رہے تھے اور بڑی تیزی سے شام ہو رہی تھی۔ سمندر میں ایک جگہ بحری جہاز لنگر انداز تھا۔ اس میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ایک طرف جھونپڑی میں چائے کی دکان تھی جہاں سے ریکارڈنگ کی آواز آ رہی تھی۔ اس زمانے میں میوزک ڈائریکٹر نوشاد صاحب کی فلم "رتن" کا بڑا چرچا تھا۔ فلم رتن کے گانے "ساون کے بادلو۔ ان سے یہ جا کہو" کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ 1945ء یا 1946ء کا زمانہ تھا۔

میں بھائی جان کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ فوجی وردی میں تھے اور ان کے اردلی نے مختصر سا سامان اٹھا رکھا تھا۔ انہوں نے سمندر میں کھڑے جہاز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم اس جہاز میں سوار ہو کر سیلون پہنچ جائیں گے۔"

بھائی جان کریون اے کے سگریٹ پیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی وہ یہی اعلیٰ کوالٹی کا سگریٹ پی رہے تھے۔ میں گولڈ فلیک پیا کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی۔ سگریٹ میں نے چھٹی ساتویں جماعت سے ہی پینے شروع کر دیئے تھے۔ بھائی جان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے مجھے کریون اے کے اعلیٰ تمباکو کی خوشبو بڑی رومانٹک لگ رہی تھی۔ جہاز گودی کے بالکل ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ دونوں جانب سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں۔ مسافر سامان وغیرہ کے ساتھ جہاز پر سوار ہو رہے تھے۔ ہم بھی سوار ہو گئے۔ بھائی جان کا سیکنڈ کلاس کا کیبن تھا۔ ہم ڈیک پر آ گئے۔ یہاں بانس کی سبز رنگ کی بہت سی آرام کرسیاں بچھی تھیں۔ پہلے سے مسافر بیٹھے سگریٹ اور بیئر وغیرہ پی رہے تھے۔ بھائی جان بھی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ میں ڈیک کے جنگلے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔ دور تک سمندر ہی سمندر تھا جو شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں دھندلا ہو رہا تھا۔ میں گودی کی طرف آ گیا۔ ادھر ساحل پر کہیں کہیں بجلی کے بلب جل رہے تھے۔ چائے

کے کھوکھے کی جانب سے رتن فلم کے گانوں کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ دھنش کوڑی کے سٹیشن کی روشنیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ جہاز کی دونوں سیڑھیاں ہٹا دی گئیں۔ جہاز کے انجن سٹارٹ ہو گئے تھے۔ ان کی تھرتھراہٹ ڈیک کے لکڑی کے فرش پر صاف محسوس ہو رہی تھی۔ پھر جہاز نے تین چار مرتبہ وسل دیا اور آہستہ آہستہ ساحل سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کے ساحل کی روشنیاں دور ہونے لگیں۔ میں بھائی جان کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ ان کے ہاتھ میں بیئر کا مگ تھا اور پیچھے ہٹتی ہوئی ساحل کی روشنیاں دیکھ رہے تھے کہنے لگے۔

"جب ہندوستان کی روشنیاں غائب ہو جائیں گی تو دوسری طرف سے لنکا سیلون کے ساحل کی روشنیاں نظر آنا شروع ہو جائیں گی۔ بس ہندوستان اور لنکا سیلون کے درمیان سمندر کا اتنا ہی فاصلہ ہے۔"

میں ہندوستان کے ساحل کی روشنیوں کو دیکھتا رہا۔ یہ روشنیاں دور ہوتے ہوتے نظروں سے اوجھل ہو گئیں تو میں ڈیک کی دوسری طرف آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد لنکا کے ساحل کی روشنیاں ابھرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ یہ روشنیاں قریب ہو رہی تھیں۔ رات کا اندھیرا ہو گیا تھا۔ نیچے سمندر کی طرف دیکھ کر خوف محسوس ہوتا تھا۔ میں جنگلے سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا۔ رنگون جاتے ہوئے جہاز میں بڑی زبردست رولنگ ہوئی تھی مگر یہاں جہاز تھوڑا تھوڑا آگے پیچھے اور دائیں بائیں ڈولتے ہوئے اپنی منزل کی طرف سمندر میں رواں تھا۔ آخر ہمارا جہاز لنکا کے ساحل کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ یہ اس زمانے میں چھوٹی سی بندرگاہ تھی۔ اس کا نام تالی مینار تھا۔ اب یہ علاقے تامل باغیوں کی تخریبی سرگرمیوں کا مرکز ہیں۔ اس زمانے میں ایسی کوئی بک بک نہیں تھی۔ بڑا پرسکون زمانہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم نے تھوڑی ہل چل مچائی تھی لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد حالات پھر معمول پر آ گئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ جنگ عظیم آنے والی پریشانیوں اور ہلاکت خیزیوں اور خونیں انقلاب کے بیج بو گئی تھی۔

تالی منار کی بندرگاہ کی چھوٹی سی گودی کی ایک جانب سبز رنگ کی ٹرین کھڑی تھی۔ ہمیں اور دوسرے مسافروں کو اس ٹرین میں سوار ہو کر کولمبو جانا تھا۔ ہمارے ٹکٹ اور میڈیکل سرٹیفکیٹ جہاز کھڑا ہونے کے ساتھ ہی چیک کر لئے گئے تھے۔ لنکا کی کسٹم کا عملہ سرسری چیکنگ کے لئے جہاز پر آ گیا تھا یہ ڈیوٹی انہوں نے جہاز میں

بھی ادا کر دی تھی۔ کولمبو کو جانے والی گاڑی کی ایک جانب انجن سے لے کر پچھلے ڈبے تک لمبا کوریڈور بنا ہوا تھا۔ بھائی جان نے بتایا کہ یہ ساری رات اور اگلے آدھے دن کا سفر ہے۔ گاڑی اگلے دن دوپہر کے وقت کولمبو پہنچے گی۔ میں بہت خوش تھا۔ کیونکہ بھائی جان نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ ٹرین سیلون کے انتہائی گنجان جنگلوں اور پہاڑی سلسلے میں سے گزرے گی۔ ٹرین ٹالی مینار سے چلی تو بارش شروع ہو گئی۔ میں کاریڈور کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر بارش کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ یہ سیلون کی بارش تھی۔ سری لنکا کی بارش تھی۔ اس بارش میں قدرتی جنگلوں کی خوشبوئیں تھیں۔ یہ خوشبوئیں پہاڑیوں' گھاٹیوں اور جنگلوں سے دور دور سے میرے پاس آ رہی تھیں۔ مجھ سے ملنے آ رہی تھیں۔ بارش کی پھوار میرے چہرے پر پڑتی تو میں آنکھیں بند کر لیتا اور مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں خوشبوؤں کے سمندر میں اتر رہا ہوں۔

ساری رات ٹرین لنکا کے جنگلوں میں سے گزرتی رہی۔ دریا بھی آئے۔ میدان بھی آئے۔ کبھی درخت شور مچاتے ٹرین کے قریب سے ہو کر پیچھے کو نکل جاتے۔ کبھی کسی پل کی گڑگڑاہٹ سنائی دینے لگتی۔ میں اندھیرے میں آنکھیں کھول کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتا۔ یاد نہیں کہ اس رات میں سویا بھی تھا یا نہیں۔ صبح کے وقت ٹرین ایک چھوٹے سے سٹیشن پر رکی۔ بارش کی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ پلیٹ فارم بھیگا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم کے اوپر کوئی چھت نہیں تھی۔ سامنے جنگلے کے ساتھ ساتھ اونچے اونچے درخت تھے جن کی شاخیں سرخ پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ایک سیلونی لڑکی اناناس بیچ رہی تھی۔ وہ ہر ڈبے کی کھڑکی کے پاس جاتی۔ وہ میری کھڑکی کے پاس بھی آئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی بانس کی ٹوکری تھی۔ ٹوکری میں کیلے کے سبز پتوں پر سنہری رنگ کے اناناس کے قتلے رکھے ہوئے تھے۔ اس نے میرے قریب آ کر کہا۔

"پائن ایپل سر! ویری سویٹ سر! فائیو سینٹ سر!"

اس لڑکی کا بارش کی پھوار میں بھیگتا چہرہ اور اس کا یہ جملہ آج بھی مجھے پہلے دن کی طرح یاد ہے۔ ٹرین چل پڑی اور اناناس بیچنے والی معصوم لڑکی آہستہ آہستہ مجھ سے دور ہونے لگی۔ میں اسے ٹرین کی کھڑکی میں سے دیکھتا رہا اور اناناس کی خوشبو مجھ سے دور ہوتی گئی اور پھر ایک اور بارش کی پھوار میں بھیگتا معصوم لمحہ اپنی یاد میرے

پاس چھوڑ کر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

زندگی کی ٹرین چلتی چلی جا رہی ہے۔ کوئی سٹیشن آتا ہے۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے۔ اجنبی چہرے کچھ دیر کے لئے سامنے آتے ہیں۔ کچھ پھول کچھ رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ ٹرین چل پڑتی ہے اور یہ سب کچھ پھر کبھی دکھائی نہ دینے کے لئے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ٹرین دوسرے دن دوپہر کے بعد کولمبو پہنچی۔

کولمبو نام کا لنکا میں کوئی ریلوے سٹیشن نہیں ہے۔ کولمبو شہر کے بمبئی کی طرح دو ریلوے سٹیشن ہیں۔ ایک کا نام مرادانہ ہے دوسرے کا نام فورٹ ہے۔ ہماری ٹرین کولمبو کے مرادانہ سٹیشن پر رکی تھی۔ بہت وسیع و عریض سٹیشن تھا۔ ریڈیو سی ایک سیلون کے دو آدمی گاڑی لے کر بھائی جان کو لینے آئے ہوئے تھے۔ ہم ریڈیو کی سٹیشن ویگن میں بیٹھ کر مشہور شاعرن م راشد کے فلیٹ پر آ گئے۔ ن م راشد ان دنوں ریڈیو سی ایک سیلون کی اردو سروس کے انچارج تھے۔ وہ اپنی مدت پوری کر کے واپس دلی جا رہے تھے۔ ان کی جگہ بھائی جان نے بطور انچارج اپنی ڈیوٹی سنبھالنی تھی۔ راشد صاحب نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"سناؤ پہلوان! کیہہ حال اے؟"

یہ جملہ راشد صاحب نے مجھے اس وقت بھی کہا تھا جب ہم بھائی جان کے ساتھ رنگون جاتے ہوئے ان کی دلی میں علی پور روڈ والی کوٹھی میں ٹھہرے تھے۔ میری عمر چھوٹی تھی مگر صحت بڑی اچھی تھی۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ میرے والد صاحب پہلوان تھے اور مجھے پہلوان بنانے اور میری کشتی کیکر سنگھ کے بیٹے سے کرانے کے لئے مجھے خوب کھلایا پلایا کرتے تھے۔

راشد صاحب نے ہمارے لئے کولمبو کے علاقے بوریلا جنکشن کی ایک کوٹھی کے آدھے پورشن کا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ دو دن بعد راشد صاحب دلی واپس چلے گئے اور بھائی جان نے ریڈیو سی ایک سیلون کی اردو سروس کا چارج سنبھال لیا۔ ان دنوں میں ادیب وغیرہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اگر کچھ لکھتا تھا تو محبت بھرے خط یا کبھی ڈائری لکھ لیا کرتا تھا مگر انگریزی اور اردو ادب سے بہت لگاؤ تھا اور کرشن چندر' بیدی' منٹو اور اختر حسین رائے پوری کے افسانے بڑے شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ بھائی جان نے مجھے پندرہ منٹ کا ایک پروگرام دے دیا۔ اس پروگرام کا نام گیت مالا تھا۔ اس میں جاپان اور فلپائن وغیرہ میں مقیم برٹش آرمی کی انڈین پلٹنوں کے لئے فلمی

اور غیر فلمی اردو پنجابی کے گانے نشر کئے جاتے تھے۔ ریڈیو سی ایک سیلون خالص فوجی ریڈیو سٹیشن تھا اور امریکی انتظامیہ کے ماتحت تھا۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ اس کے دو سیکشن تھے۔ ایک اردو سیکشن تھا اور ایک امریکی سیکشن تھا۔ امریکی سیکشن سے اتحادی فوجوں کے برطانوی' اطالوی' آسٹریلوی اور امریکی فوجیوں کے لئے گانے وغیرہ کے پروگرام نشر ہوتے تھے۔ انگریزی میوزیکل پروگرام کا انچارج ایک امریکی موسیقار ڈکڑ پول تھا۔ نوجوان لڑکا تھا۔ انگریزی گانے نشر کرتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ ڈانس بھی کرتا رہتا تھا۔ چونکہ یہ فوجی ریڈیو سٹیشن تھا اس وجہ سے ہماری ایک فوجی کنٹین بھی تھی جس کو نافی کہتے تھے۔ یہ N.A.F.I. کا مخفف تھا۔ یہاں سے ہر پندرہ دن کے بعد ہمیں راشن میں دنیا بھر کی چیزیں بے حد سستے نرخوں پر مل جاتی تھیں۔ بھائی جان جرمن اور انگلش بیئر کے ڈبوں کے بھرے ہوئے کریٹ اٹھوا کر لے آتے تھے۔ انہیں صرف بیئر کا شوق تھا۔ مجھے اعلیٰ سگرٹوں کا شوق تھا۔ مجھے خوشی تھی کہ فوجی کنٹین سے مجھے گولڈ فلیک کا تازہ بتازہ ٹن مل جاتا تھا جو ایئر ٹائیٹ ہوتا تھا اور جس کو کھول کر سب سے پہلی جو خوشبو آتی تھی وہ میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اب ہمیں سگرٹوں میں گھاس بھر کر پلائی جا رہی ہے۔ ان ہی دنوں نافی کی کنٹین پر ایک نیا سگریٹ آیا جس کا نام سینئر سروس تھا۔ بیس سگرٹوں کی سفید رنگ کی چوڑی ڈبی تھی۔ اوپر نیلے رنگوں میں بادبانی جہاز کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ بائی گاڈ! کیا سگریٹ تھا۔

ریڈیو سیلون ایک دو منزلہ کوٹھی میں بنایا گیا تھا۔ یہ کوٹھی کولمبو کارپوریشن کی گراؤنڈ کے سامنے سرخ پھولوں والے درختوں کی سڑک پر واقع تھی۔ یہاں سے ٹریفک بہت کم گزرتی تھی۔ ریڈیو سٹیشن کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی دائیں جانب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جہاں ملٹری ٹرانسپورٹ انچارج مسٹر کانگری بیٹھتا تھا۔ جس کو ہم لوگ مسٹر کانگرو کہا کرتے تھے۔ امریکی اور اردو سروس کے سٹاف کے آنے جانے کے واسطے ٹرانسپورٹ کا وہی انتظام کرتا تھا۔ کوٹھی ساری لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ تھا جہاں ڈیوٹی آفیسر بیٹھتی تھی جو ایک ادھیڑ عمر کی مدراسی عورت تھی۔ ہماری اردو سروس دوسری منزل پر تھی۔ ریڈیو کے سٹوڈیوز پہلی منزل پر تھے۔ اردو سٹاف میں صوبیدار میجر گلستان خان' لیفٹیننٹ صدیقی' حوالدار پیارا سنگھ اور ایک ہندو حوالدار تھا جس کا میں نام اس وقت بھول گیا ہوں۔ اردو سروس کی ٹرانسمیشن صبح نو بجے شروع ہوتی تھی اور گیارہ بجے تک جاری رہتی تھی۔ اس

دوران فوجی بھائیوں کے لئے فلمی غیر فلمی گیت بھی نشر ہوتے تھے۔ پراپیگنڈا تقریر
بھی ہوتی تھیں خبریں بھی ہوتی تھیں اور پنجابی کے گانے بھی سنائے جاتے تھے۔ ہ
ریڈیو کی فوجی گاڑی صبح ساڑھے آٹھ بجے آ کر لے جاتی تھی۔ گیارہ بجے کے بعد
واپس آ جاتا تھا اور پھر کولمبو شہر کی سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے نکل جاتا۔

جس کوٹھی کے آدھے پورشن میں ہم رہتے تھے وہ ایک ولندیزی ن
کرسچین مسٹر جونز کی ملکیت تھی۔ مسٹر جونز سیلون کی چائے کمپنی میں مینجر تھے۔ ب
کم گو شرمیلے اور بیوی سے دب کر رہنے والے آدمی تھے۔ ان کی بیوی مسز جونز
منہ زور دلیر اور باتونی عورت تھی۔ دل کی بڑی نرم تھی مگر زبان کی سخت تھ
انگریزی، سنہالی اور ڈچ تینوں زبانیں فرفر بولتی تھی۔ ویسے وہ ہر ایک سے اس علا
کی شکستہ اردو یا ہندوستانی میں بات کرتی تھی۔ لمبا فراک پہنے دن بھر ننگے پاؤں کو
کے کمروں میں چلتی پھرتی رہتی۔ سگریٹ ہر وقت اس کی انگلیوں میں سلگ رہا ہوتا
اور ہونٹوں کے اوپر پسینہ بھی آیا ہوتا تھا۔ بھاری بدن کی تھی اور مجھ سے ہنس
بات کرتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اسے ملٹری کنٹین میں سے پورٹ وائن
دیا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے میرے ہاتھ میں سینئر سروس سگریٹ کا پیکٹ دیکھ
خوشی سے اچھل پڑی۔

"مسٹر حامید! یہ سگریٹ تم نے کہاں سے خریدے ہیں۔ یہ تو میرا فیور
برانڈ ہوا کرتا تھا۔"

جب میں نے اسے بتایا کہ یہ سگریٹ ہماری کنٹین میں آئے ہوئے ہیں تو
میری خوشامدیں کرنے لگی۔ مجھے وہ عورت اچھی لگتی تھی۔ میں نے دوسرے
اسے سگریٹ کے چار پیکٹ لا کر دیئے اور کہا۔

"مسز جونز! یہ میری طرف سے پریذنٹ ہے۔"

اس نے میرا ماتھا چوم لیا۔ اس کے تین بیٹے تھے جن کی عمریں دس گ
سال کے اندر اندر تھیں۔ ایک کا نام ڈیوڈ تھا۔ ایک کا نام ایلن تھا۔ تیسرے لڑ
نام یاد نہیں رہا۔ وہ کوٹھی کے صحن میں ناریل کے درختوں پر بندروں کی طرح چ
کر ناریل توڑا کرتے تھے۔ شام کے وقت مسز جونز پورٹ وائن کے دو گلاس پینے
بعد بڑے خوشگوار موڈ میں آ جاتی اور اپنے بچوں کو بٹوے سے پیسے نکال نکال
دیتی۔ دوسرے دن جب نشہ اتر جاتا تھا تو اپنے بیٹوں سے ایک ایک پیسہ واپس

لیتی تھی۔ اس کے بیٹے بھی بڑے ہوشیار تھے۔ صاف مکر جاتے اور کہتے۔ ممی! تم نے
تو رات ہمیں کچھ بھی نہیں دیا ---- اور مسز جونز ان کے کان مروڑنے لگتی۔

"نکالو میرے سارے پیسے۔"

جس کچی سڑک پر یہ کوٹھی تھی وہ آگے جا کر بند ہو جاتی تھی۔ اس میں دو
رویہ ناریل کے اونچی اونچی چھتریوں والے درخت تھے اور آمنے سامنے چار پانچ ہی
پرانی طرز کی کوٹھیاں تھیں۔ سامنے والی کوٹھی میں مسز جونز کے رشتے دار رہتے تھے۔
پتہ نہیں وہ کیا کاروبار کرتے تھے زرد چہروں والے پتلے دبلے مرد اور عورتیں تھیں۔
ان میں ایک مرد کی ایک آنکھ پتھر کی تھی وہ ایک پتلی سی لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر
شام کے وقت کوٹھی کے آگے ٹہلا کرتا تھا۔

گرمیوں کا موسم آتے ہی کولمبو میں موسلادھار بارشوں کا سلسلہ شروع
ہو گیا۔ پہلی رات کو زبردست بارش ہوئی۔ میں جس کمرے میں سوتا تھا اس کی
کھڑکیاں لان کی طرف کھلتی تھیں۔ رات کو بارش کی آواز کے ساتھ دھپ دھپ کی
آوازیں بھی آتی رہیں۔ میں بارش کی وجہ سے جاگ رہا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا
تھا کہ یہ آوازیں کس چیز کی ہیں۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو لان میں جگہ جگہ ------
---- ناریل بکھرے ہوئے تھے۔ رات کو تیز ہوا اور بارش میں درختوں پر سے
ناریل ٹوٹ کر گرتے رہے تھے۔ کولمبو کی ساری سڑکیں بے حد پکی تھیں اور اس
طرح بنائی گئی تھیں کہ چاہے جتنی بارش ہو پانی ایک پل کے لیے بھی نہیں ٹھہرتا تھا۔

گال روڈ کولمبو کی مال روڈ تھی۔ یہ بہت کشادہ سڑک تھی اور بڑی لمبی
تھی۔ اس کی ایک جانب جدید عمارتیں اور سٹورز وغیرہ تھے اور دوسری طرف سمندر
کا ساحل سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک چلا گیا تھا۔ سمندر اور سڑک کے درمیان
کاٹیج نما کوٹھیاں تھیں۔ ہر تین چار کوٹھیوں کے بعد ایک چھوٹی سی سڑک نکل کر دور
سمندر تک چلی گئی تھی۔ کافی آگے جا کر کولمبو کا تفریحی ساحل سمندر یعنی بیچ تھا۔ یہ
ساحل سمندر بے حد خوبصورت تھا اور خم کھاتا ہوا چلا گیا تھا۔ سمندر کی لہریں دور
دور سے آ کر ساحل کی ریت کو چوم کر واپس چلی جاتیں۔ غیر ملکی عورتیں بیدنگ
سوٹ پہنے یہاں مردوں اور بچوں کے ساتھ تیرتی نظر آتی تھیں۔ ساحل سے کافی پہلے
ہٹ کا ناریل کے درختوں کا ذخیرہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان درختوں کے نیچے کولمبو کے
مزدور لوگ اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ ناریل کی رسیاں کرگھوں پر بنا کرتے

تھے۔ یہاں کولمبو کی مشہور کلب ماؤنٹ لیونیا کلب تھی۔ اس دومنزلہ کلب کے نیچے ایک جانب سمندر کی جانب ماؤنٹ لیونیا ٹی ہاؤس بھی تھا۔ یہاں میں اور لیفٹیننٹ صدیقی صاحب کبھی کبھی چائے پینے آیا کرتے تھے۔ یہاں سیلون کی اعلیٰ کوالٹی کی چائے ملتی تھی۔ ماؤنٹ لیونیا ٹی ہاؤس میں بڑی خاموشی ہوتی تھی۔ کھڑکیوں کے شیشوں کے پیچھے دور تک کولمبو کا گہرا سبز سمندر نظر آتا تھا۔ سفید وردیوں والے سنہالی بیرے بڑی خاموشی سے چائے کا سامان میز پر رکھ کر چلے جاتے تھے۔ لیفٹیننٹ صدیقی صاحب کو چائے پینے سے زیادہ چائے بنانے کا شوق تھا۔ انتہائی نفاست پسند جوان تھے۔ میرٹھ کے رہنے والے تھے۔ انگریزی اور اردو ادب کے مطالعے نے ان کے مزاج میں پر سکون گہرائی اور متانت پیدا کر دی تھی۔ کبھی فالتو بات نہیں کرتے تھے۔ پائپ پیتے تھے اور آہستہ آہستہ پائپ پیتے ہوئے ان کے چہرے پر ذہانت ابھر آتی تھی۔ شراب وغیرہ بالکل نہیں پیتے تھے۔ جوانی کی عمر میں ہی نہایت شائستہ اور کم گو انسان تھے۔ مجھے ان کی طبیعت بہت اچھی لگتی تھی اور میری ان سے خوب دوستی ہو گئی تھی۔ قیام پاکستان کے چھ سات سال بعد ان سے لاہور میں ملاقات ہوئی تھی۔ دوبارہ ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میری دعا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں اپنے اہل و عیال کے ساتھ خیریت سے ہوں۔ حسن اتفاق سے ریڈیو سیلون کے دنوں کی یادگار ایک تصویر یعنی فوٹو میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہ تصویر ریڈیو سیلون کے سٹوڈیو میں اتاری گئی تھی۔ اس میں اردو سروس کا سارا عملہ موجود ہے۔ میں بھی ہوں اور صدیقی صاحب اور بھائی جان بھی اپنی فوجی وردیوں میں موجود ہیں۔ صدیقی صاحب ٹرن ٹیبل پر بیٹھے ریکارڈ لگاتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ تصویر میں نے اپنی میز کے شیشے کے نیچے لگا رکھی ہے۔ اس پر آتے جاتے جب بھی نظر پڑتی ہے تو کولمبو میں گزارے ہوئے ان خوبصورت دنوں کے ساتھ صدیقی صاحب بھی بہت یاد آتے ہیں۔

ہم بوریلا جنکشن میں رہتے تھے۔ یہاں قریب ہی ایک بودھ خانقاہ تھی۔ میں یہاں سے گزرتا تو خانقاہ میں سے عورتوں اور مردوں کے سنہالی زبان میں یا قدیم بودھ زبان میں اشلوک پڑھنے کی آوازیں اور لوبان اور اگربتیوں کی خوشبوئیں آتیں۔ آگے چوک تھا۔ یہاں سے ایک ٹرام کار ٹمپل روڈ پر سے ہوتی ہوئی آگے لائیٹ ہاؤس والے علاقے کی طرف نکل جاتی تھی۔ میں یونہی سیر کرنے کے لیے ٹرام کار پر بیٹھ کر اگلے چوک تک جاتا اور وہاں سے دوسری ٹرام میں واپس آ جاتا تھا۔

ایک روز موسم ابر آلود تھا۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں چوک میں آ کر ٹمپل روڈ کو جانے والی ٹرام کار میں سوار ہو گیا۔ ٹمپل روڈ پر کافی ٹریفک رہتا تھا اس لیے یہاں ٹرام کار آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ زیادہ کشادہ سڑک بھی نہیں تھی۔ آس پاس کے مکانوں کے صحن اور برآمدے صاف نظر آتے تھے۔ ٹرام کار آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ میں مکانوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک مکان کے صحن میں مجھے فیروزی ساڑھی والی ایک لڑکی استوائی پھولوں کے پودوں کے پاس کھڑی دکھائی دی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ لڑکی کے لمبے بال اس کے شانوں پر کھلے تھے۔ لڑکی بھی ٹرام کار کو گزرتے دیکھنے لگی۔ جب میری اور اس کی نظریں چار ہوئیں تو لڑکی نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اس طرح ہاتھ ہلایا جیسے وہ مجھے جانتی ہو۔

میں یہی سمجھا کہ ٹرام کار میں اس کا ضرور کوئی جاننے والا رشتے دار وغیرہ بیٹھا ہو گا۔ اس نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا ہے۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک لڑکی جو مجھے بالکل نہیں جانتی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلائے۔ میں نے دائیں طرف گردن موڑ کر دیکھا۔ میری دائیں جانب کی ساری سیٹیں خالی تھیں۔ تو کیا اس لڑکی نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تھا، مگر یہ کیسے ممکن ہے؟

میں اگلے سٹاپ پر جا کر ٹرام سے اتر گیا۔ پیچھے سے دوسری ٹرام کار آ رہی تھی۔ میں اس میں بیٹھ کر واپس چل پڑا۔ اب میں خاص طور پر اس مکان کو دیکھنے کی خاطر دائیں طرف والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جب ٹرام کار اس مکان کے سامنے سے گزری تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لڑکی اسی طرح صحن میں کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ بال آبشار کی طرح اس کے شانوں پر گرے ہوئے تھے۔ ٹرام کار سامنے سے گزری تو مجھے دیکھ کر وہ لڑکی مسکرائی اور اسی طرح ہاتھ ہلایا جیسے مجھے الوداعی سلام کر رہی ہو۔ چونکہ وہاں ٹرام کار کی سپیڈ زیادہ نہیں تھی اس لیے میں نے لڑکی کے چہرے کو بھی اچھی طرح سے دیکھا تھا۔ گہرا سانولا رنگ تھا۔ ناک ذرا اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ جو ہاتھ اوپر اٹھا کر وہ ہلا رہی تھی اس میں سونے کی ایک سنہری چوڑی تھی۔ ٹرام کار سے اس لڑکی کے مکان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ مجھے صاف طور پر نظر آئی تھی۔ اب میرے جذبات میں ایک خوشگوار سی ہلچل پیدا ہو گئی تھی۔ چوک میں آ کر میں نے ٹرام بدلی اور ایک بار پھر ٹمپل روڈ کی طرف روانہ ہو گیا۔

جب ٹرام اس کے مکان کے سامنے سے گزری تو میں دھڑکتے ہوئے دل
کے ساتھ اس لڑکی کے مکان کے صحن کو دیکھ رہا تھا مگر صحن خالی تھا۔ لڑکی وہاں پر
نہیں تھی۔ یقین کریں میں نے ٹرام کار میں ٹمپل روڈ کے کئی چکر لگائے لیکن اس
لڑکی کی شکل دوبارہ نظر نہ آئی۔ صحن ایسے خالی پڑا تھا جیسے وہاں کوئی نہ رہ رہا ہو۔ یہ
لڑکی میرے اندر ایک ہلچل سی مچا کر میری نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اتنی دیر
میں بارش شروع ہو گئی اور میں کوٹھی واپس آ گیا۔

رات کو دیر تک اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا کہ اس لڑکی نے میری
طرف دیکھ کر ہاتھ کیوں ہلایا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر کیوں مسکرائی تھی؟ ایسا رومانی
حادثہ پہلے میرے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ میرا اور اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا کہ اس
مجھے دیکھا نہ ہو اور یونہی ٹرام کار کو جاتے دیکھ کر ہاتھ ہلا دیا ہو۔ ٹرام کار اس کے
مکان کی دیوار کے بالکل قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ درمیان میں صرف فٹ پاتھ
ہی تھا۔ اس نے باقاعدہ مجھے دیکھا تھا اور میں نے بھی اسے دیکھا تھا۔ مجھے اس کے
جوڑے میں لگے ہوئے سفید پھول صاف نظر آئے تھے کہ وہ مرجھائے ہوئے ہیں۔
صرف ایک بار ہی نہیں دوسری بار بھی لڑکی میری طرف دیکھ کر مسکرائی تھی اور اس
نے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کہا تھا۔

قدرتی بات ہے کہ میں دوسرے روز بھی ٹھیک اسی وقت ٹرام کار میں بیٹھ
کر اس پراسرار لڑکی کے مکان کے قریب سے گزرا۔ اس وقت وہ لڑکی صحن میں
نہیں تھی۔ صحن بالکل خالی پڑا تھا ایسے جیسے اس مکان میں کوئی نہ رہتا ہو۔ گھر کا کوئی
دوسرا فرد بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ میں ٹرام میں بیٹھا لائیٹ ہاؤس والے چوک تک
گیا۔ وہاں سے دوسری ٹرام پکڑ کے ٹمپل روڈ سے واپس گزرا تو لڑکی کو صحن کے فٹ
پاتھ والے دروازے کے قریب کھڑے دیکھا۔ وہ دروازے کا ایک پٹ کھولے باہر
دیکھ رہی تھی۔ ٹرام کو آتے دیکھ کر اس نے چہرہ ٹرام کی طرف اٹھایا۔ میں ٹرام کی
اسی سائڈ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اب میرا اور لڑکی کا فاصلہ کم ہو گیا تھا۔ جیسے ہی
ہماری آنکھیں ایک دوسرے سے ملیں، لڑکی نے مسکرا کر ہاتھ سے ایسا اشارہ کیا جیسے
مجھے بلا رہی ہو۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت ٹرام سے چھلانگ لگا دوں۔ بڑی مشکل سے
اپنے آپ کو روکا۔ ٹرام اگلے سٹاپ پر کھڑی ہوئی تو میں جلدی سے نیچے اتر کر فٹ
پاتھ پر لڑکی کے مکان کی طرف چلنے لگا۔ لڑکی ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ

را سا سر باہر نکالے مجھے آتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال آگے کو لٹک رہے تھے۔
قریب گیا تو اس نے دروازہ بند کر لیا۔ میں محبت کے معاملے میں شروع سے ہی
اور ہتھ چھٹ تھا۔ آگا پیچھا کچھ نہیں سوچتا تھا۔ میں نے دروازے پر دستک
دی۔ یہ بھی نہ سوچا کہ لڑکی کے باپ، ماں یا بھائی نے دروازہ کھول دیا تو میں
کہوں گا۔ ایک جنون سا مجھ پر طاری تھا۔ میں اب بھی یہی سمجھتا ہوں کہ محبت کا
ر نایاب اسی قسم کی حماقتوں اور جنون خیزیوں سے ہاتھ آتا ہے۔ یہاں جو لوگ
ے کام لیتے ہیں ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا اور وہ ساری زندگی اندھیروں میں
رہتے ہیں۔ دوسری بار دستک دینے پر اسی لڑکی نے دروازہ کھولا۔ وہ بال
لے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی طرف سے مجھے ایسی خوشبو آئی جیسے بہار کی
ت کے پچھلے پہر ہوا گلاب اور موتیے کے پھولوں کی جھاڑیوں میں سے گزر کر
ں طرف آ رہی ہو۔ اس لڑکی کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے
کے چہرے کے افق پر آخری تاریخوں کا سرخ چاند طلوع ہو رہا ہو۔
وہ مسکرا کر دروازے سے پیچھے ہٹ گئی اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اندر
ا۔ اس بے دھڑک بلاوے پر میں ذرا ٹھٹھک گیا۔ دماغ نے کہا۔ اندر مت جانا۔
ے جاؤ گے۔ میں نے اپنے دماغ سے کہا تم بیچ میں نہ آؤ اور بے دھڑک مکان
داخل ہو گیا۔

مکان میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی چیز جس پر میری نظر پڑی وہ چھوٹے سے صحن کی دیوار کے ساتھ کیلے کے درخت تھے۔ ان کے آگے سفید اور نیلے رنگوں کے استوائی پھولوں والی کیاری تھی۔ لکڑی کے چوکور ستونوں والا ورانڈہ خالی تھا۔ ورانڈہ اونچا تھا۔ اس کی تین سیڑھیاں تھیں۔ میں وہاں جا کر رک گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ لڑکی میرے پیچھے بڑے سکون سے قدم اٹھاتی آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا۔ وہ میرے قریب سے گزر کر برآمدے میں آئی اور سامنے والے کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھول کر مجھے اشارے سے بلایا۔ اس وقت میں کچھ گھبرایا لیکن نوجوانی کے جذبات جوش میں تھے۔ میں کسی سنگین خطرے کی پروا کئے بغیر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے لوبان اور اگربتیوں کی ملی جلی خوشبو نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کمرے کی فضا میں اندھیرا اندھیرا تھا۔ لڑکی اندر آگئی اس نے دروازہ بند کر لیا اور بجلی کا بٹن دبایا۔ کمرے میں دیوار سے لگا ہوا مدھم سا بجلی کا بلب روشن ہو گیا۔

یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی ڈھلوان چھت کے اندرونی شہتیر پر تھی۔ فرش پرانی دری سے ڈھکا ہوا تھا۔ بانس کا سبز رنگ کا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ کارنس پر دس سروں والے راون کا بت رکھا ہوا تھا جس کے آگے کانسی کی تھالی میں سفید اور نیلے پھولوں کے درمیان لوبان اور اگربتیاں سلگ رہی تھیں۔ کمرے کی فضا ان کی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔

میں بانس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لڑکی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ گردن ایک طرف بڑی ادا سے جھکائے پراسرار متبسم نگاہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے گہرے سیاہ بال شانوں پر جھکے ہوئے تھے۔ میں کچھ شک میں پڑ گیا تھا کہ اس لڑکی کو جیسا میں نے سمجھا تھا یہ ویسی نہیں ہے۔ اس کا تعلق دوسری قسم کی عورتوں سے ہے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھے۔ میں نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا اور اٹھنے لگا

والا تھا کہ لڑکی نے کہا۔

"تم میرے بارے میں جو سوچ رہے ہو میں ایسی عورت نہیں ہوں"۔

میں حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"تم یہاں اکیلی رہتی ہو؟"

وہ مجھے مسلسل دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"جب سے تم مجھ سے جدا ہوئے ہو میں اکیلی ہوں"۔

عجیب پراسرار سا جملہ تھا۔ اس کی بات میری سمجھ میں نہ آسکی۔ میں نے کہا۔

"میں تم سے کب جدا ہوا تھا۔ ہم تو آج زندگی میں پہلی بار مل رہے ہیں"۔

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اٹھ کر کارنس کے پاس گئی۔ راون کے مجسمے کے آگے جو لوبان اور اگربتیاں سلگ رہی تھیں ان کے اوپر دونوں ہاتھ رکھے پھر ان ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرا اور پلٹ کر مجھے تکنے لگی۔ اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آگئی تھی۔ اس نے کہا۔

"تم مسلمان ہو ناں؟"

"ہاں میں مسلمان ہوں اور تم راون کی پوجا کرتی ہو؟"

"راون ہمارے دیش کا ہیرو تھا۔ اس سے پہلے جب میں سرنگا پٹم میں پیدا ہوئی تھی تو گنپتی کی پجارن تھی۔ اس وقت تم بھی میرے ساتھ ہوا کرتے تھے۔"

مجھے اس عورت پر اب ایک اور شک پڑا۔ ضرور کوئی ذہنی طور معذور عورت تھی۔ ورنہ کوئی صحیح الدماغ عورت ایک غیر مرد کو اس بے باکی سے اپنے خالی گھر میں نہیں بلا سکتی جس طرح اس نے اشارہ بازی سے مجھے اپنے گھر میں بلایا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ عورت تو پاگل ہے مگر اس کے گھر والے پاگل نہیں ہوں گے۔ اگر وہ اوپر سے آگئے تو میری خیر نہیں ہے۔ میں جس دیدہ دلیری سے کام لیتے ہوئے اس کے گھر میں گھس آیا تھا اب وہ دلیری مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا۔ اب میں چلتا ہوں"۔

جیسے ہی میں دروازے کی طرف بڑھا وہ عورت یا لڑکی دوڑ کر میرے سامنے آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"میں تمہیں آکاش کے تمام دیوتاؤں کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ میں دو ہزار برس سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ کیا تمہیں مجھ پر ذرا ترس نہیں آتا؟ کیا تم اس محبت کو بھول گئے ہو جو تمہیں مجھ سے تھی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی"۔

اور اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی دروازے کی طرف بھاگا اور کمرے سے نکل کر ورانڈے سے ہوتا ہوا صحن والے دروازے سے نکل کر بازار میں آ گیا۔

بازار میں آتے ہی میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا اور جلدی جلدی بوریلا جنکشن کے چوک کی طرف چلنے لگا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ عورت میرے پیچھے پیچھے نہ آ رہی ہو۔ میں نے چوک میں آ کر جہاں ٹمپل روڈ ختم ہوتی تھی مڑ کر دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔ وہ عورت مجھے کہیں نظر نہ آئی۔

میں نے اس واقعے کا ذکر کسی سے نہ کیا۔ ریڈیو سیلون کے لیفٹیننٹ صدیقی سے بھی نہ کیا جو کئی معاملوں میں میرا ہم راز تھا۔ بات ہی ایسی تھی کہ اگر میں کسی کو بتاتا تو وہ یہ کہہ کر ضرور میری سرزنش کرتا کہ تمہارا دماغ خراب ہو گیا تھا کہ ایک عورت نے تمہیں اشارہ کیا اور تم سوچے سمجھے بغیر اس کے گھر میں گھس گئے۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں ٹمپل روڈ کی طرف بالکل نہ گیا۔ ایک روز میرا اور لیفٹیننٹ صدیقی کا پروگرام بن گیا کہ فلم "رتن" کا میٹنی شو دیکھا جائے۔ کولمبو کے ڈنٹم سنیما ہاؤس میں فلم "رتن" کا شاید 75 واں ہفتہ چل رہا تھا۔ اس کے گانے بہت مشہور ہوئے تھے اور ہم ریڈیو سیلون کے ڈیسک جاکی پروگرام میں بھی نشر کیا کرتے تھے۔ ریڈیو سیلون سے اپنی اپنی ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ہم نے ریڈیو کی کنٹین میں ہی کھانا کھایا اور وہاں سے سنیما ہاؤس کی طرف چل پڑے۔

کولمبو میں برسات کا موسم پورے جوبن پر تھا۔ دن میں ایک بار ضرور بارش ہو جاتی تھی اور بڑی موسلا دھار۔ بلکہ اندھا دھند بارش ہوتی تھی۔ اس روز بھی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فلم دیکھ کر ہم سنیما ہاؤس سے نکلے تو شام ہو چکی

تھی اور کولمبو کی سڑکوں پر کہیں کہیں بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ شاید میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ صدیقی کولمبو کے فوجی گیریزن کی بارک میں رہتا تھا۔ اس کی فیملی میرٹھ میں تھی۔ بڑے ادب آداب اور رکھ رکھاؤ والا انٹلکچویل ٹائپ نوجوان تھا۔ سنہری رنگ کے سگریٹ ہولڈر میں سگریٹ لگا کر پیتا تھا۔ کبھی کبھی پائپ بھی منہ میں لگا لیتا تھا۔ بہت کم اور بڑے دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کی ہنسی کی آواز بالکل نہیں آتی تھی۔ اردو اور انگریزی ادب سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ برٹش آرمی میں وی سی او تھا اور عمر میں مجھ سے بڑا تھا مگر مجھے بڑے ادب کے ساتھ صاحب کہہ کر بلاتا تھا۔ چہرے پر اور خاص طور پر اس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

فلم دیکھ کر نکلے تو کہنے لگا۔

"چلیں گیریزن میں چل کر چائے پیتے ہیں۔ اتنی جلدی گھر جا کر آپ کیا کریں گے۔"

میں نے کہا۔

"رات ہو گئی اور بارش آ گئی تو رکشا ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔"

صدیقی نے کہا۔

"ارے صاحب! ایسی پریشانی کی کونسی بات ہے۔ اگر بارش آ گئی تو گیریزن کی کوئی نہ کوئی سٹیشن ویگن آپ کو بوریلا جنکشن چھوڑ آئے گی۔"

میں نے کہا۔

"پھر ٹھیک ہے، چلیں۔"

ہم نے ٹیکسی پکڑی اور کولمبو کے فوجی گیریزن کی طرف چل دیے۔ یہ گیریزن شہر سے کچھ فاصلے پر سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں ایک جھیل کے پاس ہی واقع تھا۔ اس کے ارد گرد کوئی پندرہ فٹ اونچی خاردار تاروں والی دوہری دیوار کھڑی تھی اور اندر فوجی بارکیں تھیں جہاں کولمبو میں مقیم برٹش آرمی کی انڈین یونٹ کے فوجی رہتے تھے۔ ان میں پنجاب رجمنٹوں کے فوجی زیادہ تھے۔ میں اس سے پہلے بھی بھائی جان کے ساتھ دو تین مرتبہ آ چکا تھا۔ یہاں کا فوجی ماحول مجھے بڑا پسند تھا۔ خوب رونق رہتی تھی۔ لیفٹیننٹ صدیقی جس بارک میں سوتا تھا وہ زیادہ لمبی بارک نہیں تھی۔ آمنے سامنے پندرہ بیس چارپائیاں بچھی تھیں۔ درمیان میں گزرنے کے لیے کافی جگہ تھی۔ اسی بارک میں وائسرائے کمشنڈ آفیسرز کے علاوہ صوبیدار میجر

کے رینک کے فوجی بھی رہائش پذیر تھے۔

جس وقت ہم گیریزن میں پہنچے ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی اور گیریزن کی بارکوں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ ہم سیدھا فوجی کنٹین میں آ گئے۔ یہاں ہم نے ڈبے کے میٹھے لکویڈ دودھ والی فوجی چائے پی جس کا ذائقہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کے بعد ہم بارک میں آ کر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگا کر باتیں کرنے لگے۔ صدیقی کو اپنا شہر میرٹھ یاد آ گیا۔ میرٹھ کی چھاؤنی کا علاقہ جہاں نیم کے بڑے بڑے گنجان درخت تھے۔ مجھے بھی بہت پسند تھا اور صدیقی کا تو یہ آبائی شہر تھا۔ کہنے لگا۔

"میرٹھ کی برسات مجھے بہت یاد آتی ہے۔ ہم سکول سے بھاگ کر بارش میں بھیگتے، آم کے باغوں میں آم توڑنے جاتے تھے۔ چھاؤنی کی سڑک پر نیم کے درختوں کے نیچے نمکولیاں اٹھا اٹھا کر کھایا کرتے تھے۔ لنکا میں نیم کے درخت نہیں ہوتے۔ میں نے تو نہیں دیکھے۔ تم بنگال کی بارشوں کو بہت پسند کرتے ہو۔ کبھی موقع ملے تو ساون میں میرٹھ ضرور جانا"۔

صدیقی کی چارپائی بارک کی کھڑکی کے پاس تھی۔ صدیقی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ کھڑکی میں سے سری لنکا کی بارشوں کی مرطوب ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ سامنے والی بارکوں کے آگے کچھ فوجی گاڑیاں کھڑی بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ بارکوں کے باہر کھمبوں پر لگے بجلی کے بلبوں کی روشنی میں بارش گرتی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ ہلکی بارش تھی اور اس کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ مجھے بودھ معبدوں میں استوائی پھولوں اور اگر بتیوں کی خوشبوؤں میں عبادت کرتی لڑکیوں کا خیال آنے لگا جن کے سر جھکے ہوئے ہوتے ہیں اور سیاہ بالوں میں گہری پراسرار خوشبو والے پھول سجے ہوتے ہیں۔

ہم نے کھانا بارک میں ہی منگوا کر کھایا۔ اس کے بعد ڈبے کے میٹھے دودھ والی چائے ایک بار پھر پی۔ اس دوران رات کے نو بج گئے تھے۔ بارش بھی رک گئی تھی۔ میں نے صدیقی سے کہا۔

"اب میں چلتا ہوں۔ بھائی جان کو بتا کر نہیں آیا"۔

اس نے کہا۔

"ٹھہرو میں سٹیشن ویگن کا انتظام کرتا ہوں۔"

میں اس خوشبوؤں والی بارش اور ہوا میں بند ویگن میں بیٹھ کر کولمبو کی

سڑکوں پر سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں رکشے میں چلا جاؤں گا"۔

صدیقی کو خدا حافظ کہہ کر میں کولمبو کے فوجی گیریزن سے نکل کر شہر کی طرف جاتی بھیگی ہوئی سڑک پر چلنے لگا۔

وہاں کوئی ٹیکسی رکشا نہیں تھا۔ میرا خیال تھا چوک میں کوئی ٹیکسی یا رکشا مل جائے گا۔ بارش والی راتوں میں مجھے اس علاقے کا تجربہ نہیں تھا۔ چوک میں آیا تو بارش ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ میں نے بش شرٹ، پتلون اور چپل پہنی ہوئی تھی۔ بارش ابھی بوندا باندی کی شکل میں ہو رہی تھی۔ میں فٹ پاتھ پر چلتا گیا۔ سڑک کی بتیاں روشن تھیں۔ بھیگتی سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے گاڑیاں گزر رہی تھیں مگر کوئی رکشا یا ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔

بوندا باندی رک گئی۔

میں نے سگریٹ سلگا لیا۔ یہ اس زمانے کا گولڈ فلیک کا سگریٹ تھا۔ بارش میں اس سگریٹ کا کش لگا کر آنکھیں بند کرتا تھا تو جنوب مشرقی سمندروں کے پراسرار جزیروں میں نیلے اور سرخ پھول سجائے رقص کرتی دیو داسیاں نظر آتیں۔ آنکھیں کھولتا تو سامنے ہزاروں سال پرانے گھنے درختوں والے جنگلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا نظر آنے لگتا۔ جہاں دن کے وقت بھی تاریکی چھائی رہتی اور چاندنی کی پریاں ان جنگلوں کے قریب سے دبے پاؤں سہمی ہوئی گزر جاتیں۔ میں نے گولڈ فلیک کے سگریٹ کا ہلکا سا کش لیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ بارش میں بھیگی ہوئی رات میں جھیل کے کناروں پر جو استوائی کنول کے پھول کھلے ہوتے ہیں ان کو دیکھا جائے۔ میری اس زمانے کی رومانوی مہموں میں میری نیچر کے حسن کی متلاشی بے چین روح کی آوارگیوں کے علاوہ بلند اخلاق چائے، استوائی گھنے جنگلوں کی بارشوں، دیودار کے درختوں کی خوشبوؤں والی کافی اور اس زمانے کے اعلیٰ خاندانی گولڈ فلیک، کریون اے، کیونڈر اور ٹرکش سگرٹوں کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ ان استوائی بارشوں، اس کافی کے تلخ ذائقے اور سگرٹوں کی لذتوں کا تصور کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ میں کہاں سے چلا تھا۔ مجھے کہاں کہاں جانا چاہئے تھا اور میں کہاں آ گیا ہوں۔

اس وقت بوندا باندی پھر سے شروع ہو گئی تھی جب میں کولمبو کی کنول کے پھولوں والی جھیلوں کی طرف چل پڑا تھا۔ یہاں میں دن کے وقت ایک دو بار آ چکا تھا

مگر اب رات کا وقت تھا اور ابر آلود رات نے تاریکی کی گہری چادر اوڑھ رکھی تھی۔ میں اندازے سے ایک چھوٹی سی سڑک پر چل رہا تھا۔ یہ کوئی پہاڑی علاقہ نہیں تھا مگر یہاں چھوٹے چھوٹے ٹیلے اور چٹانوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن کے درمیان جھیلیں تھیں۔ ان چٹانوں اور چھوٹی پہاڑیوں کے پیچھے کچھ فاصلے پر سمندر کا چٹانی ساحل تھا۔ جہاں ایک لائٹ ہاؤس بھی نصب تھا۔ اس لائٹ ہاؤس کی نصف دائرے میں گھومتی ہوئی روشنی کا عکس تھوڑی دیر کے لیے آسمان پر پڑ کر غائب ہو جاتا تھا۔ سنگاپور، ملایا اور برما کی جھیلوں کی طرح کولمبو کی یہ جھیلیں بھی ایک دوسری سے ملی ہوئی تھیں اور آخری جھیل سمندر کی ایک کھاڑی میں جا کر گرتی تھی۔

دن کے وقت لوگ یہاں سیر و تفریح کو آتے تھے اور ان میں کشتیاں بھی چلتی تھیں مگر اس وقت جھیل پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ میرا دیوانہ پن تھا کہ میں اس بارش والی اندھیری رات میں نیلے، کاسنی اور سفید کنول کے پھول دیکھنے ان جھیلوں کی طرف نکل آیا تھا، لیکن یہ دیوانہ پن مجھے اس وقت بھی بہت پسند تھا اور آج بھی مجھے اس سے بڑی محبت ہے اور میں عقل کے ایک ہزار راستے چھوڑ کر اس دیوانگی کے راستے پر چلنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔ میں ہلکی بوندا باندی والی اندھیری رات میں کبھی آنکھیں پوری کھول کر اور کبھی سکیڑ کر ان درختوں کے خاکوں کو دیکھتا جاتا تھا جن کے درمیان جھیلیں تھیں۔ بارش ابھی تک بوندا باندی کی شکل میں ہی تھی۔ آخر میں پہلی جھیل کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں کس قسم کی خوشبو فضا میں موجود تھی؟

کیا میں اسے یاد کر کے لکھوں؟

نہیں! یہ خوشبوئیں تو مجھے اس طرح یاد ہیں جیسے ابھی ایک منٹ پہلے میں ان جھیلوں سے مل کر واپس آیا ہوں۔ یہی تو وہ چیزیں ہیں جن کی یادیں وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ روشن زیادہ تروتازہ ہوتی جا رہی ہیں۔

میں لوگوں کے نام بھول جاؤں، شکلیں بھول جاؤں، سب کچھ بھول جاؤں مگر یہ خوشبوئیں یہ بارشیں اور گرم استوائی راتوں کے جنگل اور ان جنگلوں کی شور مچاتی، درختوں کو اکھاڑ اکھاڑ کر اپنے ساتھ بہاتی بارشیں کبھی نہیں بھلا پاؤں گا۔ میں چاہوں بھی تو قدرت کے حسن کی ان نشانیوں کو نہیں بھلا سکتا۔ جب آدمی جنگلوں، خوشبوؤں اور بارشوں کی محبت میں خدا کی زمین پر پھرتے پھرتے خود جنگل، بارش اور

خوشبو بن جائے تو پھر وہ ان چیزوں کو کیسے بھلا سکتا ہے۔

میرے اوپر اونچے اونچے گھنے درخت تھے جن کی شاخوں پر ہلکی بارش کی بوندیں گرتیں تو شاخوں کے پتے آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ کبھی ان کی سرگوشیوں میں مجھے دبی دبی ہنسی کی آواز آتی اور کبھی ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ گزشتہ خزاں میں شاخوں کے بچھڑے ہوئے زرد پتوں کو یاد کر کے آہیں بھر رہے ہوں۔ جھیل کے کنارے پر سرکنڈے اگے ہوئے تھے۔ آگے جا کر یہ سرکنڈے ختم ہو گئے اور مجھے اندھیرے میں پانی میں سے باہر نکلے ہوئے دو چار کنول کے پھولوں کے دھندلے سے خاکے نظر آئے۔ میں ان کے قریب آ کر جھک کر انہیں دیکھنے لگا۔ کنول کا پھول اپنی خوشبو چھپا کر رکھتا ہے۔ وہ ہر کسی پر اپنی خوشبو کے خزانے نہیں لٹاتا۔ وہ آدمی کو پہچان کر اپنے خوشبو محل کا دروازہ کھولتا ہے۔ کوئی نامحرم اس کے قریب آئے تو وہ اپنی خوشبو کا سانس روک لیتا ہے۔ یہ باتیں مجھے کہاں سے معلوم ہوئیں، اگر ایک کنول کا پھول مجھے نہ بتاتا۔ برسات کی گہرے اندھیرے والی رات میں بھی اس کنول کے پھول نے مجھے پہچان لیا تھا اور مجھے اس کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میرے ہاتھ میں گولڈ فلیک کا جو سلگتا ہوا سگریٹ تھا اس پر بارش کی ایک دو بوندیں اندھیرے میں گریں اور وہ بجھ گیا۔ بجھتے ہوئے بھی اس کلاسیکل سگریٹ میں سے ایسی کڑوی اور گہری خوشبو آئی کہ میرا جی اسے پھینکنے کو نہ چاہا۔ آج ان سگرٹوں کی لاشیں میری یادوں کے عجائب گھروں میں شیشے کی الماریوں میں بند پڑی ہیں۔ کیسے وفا شعار پاک باز سگریٹ تھے کہ ان پر کوئی فلٹر نہیں لگا ہوتا تھا۔ ان کا تمباکو خالص تھا۔ ان کی نکوٹین خالص تھی۔ ان کا زہر خالص تھا۔ پینے والوں کی انگلیاں براؤن ہو جاتی تھیں مگر ان کے پینے سے کسی کو کینسر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی نہیں سنا تھا کہ فلاں آدمی کو سگریٹ پینے سے کینسر ہو گیا اور وہ مر گیا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو اس زمانے میں لوگوں کی زبان پر اس کا چرچا ضرور ہوتا۔ جب کہ آج اعلیٰ سے اعلیٰ اور گھٹیا سے گھٹیا ہر سگریٹ پر فلٹر چڑھا ہوتا ہے۔ پینے والوں کو یقین دلایا جاتا ہے کہ یہ خاص فلٹر ہے۔ یہ سگریٹ کی ساری نکوٹین اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ جاپانی سگرٹوں پر تو یہ بھی لکھا ہوتا کہ ان سگرٹوں میں تارکول بالکل نہیں ہے۔ ان میں نکوٹین بھی نہیں ہے۔ پھر بھی لوگوں کو یہ سگریٹ پی کر کینسر ہو جاتا ہے۔ ایسے ایسے وفا شعار لوگوں نے سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے جنہوں نے سگرٹوں سے ساری زندگی ساتھ نبھانے کا پیمان وفا باندھا تھا۔ جو پیتے

ہیں وہ ڈر ڈر کر پیتے ہیں۔ جو نہیں پیتے وہ پینے والوں کے قریب سے گزرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کہیں انہیں بھی کینسر نہ ہو جائے۔

سوچنا چاہیے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ اس زمانے میں لوگ خالص نکوٹین پی کر بھی لمبی عمریں پاتے تھے۔ ضرور ان کے جسم کے اندر کوئی ایسا تریاق پہلے سے موجود ہوتا ہو گا جو نکوٹین کے زہر کو بے اثر کر دیتا ہو گا۔ میں نے اس تریاق کا بڑا کھوج لگایا مگر ناکام رہا۔ آخر اس راز پر سے آج کے زمانے کے ایک تخریب کار سگریٹ نے پردہ اٹھایا۔ میں نے اس تخریب کار سگریٹ کو پکڑ لیا اور اس سے اس تریاق کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا لیکن ساتھ ہی مجھ سے قسم لے لی کہ میں یہ راز آگے کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ اب میں مجبور ہوں۔ آپ کو یہ راز تو نہیں بتاؤں گا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آج کے زمانے کے سگریٹ بالکل نہ پئیں۔ ان سے واقعی کینسر ہو جاتا ہے۔ ایک تو آج کے زمانے کا آدمی اس تریاق سے محروم ہو چکا ہے جو زہر کے اثر کو زائل کر دیتا تھا دوسرے آج کے زمانے کے سگریٹ دہشت گرد ہیں۔ تخریب کار ہیں۔ ان کا ہر کش آدمی کے اندر تباہ کن دھماکے کرتا ہے۔ پہلے زمانے کے سگریٹ رضاکار ہوتے تھے۔ وہ آدمی کی بڑی مدد کرتے تھے۔ ایسے ایسے خوبصورت خیال پکڑ کر لے آتے تھے کہ آدمی ان کو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔

بارش سے بجھا ہوا گولڈ فلیک کا سگریٹ میرے ہاتھ میں تھا اور اسے پھینکنے کو میرا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں کنول کے ایک پھول پر جھکا ہوا تھا۔ برسات کی اندھیری رات میں مجھے صاف طور پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کنول کا پھول بھی مجھے دیکھ رہا ہے۔ میرے اوپر جو گھنے درخت تھے ان میں اچانک بارش کی موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ پھر کالے کالے بادلوں میں بجلی نے چمک کر سارے منظر کو ایک سیکنڈ کے لیے روشن کر کے پہلے سے زیادہ تاریک کر دیا۔ ساتھ ہی بادل زور سے گرجے اور بارش شروع ہو گئی۔

کولمبو کی بارشیں میں نے بہت دیکھی تھیں۔ یہ بڑی موسلا دھار ہوتی تھیں اور ایک دم شروع ہو جاتی تھیں۔ اس رات بھی ایسے ہی ہوا۔ بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ ہی زور شور سے بارش ہونے لگی۔ میں دوڑ کر درخت کے تنے کے پاس آ گیا۔ بجلی بار بار چمک رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ بارش ایسی ہو رہی تھی جیسے بادلوں میں سے آبشاریں گر رہی ہوں۔ میں درخت کے نیچے بھی بھیگنے

لگا تو سوچا کہ اس سے پہلے کہ سڑک پر بھی ندی بہنے لگے، یہاں سے واپس نکل جانا چاہیے۔

بش شرٹ اور پتلون تو بھیگ ہی گئی تھی۔ میں بارش میں ہی سڑک پر آ گیا۔ ایک تو رات کا اندھیرا، دوسرے موسلا دھار بارش۔ بجلی چمکتی تو ایک سیکنڈ کے لیے جھاڑیاں، درخت اور بارش میں بھیگتی چھوٹی سی سڑک نظر آتی اور پھر گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ میں اندازے سے بارش میں شرابور سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ بجلی کی چمک میں چند قدموں کے فاصلے کو غور سے دیکھ لیتا اور جب اندھیرا چھا جاتا تو تیز تیز قدموں سے اتنا فاصلہ طے کر لیتا۔ چھ سات مرتبہ ایسا کرنے کے بعد ایک بار بجلی چمکی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک ٹیلے کے نشیب میں آ گیا ہوں۔ آتی دفعہ میں یہاں سے بالکل نہیں گزرا تھا۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔ بارش کی وجہ سے مجھے بار بار آنکھوں کو پونچھنا پڑتا تھا۔ بجلی چمکی تو میں وہیں سے واپس ہو گیا۔ اس خیال سے کہ جہاں سے میں غلط راستے پر آ گیا ہوں وہاں پہنچ کر بڑی سڑک پر پہنچنے کی کوشش کروں گا۔

اب بجلی بھی کافی وقفہ ڈال کر چمکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اندھیرے میں بالکل ہی بھٹک گیا۔ نہ اصلی سڑک ملی اور نہ وہ راستہ ہی ملا جہاں سے میں واپس ہوا تھا۔ میں کسی اور ہی طرف نکل آیا تھا۔ اندھیرے میں درخت اور جنگلی جھاڑیوں کے بھوت نظر آ رہے تھے۔ اچانک ڈھلان آ گئی۔ ڈھلان سے اترا تو وہاں پانی ہی پانی تھا۔ میرے پاؤں پانی میں چل رہے تھے۔ بارش مجھے کسی جگہ رک کر سوچنے کا موقع نہیں دے رہی تھی۔ پانی پہلے میرے ٹخنوں تک تھا پھر بڑھتے بڑھتے میری پنڈلیوں تک آ گیا۔ میں ٹھہر گیا۔ خدا جانے میں کسی جھیل کی طرف جا رہا تھا یا آگے کوئی دریا تھا یا کیا تھا۔ سامنے سے درختوں کے سیاہ کالے بھوت نما خاکے بجلی کی ہلکی چمک میں نظر آ جاتے تھے۔ میں دائیں طرف ہو کر آہستہ آہستہ چلنے لگا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ بائیں طرف جھیلیں ہیں۔

پانی میری پنڈلیوں کو چھوتا ہوا مجھ سے آگے آگے جا رہا تھا۔ پہلے اس کا بہاؤ معمولی تھا۔ پھر تیز ہونے لگا۔ مجھے ایک طرف سے ایسی آواز آنے لگی جیسے اوپر سے پانی آبشار کی شکل میں نیچے گر رہا ہو۔ یہاں ارد گرد اتنے درخت تھے کہ بجلی کی روشنی یہاں تک پہنچتے پہنچتے اندھیروں میں تحلیل ہو جاتی تھی۔ جس طرف سے پانی کے زبردست شور کے گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں اس سے ہٹ کر چل رہا تھا۔

جب مجھے پانی کا بہاؤ تیز ہوتا ہوا محسوس ہوا تو میں رک گیا۔ میں نے وہاں سے پیچھے
جانے کا فیصلہ کر لیا اور مڑ کر چلنے ہی لگا تھا کہ ایک جانب سے پانی کا زبردست ریلا آیا
اور میں پانی میں گر پڑا۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر پانی کا
ریلا اس قدر تیز اور زور دار تھا کہ میرے اکھڑے ہوئے پاؤں کہیں ٹک نہیں رہے
تھے۔ میں بے اختیار پانی میں بہا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے پانی کا ریلا مجھے آگے لئے جا رہا تھا
اس کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی تو مجھے محسوس
ہوا کہ میں گہرے پانیوں میں آ گیا ہوں۔ میرے پاؤں تہہ میں نہیں لگ رہے تھے۔
یہ کوئی پرشور برساتی نالہ تھا جس میں ادھر ادھر سے موسلا دھار بارش کا پانی شامل ہو
کر تیز رفتار دھارے کی طرح بہہ رہا تھا اور مجھے درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح
اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہا تھا۔

عجیب صورت بن گئی تھی۔ اندھیری رات ' موسلا دھار بارش اور برساتی
نالے کا طوفانی پانی۔ مجھے تیرنا ضرور آتا تھا لیکن مجھے تیرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔
پانی کی موجیں اچھل اچھل کر ایک طرف سے آ کر مجھ سے ٹکراتیں اور مجھے اپنے
ساتھ اچھال کر دوسرے کنارے کی طرف لے جاتیں - میں دوسری طرف کسی چیز کو
پکڑنے کی کوشش کرتا تو ادھر سے پانی کی اونچی دیوار سی مجھ پر آ کر گرتی اور میں
ایک بار پھر نالے کے وسط میں آ جاتا۔ اندھیرے میں جتنا میں دیکھ سکتا تھا اس سے
مجھے اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ میں ایک طوفانی برساتی نالے میں بہا جا رہا ہوں جس کی
دونوں جانب کے کنارے اونچے ہیں۔ کنارے اونچے ہونے کی وجہ سے پانی میں
زبردست طوفانی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو موجوں کے حوالے کر
دیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

مجھے صرف یہ خطرہ تھا کہ کہیں آگے جا کر یہ برساتی نالہ بلندی سے نیچے چٹانی
پتھروں پر نہ گرتا ہو۔ ایسی صورت میں میرا زندہ بچنا مشکل تھا۔ اچانک بجلی چمکی تو میں
نے جو منظر آنکھ جھپکنے کے وقفے میں دیکھا وہ یہ تھا کہ میری دونوں جانب کنارے
دیواروں کی طرح اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور جس طوفانی نالے میں بہا جا رہا تھا وہ
تھوڑے فاصلے پر ایک پہاڑی سرنگ میں داخل ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ پر خوف سا
طاری ہو گیا۔ خدا جانے پانی کی یہ سرنگ مجھے کہاں سے کہاں لے جائے گی۔ میں زور
زور سے بازوؤں اور ٹانگوں کو تیز پانی میں چلاتا کنارے کی طرف جانے کی کوشش

کرنے لگا کہ شاید کنارے پر کہیں ہاتھ پڑ جائے اور میں پانی کے ریلے کے ساتھ
سرنگ میں جانے سے بچ جاؤں لیکن پانی کا تیز ریلا مجھے آگے ہی آگے لئے جا رہا تھا۔
یہاں تک کہ اندھیرا گھپ چھا گیا اور پانی کی گونج سنائی دینے لگی۔ میں سرنگ میں
داخل ہو گیا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ سرنگ بھری ہوئی نہیں تھی۔ اگر سرنگ پائپ کی طرح پانی
سے بھری ہوتی تو میں کہاں تک پانی کے اندر سانس روک سکتا تھا۔ میں نے ہاتھ اوپر
اٹھایا۔ میرا ہاتھ سرنگ کی چھت سے ٹکرایا۔ سرنگ کی چھت مجھ سے ایک ہاتھ اونچی
تھی۔ پانی کا بہاؤ سرنگ میں آتے ہی زیادہ تیز ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پانی کی
موجوں کے اوپر ڈال دیا تھا اور صرف ہاتھ آگے کو کر رکھے تھے کہ میرا سر کسی پتھر
سے نہ ٹکرا جائے۔ سرنگ کے اندر بھی پانی گہرا تھا اور میرے پاؤں تہہ کے ساتھ
نہیں لگ رہے تھے۔ دل میں یہی خیال آ رہا تھا کہ میں گیریزن سے سیدھا گھر ہی چلا
جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔

ایک جگہ سرنگ مڑی تو میں پانی کے بہاؤ کے ساتھ دیوار سے ٹکرا گیا۔ اس
کے بعد پانی اچانک چڑھنا شروع ہو گیا۔ شاید سرنگ چھوٹی ہونے لگی تھی۔ پہلے پانی
میرے کندھوں تک تھا' پھر گردن تک آ گیا اس کے بعد میری ٹھوڑی بھی پانی میں
ڈوبنے لگی اور سر اوپر سرنگ کی چھت سے ٹکرانے لگا۔ میں گھبرا گیا۔ جتنی دعائیں یاد
تھیں ' پڑھنی شروع کر دیں مگر پانی اوپر ہی اوپر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ پانی میرے سر
کے اوپر سے نکل گیا اور میں پانی کے اندر گھبراہٹ میں ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ بار بار
اوپر آتا کہ شاید سرنگ میں پانی کم ہو گیا ہو مگر ہر بار میرا سر پانی کے اندر ہی اندر
سرنگ کی چھت سے ٹکراتا۔ میں کوئی تربیت یافتہ غوطہ خور نہیں تھا۔ مجھے سانس زیادہ
سے زیادہ روکنے کی مشق بھی نہیں تھی۔ امرتسر کے کمپنی باغ کی بڑی اور چھوٹی
دونوں نہروں میں لڑکپن میں غوطے لگایا کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ آدھا منٹ پانی
کے اندر رہتا تھا۔ اس وقت یقین کریں کہ میرے دل میں سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات
کے اور کسی کا خیال نہیں تھا اور میں اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا۔
میرے پھیپھڑوں میں پانی داخل ہونے لگا تھا۔ دو تین بار بے اختیار ہو کر میں نے
سانس لینے کے لیے منہ کھولا اور پانی کافی مقدار میں میرے حلق میں اتر گیا تھا۔ اس
کے بعد مجھ پر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں پانی

سے لدے ہوئے بادلوں میں تیرتا جا رہا ہوں۔ میری آنکھوں میں روشنی کے چھوٹے چھوٹے نقطے ابھرتے اور پھلجھڑیوں کی طرح پھٹ رہے تھے۔ اس کے بعد روشنی کے یہ نقطے بھی اندھیروں میں ڈوب گئے۔

پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو میں ایک چارپائی پر سیدھا پڑا تھا۔ بانس کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین روشن تھی۔ لالٹین کی روشنی میں چھت کے بانس نظر آئے۔ یہ کوئی جھونپڑی تھی۔ میرا سر چکرا رہا تھا اور جسم میں سخت کمزوری محسوس ہو رہی تھی۔ اتنا میں سمجھ گیا تھا کہ کوئی مجھے پانی میں سے نکال کر یہاں لے آیا ہے۔ میں زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔ جھونپڑی کافی کشادہ تھی۔ کونے میں مٹی کے کچھ برتن پڑے تھے۔ جھونپڑی کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں سوچنے لگا وہ فرشتہ صفت انسان کہاں ہے جو مجھے موت کے منہ سے نکال کر یہاں لایا ہے۔

اتنے میں دروازے کا پردہ ہٹا اور میں نے ایک عورت کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ یہ عورت لالٹین کی روشنی میں آئی تو میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ وہی ٹمپل روڈ والی پراسرار عورت تھی جو مجھے اپنے گھر میں اشارے سے بلا کر لے گئی تھی۔ جس نے مجھ سے عجیب و غریب باتیں کی تھیں اور جس کے گھر سے میں بھاگ آیا تھا۔ وہ چارپائی پر میرے قریب ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر وہی پراسرار مسکراہٹ تھی۔ میں نے کہا۔

"مجھے کس نے پانی میں سے نکالا تھا؟"

اس نے میرے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کی انگلیوں میں سے ناریل کی خوشبو آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تم بولو مت۔ آرام کرو۔"

پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں پیالہ لئے اندر آ گئی۔

"یہ پی لو"۔

اس نے مجھے سہارا دے کر چارپائی پر بٹھا دیا۔ میں نے پوچھا۔

"اس میں کیا ہے؟"

کہنے لگی۔

"یہ عرق ہے"۔

عرق کا لفظ سری لنکا میں بڑا عام فہم تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سری لنکا کی سرکاری ڈسٹری میں جو شراب تیار ہو کر بازار میں فروخت ہوتی تھی اس کا سرکاری نام عرق تھا۔ میں نے ہاتھ سے پیالے کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"یہ شراب ہے، میں نہیں پیوں گا"۔

وہ مسکرائی - اس نے کہا۔

"یہ وہ عرق نہیں ہے۔ یہ لنکا کے جنگلوں کی خاص جڑی بوٹیوں کا ست ہے۔ اس کو پینے سے تم اچھے ہو جاؤ گے"۔

میں نے عرق کا ایک گھونٹ پیا۔ اس کا ذائقہ ایسا تھا جیسے کچے بانس کا رس ہو۔ چونکہ بانس کے درختوں سے میں محبت کرتا ہوں اس لیے سارا عرق پی گیا۔ اس نے واقعی میرے جسم کو بڑی طاقت دی۔ میرے چکر غائب ہو گئے اور طبیعت خوشگوار ہو گئی۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں انسان سے بانس بن گیا ہوں۔ میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ میں بانس نہیں تھا۔ اس نے پوچھا۔

"چکر تو نہیں آتے؟"

"نہیں"۔ میں نے کہا۔

اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ جھونپڑی کس کی ہے۔ کہنے لگی۔

"جو اس جھونپڑی میں آ جائے یہ اسی کی ہے۔ تم اب آرام کرو۔ میں صبح تمہارے پاس آؤں گی"۔

وہ لالٹین کی بتی نیچی کر کے جھونپڑی سے نکلنے لگی تو پلٹ کر میری طرف دیکھا اور مسکرائی۔ پھر پردہ ہٹا کر باہر نکل گئی۔ اس کے جانے کے ساتھ ہی مجھ پر کچھ اس قسم کی غنودگی سی طاری ہونے لگی جیسے عرق میں کوئی خواب آور شے ملائی گئی ہو۔

اس کے بعد مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

جب ہوش آیا تو جھونپڑی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لالٹین بجھ چکی تھی۔ میں چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں غور سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ میں یہی سمجھا کہ میں ایک دو گھنٹے سویا ہوں۔ ابھی تھوڑی سی رات باقی ہے۔ لالٹین اپنے آپ بجھ گئی ہو گی۔ میری طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ جسم کی توانائی بھی واپس آ چکی تھی۔ ذرا سی کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ باہر سے بارش کی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ بارش رک گئی تھی۔ میں نے سوچا کہ تھوڑی دیر بعد صبح ہونے والی ہے۔ مجھے اس عورت کا انتظار نہیں کرنا چاہئے اور یہاں سے گھر کی طرف نکل پڑنا چاہیے۔ بھائی جان میرے رات کو گھر سے غائب رہنے کی وجہ سے سخت پریشان ہوں گے۔

اتنے میں مجھے قدموں کی آہٹ کی آواز آئی۔ میں نے اندازے سے جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے دیا سلائی جلانے کی آواز آئی اور پھر میں نے اسی عورت کو دیکھا کہ وہ لالٹین روشن کر رہی تھی۔ اس نے چمنی کے اندر بتی جلائی اور چمنی نیچے کر دی۔ جھونپڑی میں اجالا ہو گیا۔ میں چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔ میں نے پوچھا۔

"رات کا کیا بجا ہو گا؟"

وہ چارپائی پر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگی۔

"کون سی رات؟ پہلی یا دوسری؟"

میں حیران ہوا - کہنے لگی۔

"تم پوری ایک رات اور ایک دن سوئے رہے ہو۔ یہ دوسری رات ہے اور اس وقت رات کے دس بج رہے ہیں"۔

میں نے گھبرا کہا۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔ تم نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔ گھر میں لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے"۔

وہ بولی۔

"تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ صبح جب تم اپنے گھر جاؤ گے تو وہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ تم صرف ایک رات گھر سے غائب رہے ہو - کہہ دینا

بارش کے طوفان میں پھنس گیا تھا"۔

اس کی یہ عجیب و غریب بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ میں نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مجھے دو راتیں گزر گئی ہوں اور میرے بھائی جان سمجھیں کہ میں ایک رات گھر سے باہر رہا ہوں۔"

وہ کہنے لگی۔

"یہی تو بات ہے جو تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ یقین کرو یہا جھونپڑی میں میرے ساتھ تمہیں دو راتیں گزر چکی ہیں مگر جھونپڑی کے باہر ا پوری ایک رات بھی نہیں گزری"۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ لنکا کی یہ پراسرار عورت زیادہ سے زیادہ پراسرا ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔

"وہ چاہے جو بھی سمجھیں۔ میں اب گھر جانا چاہتا ہوں"۔

اس عورت نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے تمہارا گھر کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔

"کیوں نہیں - میں اپنے بھائی جان کے ساتھ کولمبو کے بوریلا جنکشن میں ر ہوں۔ ہماری کوٹھی کا نام آلسں پیلس ہے"۔

وہ بولی۔

"یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ کیا تم اپنا گھر دیکھنا چاہتے ہو؟"

میں نے دل میں سوچا کہ اسی بہانے یہاں سے تو نکلو۔

میں نے کہا۔

"چلو پھر تم ہی مجھے میرا گھر دکھا دو"۔

"میرے ساتھ آؤ"۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے چارپائی سے نیچے اتارا۔

میں نے کہا۔

"میرا ہاتھ بے شک چھوڑ دو۔ میں اپنے پاؤں پر چل سکتا ہوں"۔

اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ عجیب بات ہے۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا مگر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ مجھے ا

کے ہاتھ کی گرفت اور گرمی اپنے ہاتھ پر باقاعدہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ میرے آگے آگے چلتی جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔

باہر رات کی تاریکی تھی۔ اندھیرے میں وہ رک گئی۔ میں دو قدم چل کر اس کے قریب آیا تو کہنے لگی۔

"زیادہ دور نہیں جانا۔ میرے ساتھ چلتے رہو"۔

اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی۔ ایک بار اس نے ہاتھ سے کھلے بالوں کو پیچھے کیا تو مجھے دار چینی کی بڑی دھیمی سی خوشبو آئی۔ ہمارے کشمیری گھروں میں جب قہوہ تیار ہوتا تھا تو ایسی خوشبو سارے گھر میں پھیلی ہوتی تھی۔ اندھیرے میں وہ مجھے نظر آ رہی تھی اور میں اس کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ کولمبو کا کون سا علاقہ ہے۔ میں جھیلوں سے کتنی دور ہوں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ فاصلے پر درختوں کے درمیان اندھیرے میں روشنی جھلملا رہی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ایک جگہ جھاڑیوں اور درختوں میں زمین سے کوئی پانچ چھ فٹ اونچی مچان پر ایک لکڑی کا کاٹج سا بنا ہوا ہے۔ مچان کے ساتھ سیڑھی لگی ہے۔ برآمدے میں بانس کے ستون کے ساتھ لالٹین روشن ہے۔ میں نے پوچھا۔

"یہاں کون رہتا ہے؟"

اس نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ دروازہ کھول کر وہ مجھے کاٹج کے اندر لے گئی۔ اندر جاتے وہ بانس پر سے لالٹین اتار کر ساتھ ہی لے آئی تھی۔ اندر ایک عجیب خواب ایسا ماحول تھا۔ اس نے لالٹین کارنس پر رکھ دی تھی جہاں چاندی ایسے چمکتے ہوئے پیالے میں تین چار موم بتیاں لگی تھیں۔ اس نے موم بتیاں روشن کر دیں اور لالٹین بجھا دی۔ کمرے کی فضا اور رومانٹک ہو گئی۔ فرش پر قالین بچھا تھا۔ کارنس کے قریب آمنے سامنے دو چھوٹے تخت بچھے تھے جو سرخ قالین کے ٹکڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ سرخ رنگ کے گاؤ تکیے لگے تھے۔ وہ ایک تخت پر گاؤ تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ میں دوسرے تخت پر بیٹھ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ

مجھے یہاں کس مقصد کے لیے لائی ہے۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے اس طرح بیٹھی تھی ہ اس کے سیاہ بال نیچے گاؤ تکیے تک آئے ہوئے تھے۔ لکڑی کی دیواروں پر عجیب م کے رنگین نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس میں سے رطوب رات کی بھیگی ہوئی ہوا آ رہی تھی۔ میں نے اس سے صاف صاف پوچھا کہ وہ مجھے یہاں کیوں لائی ہے۔

"میں اس جھونپڑی میں بھی رات گزار سکتا تھا"۔

وہ میری طرف نیم وا آنکھوں سے تکے جا رہی تھی۔ میں حقیقت اور سراریت کی درمیانی کیفیت میں تھا۔ حقیقت کا دامن بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا اور ندگی کی اسراریت سے بھی کنارہ کش نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میرا یہ تجربہ تھا اور ہے کہ دل کو حقائق سے ماورا چیزوں سے دلچسپی ہو اور آدمی کے دل میں اس بات کی رید خواہش ہو کہ دیکھنا چاہئے کہ زندگی کی دیوار چین کی دوسری طرف کیا ہے اور خواہش عشق کی حد تک پہنچ چکی ہو تو آدمی کو حیران کر دینے والی پراسرار چیزیں ر آنا شروع ہو جاتی ہیں اور ایسے ہی واقعات پیش آتے ہیں جو مجھے پیش آ رہے ے۔ چنانچہ جب اس پراسرار عورت نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے جھونپڑی میں دو راتیں زر گئی ہیں لیکن دنیا والوں کی صرف ایک رات ہی گزری ہے تو کسی حد تک میں ے یقین کر لیا تھا اور میرا آج بھی یہ یقین ہے کہ وقت صرف ہماری قیاس آرائی ہی ے لیکن میں اس پراسرار عورت سے یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر وہ مجھ سے تی کیا ہے۔

جب میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ مجھے یہاں کس مقصد کے لیے لائی ہے اس نے خواب آلود آواز میں کہا۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ وہاں لے جانا چاہتی ہوں جہاں آج سے ہزار سال ے ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے"۔

ماورائیت اور اسراریت سے مجھے محبت ضرور تھی لیکن میں اس بات کے ے بھی تیار نہیں تھا کہ گولڈ فلیک کے سگرٹوں اور گولڈن چائے اور دیودار کے شبودار جنگلوں اور ان جنگلوں کی بارشوں کی دنیا کو چھوڑ کر ایک عورت کے ساتھ رائیت کے اندھیروں میں چھلانگ لگا دوں۔

میں نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور آواگون اور دوسرے جنم پر میرا بالکل یقین نہیں ہے۔ تمہارا اس لیے یقین ہے کہ تم مسلمان نہیں ہو۔ اپنے عقیدے کو تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میں تمہارے ساتھ کسی دوسری دنیا میں جانے کو تیار نہیں ہوں اور میں جانتا ہوں کہ بغیر میرے یقین کے تم مجھے اپنی دنیا میں لے جا بھی نہیں سکو گی"۔

اس کے چہرے پر مایوسی اور کرب کے تاثرات ابھر آئے۔ گاؤ تکیئے کا سہارا چھوڑ کر وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اس کا جسم بے معلوم انداز میں آگے پیچھے ہلنے لگا۔ میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ میں بھاگنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ چہرے سے ہٹا کر بالوں کو پیچھے کیا اور میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ میں نے سوچا کہ ضرور کوئی جادو کرنے والی ہے مگر مجھے یقین تھا کہ مجھ پر اس کے کسی جادو کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔

میں نے کہا۔

"کیا دیکھ رہی ہو؟"

وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

"میں وہ دیکھ رہی ہوں جو تم نہیں دیکھ سکتے"۔

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آہستہ آہستہ چل کر دروازے کے پاس گئی۔ پلٹ کر میری طرف دیکھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس میں کوئی شک شبہ نہیں کہ مجھے زندگی کی دیوار کی دوسری طرف کی چیزوں کو دیکھنے کا شوق جنون کی حد تک ہے اور چونکہ مجھے ان چیزوں سے عشق ہے اس لیے میں اکثر پراسرار اور عقل و فہم میں سما جانے والی چیزیں دیکھتا رہتا ہوں لیکن میں زندگی کی دیوار پر بیٹھ کر ہی ان پراسرار چیزوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ دیوار کی دوسری طرف چھلانگ نہیں لگانا چاہتا۔ مجھے اپنی حدود کا علم ہے۔ میں ان حدود کے اندر ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میری ساری خوشیاں، سارے دکھ اور ساری لذتیں، ساری اچھی بری یادیں اسی حدود کے اندر میرے ساتھ زندہ ہیں۔ جتنا میں ہوں میں اتنے میں ہی خوش ہوں۔ چنانچہ میں اس عورت کے اسرار سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا اور جب وہ چلی گئی تو اس کے جانے پر بھی مجھے خوشی ہوئی تھی۔ اگر افسوس تھا تو صرف اس بات کا تھا کہ دار چینی کی خوشبو بھی اس کے ساتھ ہی کمرے سے چلی گئی

تھی۔

جب اسے گئے چھ سات منٹ گزر گئے تو میں آہستہ سے تخت پر سے اٹھا اور دروازے کے پاس آ کر رک گیا۔ وہ جاتے ہوئے دروازے کو بند کر گئی تھی۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ دروازے کو ذرا سا کھول کر باہر دیکھا۔ عین اسی لمحے بجلی زبردست آواز کے ساتھ چمکی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ بادل گرجنے لگے۔ ان کی گرج جیسے ریل گاڑی کی طرح کمرے کی چھت کے اوپر سے ہوتی ہوئی دور چلی گئی۔ مجھے بارش کی آواز سنائی دی۔ یہ ایک ایسی آواز ہے جس نے ہیشہ مجھے اپنی طرف بلایا ہے اور پھر جب جنوبی سمندروں کی بارش آدھی رات کو آواز دے تو اگر یہ بارش آدم خور شیروں سے بھرے ہوئے جنگل میں بھی ہو رہی ہو تو میں بے اختیار اس جنگل کی طرف دوڑ پڑوں گا۔ میں نے دروازے کے دونوں ٹ کھول دیے۔ ٹھنڈی مرطوب ہوا کا تیز جھونکا جیسے میرے بدن کے اندر سے ہو کر ل گیا۔

بارش بانس کے ستونوں والے برآمدے کے باہر ہو رہی تھی۔ میں برآمدے یں آ کر ایک ستون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ مجھ پر بارش کی پھوار پڑنے لگی۔ رات کے ندھیرے میں بارش دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی پھوار میرے چہرے پر پڑ ہی تھی۔ بارش، رات کا بھیگا ہوا جسم ہے اور اس بارش کی پھوار اس کے بھیگتے ئے بدن کا لمس ہے۔ بدن کی سرگوشی ہے۔ برآمدے کی ڈھلواں چھت ناریل کی خوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی۔ میں نے اپنا ہاتھ باہر نکال لیا۔ میرے ہاتھ پر بارش کا ا آبشار کی طرح گرنے لگا۔ بارش، بارش، جنوبی سمندروں کے سبز جزیروں کی ش! آدھی رات کو نظر نہ آنے والے پھولوں کی خوشبوئیں دینے والے جنگلوں کی ش! بحری ڈاکوؤں کے ڈوبے ہوئے بادبانی جہازوں کے طوفانی سمندروں کی بارش! تہ، رنگون، سیلون، ہند چینی کے ریستورانوں میں کافی چائے اور سگاروں کی شبوئیں اڑانے والی بارش! دھیما پور ٹرنکو مالی کی پہاڑی ڈھلانوں پر گھنے درختوں کو ڑوں سے اکھاڑ اکھاڑ کر پھینکنے اور چٹانوں کو گرجدار آوازوں میں لڑھکانے والی ش! انسانوں کی دشمن، انسانوں کی دوست بارش! موسلا دھار بارش! آسمان پر ئے ہوئے سیاہ بادلوں کے سمندر کی ادھ کھلی سیپیوں سے موتیوں کی طرح برسنے بارش! زمین کے سینے میں پانی بن کر اترنے اور سونا بن کر نکلنے والی بارش! گاؤں

فصلوں ، کھیتوں ، آدمیوں کو اپنے ساتھ بہا لے جانے والی اور گاؤں کو آباد کرنے والی اور کھیتوں اور فصلوں کو سر سبز و شاداب کرنے والی بارش! میں بھی تیرے بادلوں کے سمندر سے ٹوٹ کر گرا ہوا موتی ہوں۔ مجھے بھی اپنے ساتھ بہاتی ہوئی ان قدیم چٹانی سمندروں میں لے جا جن کی تہہ میں کبھی دریافت نہ ہونے والے خزانے غرق ہیں اور جن کی گہرائیوں میں ایسے ایسے شہر، ان شہروں کی گلیاں، ان گلیوں کے مکان ، ان مکانوں کے خوبصورت لوگ اور ان لوگوں کی تہذیب و ثقافت ڈوبی ہوئی ہے ، آسودہ آب ہے۔ جن کی تہذیبیں ، اس وقت اپنے نقطہ عروج پر تھیں جب ہماری تاریخ کی ابھی بنیاد بھی نہیں پڑی تھی۔ اے زمین پر نئے نئے پھول کھلانے ، نئی نئی تہذیبوں کو جنم دینے والی بارش ، مجھے بھی اپنے ساتھ بہاتی ہوئی لے جا اور مجھے بھی بحری ڈاکوؤں کے خزانے کی طرح سمندر میں ہمیشہ کے لیے غرق آب کر دے۔ مگر ذرا ٹھہر جا! مجھے سیلون کی چائے اور پرانے گولڈ فلیک سگرٹوں پیکٹ اپنے ساتھ لے آنے دے۔

میں نے بارش کی پھوار والے برآمدے میں کھڑے کھڑے پتلون کی جیب میں سے گولڈ فلیک کا پیکٹ نکالا جو چار پانچ سگریٹ اس میں تھے ان کا کاغذ الگ اور تمباکو الگ ہو گیا تھا۔ کاغذ اور تمباکو گیلے ہو کر ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے میں نے بارش سے کہا۔ آئی ایم سوری میری پیاری بارش! اس وقت میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔ پھر کبھی سہی۔

اب مجھے فکر ہوئی کہ وہاں سے نکل کر بوریلا جنکشن اپنے گھر کیسے پہنچوں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کس علاقے میں ہوں۔ میں برآمدے میں لکڑی کے فرش پر بیٹھ گیا۔ پراسرار عورت کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ رات کے نو دس بجے کا وقت ہے۔ اگر میں وہاں صبح ہونے کا انتظار کروں تو میں مجھے ساری رات برآمدے میں بیٹھ کر گزارنی تھی۔ میں کمرے میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ کمرہ جہاں بتیاں روشن تھیں اور تخت پر سرخ قالینوں کے ٹکڑے بچھے ہوئے تھے اور دیوار پر عجیب قسم کے دیو مالائی نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ اب مجھے جنوں بھوتوں کا لگنے لگا تھا۔ میں جنوں بھوتوں سے ڈرتا نہیں تھا اور نہ ہی انہوں نے بھی مجھے ڈرایا تھا پھر بھی میں ان کے ساتھ رات نہیں گزار سکتا تھا۔ وہیں بیٹھا بارش کی سنتا رہا۔ اندھیری رات میں اسے دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

آخر بارش رک گئی۔

میں کاٹیج کے مچان کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔ معمولی سی پھوار پڑ رہی تھی۔ میں نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ ایک دھندلی سی پگڈنڈی کاٹیج کے مچان کے پیچھے کی طرف چلی گئی تھی۔ یہاں چونکہ زمین نشیبی تھی اس لیے بارش کا پانی وہاں رکا نہیں تھا۔ میں نے سوچا چل پڑنا چاہیے۔ آخر میں شہر کے مضافات میں ہوں۔ کسی جنگل میں نہیں ہوں۔ کہیں نہ کہیں شہر کی کسی نہ کسی سڑک پر نکل ہی آؤں گا۔ میں پگڈنڈی پر چل پڑا۔ لگتا تھا کہ اس پگڈنڈی پر لوگ آتے جاتے رہے ہیں۔ کچھ دور چلنے کے بعد ناریل کے درختوں کا بہت بڑا ذخیرہ آ گیا تھا۔ اندھیرے میں بھیگے ہوئے درخت ٹپک رہے تھے۔ ناریل کے درختوں میں چلنے کے لیے کافی کھلی جگہ تھی۔ مجھے صرف سانپوں کا ڈر تھا۔ سانپوں سے ویسے بھی میں بہت ڈرتا ہوں۔ میں احتیاط کے طور پر دو چار قدم چلنے کے بعد زمین پر زور سے پاؤں مار دیتا تھا کہ اس کی دھمک سے اگر سانپ وغیرہ گھاس میں کہیں چھپ کر بیٹھا ہو تو بھاگ جائے۔

ناریل کے درختوں کے تنے کالے سیاہ ستونوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ درختوں کے اس ذخیرے سے باہر آیا تو کچھ فاصلے پر مجھے روشنیوں کے نقطے جھلملاتے دکھائی دیے۔ یہ یقیناً" کولمبو کی کوئی مضافاتی سڑک تھی۔ میں ادھر کو چلنے لگا۔ آخر میں سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک کی بتیاں روشن تھیں مگر وہاں کوئی آبادی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں ایک جانب روانہ ہو گیا۔ اتنے میں مجھے پیچھے سے کسی گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے سڑک ایک طرف کو گھوم جاتی تھی۔ ادھر گاڑی کی ہیڈ لائیٹس کی روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ روشنیاں سڑک پر بالکل سامنے آ گئیں تو میں نے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔ یہ ایک ٹرک تھا جو چند قدم آگے جا کر رک گیا۔ میں دوڑ کر ٹرک کے پاس گیا۔ سنہالی ڈرائیور نے اپنی زبان میں کچھ پوچھا۔ میں نے کچھ انگریزی کچھ اردو میں کہا کہ مجھے بوریلا جنکشن جانا ہے۔ ڈرائیور نے مجھے اپنی ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا اور ٹرک آگے چل پڑا۔ کوئی آدھے گھنٹے کی مسافت کے بعد ٹرک کے ڈرائیور نے مجھے بوریلا جنکشن کے چوک میں اتار دیا۔

میں گھر پہنچا تو بھائی جان مجھ پر برس پڑے کہ میں فوجی گیریزن سے نکلنے کے بعد کہاں چلا گیا تھا؟ معلوم ہوا کہ مجھے گھر سے غائب ہوئے دو راتیں نہیں گزری

بجیں۔ یہ اسی شام کی رات تھی جب میں صدیقی صاحب کو یہ کہہ کر فوجی گیریژن سے نکل گیا تھا کہ میں اکیلا ہی گھر پہنچ جاؤں گا۔

دوسرے دن دوپہر کے بعد میں نے ریڈیو سیلون کی عمارت سے نکل کر ایک رکشہ پکڑا اور بوریلا جنکشن چوک میں اتر کر گھر کی طرف جانے کی بجائے ٹمپل روڈ کے فٹ پاتھ پر چل پڑا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ پراسرار عورت اپنے گھر پہنچی ہے یا نہیں۔ اس کا مکان ٹمپل روڈ کے وسط میں تھا۔ میں مکان کے قریب آ کر رک گیا۔ مکان کے صحن کا دروازہ فٹ پاتھ کی طرف کھلتا تھا جو بند تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے دروازے کی گھنٹی بجانی چاہیے یا نہیں۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ تین چار مرتبہ بٹن دبانے کے بعد صحن میں کسی بوڑھے آدمی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھلا - میرے سامنے سیاہ رنگ کا سفید بالوں والا ایک بوڑھا سنہالی کھڑا مجھے اپنی زرد آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سنہالی زبان میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں نے انگریزی میں اور پھر ٹوٹی پھوٹی وہاں بولی جانے والی اردو زبان میں اسے کہا کہ میں ریڈیو سیلون سے آیا ہوں۔ یہاں ایک خاتون پروفیسر رہتی ہے۔ ہمیں ان کا انٹرویو لینا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔

سنہالی بوڑھے نے کھانسنے کے بعد نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی زبان میں بتایا کہ وہاں کوئی عورت نہیں رہتی۔ میں نے پراسرار عورت کا حلیہ بتاتے ہوئے کہا کہ میں دو روز پہلے اس خاتون کو اسی مکان میں مل چکا ہوں۔ سنہالی بوڑھے نے کہا کہ مجھے غلطی لگی ہے۔ میں غلط مکان میں آ گیا ہوں اور یہ کہ وہ پانچ سال سے اس مکان میں اکیلا رہ رہا ہے۔ اس نے دروازہ کھول دیا اور بولا۔

"بے شک اندر آ کر دیکھ لو"۔

میں نے صحن میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں لوہے کی تین چار زنگ آلود کرسیاں بانس کی ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی اور اسی قسم کا ٹوٹا پھوٹا گھریلو سامان صحن میں بکھرا پڑا تھا۔ برآمدے میں تخت پر میلا کچیلا بستر بچھا ہوا تھا۔ یہ بوڑھا سنہالی اسی بستر پر سے اٹھ کر آیا تھا۔ میں سنہالی بزرگ کو کھانستا چھوڑ کر فٹ پاتھ پر واپس چل پڑا۔ مکان وہی تھا - مکان کا نمبر وہی تھا جہاں اس پراسرار عورت نے مجھے پہلی بار اپنی طرف بلایا تھا اور پھر مجھے مکان کے اندر لے گئی تھی۔ میں اس مکان کو کیسے بھول سکتا تھا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ عورت ماورائی مخلوق ہی تھی جو کبھی مرئی اور کبھی غیر مرئی شکل

میں زمین کے اوپر کی فضاؤں میں بھٹکتی پھرتی ہے اور جو کسی نہ کسی روپ میں مجھ سے رابطہ کرتی رہتی تھی۔

ان ہی دنوں لیفٹیننٹ صدیقی کا دلی فوجی ہیڈ کوارٹر میں تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ ایک خوش شکل نوجوان کیپٹن فاروق آ گیا جس کا تعلق آٹھویں پنجاب رجمنٹ سے تھا اور جو فوجی اخبار کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہ چکا تھا۔ یہ وہی اخبار تھا جس کے چیف ایڈیٹر مشہور صحافی مولانا چراغ حسن حسرت تھے۔

کیپٹن فاروق بڑا ہنس مکھ اور کھلی طبیعت کا نوجوان تھا۔ میری اس سے بڑی دوستی ہو گئی۔ ہم دونوں مل کر جنوب مشرقی ایشیا میں مقیم برٹش فورس کی ہندوستانی رجمنٹوں کے لیے رنگا رنگ پروگرام لکھتے اور انہیں نشر کرتے۔ ہمارے مزاحیہ فیچر اور گانوں کے ڈیسک جوکی پروگرام فوجیوں میں بے حد مقبول ہونے لگے۔ امریکی میرن کور کے کرنل رچرڈ ریڈیو SEAC سیلون کی امریکی اور اردو سروس کے انچارج تھے۔ وہ ہم دونوں کی کارکردگی کی رپورٹوں سے بڑے خوش تھے۔ کچھ روز پہلے جاپان کے شہر اوکوہاما میں جو امریکی فوجی ریڈیو تھا وہاں سے بھی اردو سروس شروع کی گئی تھی مگر کرنل رچرڈ وہاں کے اردو سروس کے پروگراموں سے مطمئن نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اوکوہاما کی اردو سروس کے پاس تجربہ کار سٹاف نہیں تھا۔ ایک روز کرنل رچرڈ نے مجھے اور کیپٹن فاروق کو اپنے کمرے میں بلایا۔ کافی پلائی اور ہم سے پوچھا کہ کیا ہم جاپان جانا پسند کریں گے؟

کیپٹن فاروق اور میں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں جاپان کیوں بھیجا جا رہا ہے۔

کیپٹن فاروق نے کہا۔

"سر میں تیار ہوں۔"

کرنل رچرڈ نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔

"سر میں بھی تیار ہوں۔"

کرنل رچرڈ نے اس کے بعد بتایا کہ جاپان میں اوکوہاما کی اردو سروس کے پاس کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ہے۔ تم دونوں اس معاملے میں تجربہ کار ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم جاپان جا کر اردو سروس کے پروگراموں کو فوجیوں میں زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کرو۔

ہم نے حامی بھر لی اور کرنل رچرڈ کو یقین دلایا کہ اردو سروس کے پروگراموں کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی ہم بھرپور کوشش کریں گے۔ کرنل چررڈ نے ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور یہ کہہ کر ہمیں رخصت کر دیا کہ میں تمہیں دو دن دیتا ہوں۔ اپنی تیاری مکمل کرلو۔

دو دن کے بعد ہمیں امریکن میرن کے ایک ٹرانسپورٹ شپ پر سوار کرا دیا گیا جو کولمبو سے ہوتا ہوا جاپان جا رہا تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ جہاز پر دشمن کے طیاروں کی بمباری یا سب میرین کے تارپیڈو اٹیک کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بہت بڑا امریکی ٹرانسپورٹ بحری جہاز ایک خاص رفتار سے کولمبو کی بندرگاہ سے نکل کر جاپان کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ کافی طویل سمندری سفر تھا۔ مجھے صحیح یاد نہیں کہ ہم کتنے دن سمندر میں سفر کرتے رہے۔ آخر ہم اوکوہاما پہنچ گئے۔

اتنے سمندروں میں سفر کرنے کے بعد دنیا ہی بدل گئی تھی۔ لوگوں کے چہروں کے نقش و نگار بدل گئے تھے۔ جاپان میں خزاں کا موسم تھا۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ فوجی ریڈیو سٹیشن شہر کے مضافات میں تھا۔ یہ ایک فوجی بیرک تھی۔ جس میں لکڑی کی دیواروں کی پارٹیشن کرکے دو سٹوڈیو اور ایک انجینئرنگ روم بنا دیا گیا تھا۔ ان کے درمیان چھوٹا سا دفتر تھا۔ ڈیوٹی روم کونے میں تھا جہاں ایک حوالدار باوردی بیٹھا اردو ریڈیو پروگراموں کی مانیٹرنگ کر رہا تھا۔ اردو سروس کا انچارج پوٹھوہار کا ایک گرانڈیل میجر تھا۔ جانگلی کا لفظ ہر وقت اس کی زبان رہتا تھا۔ بلکہ یہ لفظ اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ ہم نے اس کے کمرے میں داخل ہو کر سیلوٹ کیا تو اس نے میری طرف اشارہ کرکے کیپٹن فاروق سے کہا۔

"اچھا یہ وہی سی او رینک کا نیا جانگلی ہے۔"

اس وقت مجھے بڑا غصہ آیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ جانگلی ان میجر صاحب کا تکیہ کلام ہے۔ ویسے بھی جانگلی کا لفظ فوجی بارکوں میں عام بولا جاتا تھا۔ فوجی انسٹرکٹر تو نئے رنگروٹوں کو اسی نام سے پکارتے تھے۔ میں اور کیپٹن فاروق ریڈیو پروگراموں کے بارے میں کافی تجربہ رکھتے تھے مگر اس شعبے میں میجر صاحب کی واقفیت واجبی سی تھی۔ میجر نے سارا کام ہم دونوں کے کندھوں پر ڈال دیا اور کہا۔

"ادھر تم لوگوں کی بڑی ضرورت تھی۔ اب جانگلیوں کو گانے سنانے کا کام تم ہی کرو گے۔"

اس زندہ دل میجر کا نام شاہ زمان تھا۔ دفتر میں ہمارے علاوہ ایک حوالدار رام بھروسے تھا۔ ایک صوبیدار دربارا سنگھ اور ایک ادھیڑ عمر جاپانی خزانچی تھا۔ ہماری اردو یا ہندوستانی سروس دو گھنٹے کی ہوتی تھی۔ اس میں اتحادی فوجوں کا پروپیگنڈا بھی ہوتا۔ مزاحیہ خاکے بھی ہوتے۔ خبریں ہوتیں اور فوجیوں کو ہندوستانی' تامل' تلیگو' کنڑ' پنجابی' گورکالی اور بنگالی فلمی اور غیر فلمی گانے بھی سنائے جاتے۔ اس کے بعد انگریزی سروس شروع ہو جاتی تھی۔

جاپانی قوم ابھی تک ہیروشیما اور ناگاساکی پر گرائے جانے والے ایٹم بموں کی ہلاکت خیزیوں کی زد میں تھی۔ ان دو ایٹم بموں نے ہزاروں انسانوں کو ایک سیکنڈ میں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ ہزاروں زخمی ہسپتالوں میں پڑے موت کا انتظار کر رہے تھے۔ ہر روز ان کے مرنے کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی تھیں۔ جاپان شدید اقتصادی بدحالی کے شکنجے میں تھا۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں۔ اتحادی خاص طور پر امریکی فاتح کی حیثیت سے جاپان میں داخل ہوئے تھے۔ انہیں جاپان کی گرتی ہوئی معیشت کی کیا پروا تھی۔ امریکی فوجی ہائی کمانڈ اوکی ناوا اور دوسرے فوجی اہمیت کے جزیروں پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے میں مصروف تھی۔ شدید بے روزگاری تھی۔ صنعتی شہروں پر امریکی طیاروں کی بمباری نے کارخانے تباہ کر دیئے تھے۔ اشیائے خوردنی کی شدید قلت تھی۔ نوجوان جاپانی لڑکیاں اور لڑکے نوکری کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ ہمارے فوجی ریڈیو سٹیشن پر روزانہ کئی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں روزگار کی تلاش میں آتے۔ میجر شاہ زمان نے دفتر کے جاپانی اکاؤنٹنٹ کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ ایسے لوگوں کو فوراً رخصت کر دے۔

میں نے اور کیپٹن فاروق نے پروگراموں کو دلچسپ بنانے کے لئے محنت سے کام شروع کر دیا۔ ہمارے پروگرام فوجیوں میں بے حد پسند کئے جانے لگے۔ سینکڑوں کی تعداد میں فوجیوں کے خطوط آتے۔ اس فوجی ریڈیو سٹیشن کا انچارج ایک امریکی کرنل تھا۔ اس کا نام جوکوب تھا۔ وہ اردو سروس کی کارکردگی سے بے حد خوش تھا۔

ایک روز اس نے ہمیں اپنے کمرے میں بلا کر ہمارے کام کی تعریف کی اور ہمیں کافی پلائی۔ مجھے جاپان کے اس فوجی ریڈیو سٹیشن پر کام کرتے دو مہینے گزر گئے۔ جاپان میں شدید سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ دوسرے تیسرے روز برفباری ہو جاتی تھی۔ اسی دوران ہماری سروس میں مزید ایک ٹائپسٹ کی ضرورت پڑ گئی۔ کام

کی تلاش میں جاپانی نوجوان بھی اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی اکثر آتے رہتے۔ ٹائپسٹ کی اسامی نکلی تو جاپانی اکاؤنٹنٹ نے میجر زمان سے کہا کہ میری ایک رشتے دار کی بچی ہے۔ وہ بڑی اچھی ٹائپسٹ ہے۔ اس کی سپیڈ بھی بہت ہے۔ کسی بینک میں کام کرتی تھے۔ جو اب دیوالیہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ آرڈر کریں تو میں اسے لے آؤں۔ وہ بڑا اچھا کام کرے گی۔

میجر شاہ زمان نے کہا۔

"لے آؤ چاچا لے آؤ۔"

دوسرے روز جاپانی اکاؤنٹنٹ ایک دبلی پتلی زرد رنگ کی جاپانی لڑکی کو اپنے ساتھ لایا۔ جس نے لمبا گرم کوٹ پہنا ہوا تھا۔ سر پر اونی ٹوپی تھی۔ ہمارے سٹاف کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے جھک کر باری باری سب کو سلام کیا اور پھر جاپانی اکاؤنٹنٹ کے ساتھ میجر زمان کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ صوبیدار دربارا سنگھ شیلف سے فلمی ریکارڈ نکال رہا تھا۔ حوالدار رام بھروسے اپنی چھوٹی سی میز پر بیٹھا بڑے مزے سے ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ ٹائپ کر رہا تھا۔ صوبیدار دربارا سنگھ نے ہنستے ہوئے حوالدار رام بھروسے سے کہا۔

"حوالدار تیری نوکری اب گئی۔ جتنی دیر میں تو ٹک ٹک کرکے ایک کاغذ ٹائپ کرتا ہے اتنی دیر میں دس کاغذ ٹائپ کرنے والی جاپانی لڑکی آ گئی ہے۔"

حوالدار رام بھروسے نے کہا۔

"صوبیدار! فکر نہیں۔ اپنی نوکری پکی ہے۔ یہاں ٹائپ نہیں کروں گا تو یونٹ میں کوارٹر گارڈ کی ڈیوٹی پر کھڑا ہو جاؤں گا۔"

کیپٹن فاروق نے اسے تسلی دی۔

"فکر نہیں حوالدار رام بھروسے۔ ہمیں دو ٹائپسٹ چاہئیں۔ تم ہمارے پاس ہی رہو گے۔"

حوالدار رام بھروسے نے صوبیدار دربارا سنگھ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"سن لیا ہے کیپٹن صاحب نے کیا کہا ہے۔ اب آگے بولو"۔

دربارا سنگھ نے ہنس کر کہا۔

"بھگوان نے تمہارا مفت راشن پانی لگا دیا ہے۔ اپنا عیش کرتے رہو۔"

اتنی دیر میں جاپانی لڑکی بوڑھے خزانچی کے ساتھ میجر شاہ زمان کے کمرے

سے باہر آ گئی اور کیپٹن فاروق کے پاس جا کر اسے تین بار جھک کر سلام کیا اور بڑے ادب سے کھڑی ہو گئی۔ جاپانی خزانچی نے کیپٹن فاروق کو ایک کاغذ دیتے ہوئے شکستہ انگریزی میں کہا کہ میجر صاحب نے رپورٹ کرنے کو کہا ہے۔

کیپٹن فاروق نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر پڑھا اور اس پر کچھ لکھ کر مہر لگائی اور جاپانی لڑکی سے انگریزی میں پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے۔ لڑکی نے جھک کر کہا۔

"سر! میرا نام توشیکو ہے۔ آکامی توشیکو۔"

اس جاپانی لڑکی کو جس کا نام توشیکو تھا فوجی ریڈیو سٹیشن کی اردو سروس میں بطور ٹائپسٹ ملازم رکھ لیا گیا۔ میری میز کیپٹن فاروق کے پہلو میں تھی۔ میرے ساتھ ہی توشیکو کے لئے ایک چھوٹی سی میز ڈال دی گئی۔ میز پر ٹائپ مشین رکھ دی گئی۔ توشیکو نے اسی روز سے کام شروع کر دیا۔

یہ جاپانی لڑکی توشیکو بڑی کم گو اور خاموش قسم کی لڑکی تھی۔ اس کے زرد چہرے پر ایک ایسی افسردگی تھی جو مسکراتے وقت بھی اس کے چہرے پر موجود رہتی تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دفتر میں آتی۔ گرم لمبا کوٹ اور اونی ٹوپی اتار کر کرسی کے پیچھے دیوار پر لگی کھونٹی پر لٹکاتی اور کرسی آگے کھینچ کر ٹائپ کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ اس کی سپیڈ حوالدار رام بھروسے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ وہ کیپٹن فاروق کے ماتحت تھی۔ کیپٹن فاروق اسے ٹائپ کرنے کے لئے کام دیتا رہتا۔ اسی دوران اندر سے میجر زمان بھی اسے کسی وقت بلا لیتا۔ وہ سر جھکائے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی میجر شاہ زمان کے کمرے میں چلی جاتی۔ آفس میں وہ کام کی بات کے سوائے کوئی فالتو بات کسی سے نہیں کرتی تھی۔ اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کشش بھی نہیں تھی۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ رنگ زرد تھا۔ جسم میں بظاہر کوئی ہیجان خیزی نہیں تھی۔ اردو اسے بالکل نہیں آتی تھی۔ دفتر میں اسے کسی سے بات کرنی ہوتی تو وہ انگریزی میں کرتی تھی۔ یہ میں نے دیکھا تھا کہ وہ آفس کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں انگریزی بڑی روانی سے بولتی تھی۔ اس کی چھوٹی سی میز میری میز کے پہلو میں تھی۔ اس کے لباس سے کسی قسم کی کوئی رومانی خوشبو بھی نہیں آتی تھی۔ ایک دن کیپٹن فاروق کو کسی جگہ آفس کے کام سے جانا تھا۔ اس نے توشیکو کو ایک ڈرافٹ ٹائپ کرنے کے لئے دیا اور مجھ سے کہا کہ تم چیک کر لینا۔ کیونکہ اس

میں کئی ہندوستانی فلموں کے اردو نام تھے۔ جنہیں رومن الفاظ میں لکھنا تھا۔ توشیکو جب ٹائپ کر چکی تو اس نے مشین سے کاغذ باہر نکالا اور اٹھ کر کاغذ میرے آگے رکھا اور ذرا سا جھک کر انگریزی میں کہا۔

"سر! چیک کرلیں۔"

میں ٹائپ کیا ہوا کاغذ دیکھ رہا تھا اور وہ میرے قریب بڑے ادب سے کھڑی تھی۔ میں نے اسے کہا۔

"توشیکو! تم بیٹھ جاؤ۔ بے شک کرسی میرے قریب کر لو۔"

وہ جھک کر بولی۔

"یس سر۔"

اس نے کرسی میرے قریب کھینچی اور اس پر بیٹھ گئی۔ حوالدار رام بھروسے اور صوبیدار دربارا سنگھ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ اس روز باہر بڑی برفیلی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بارک نما کمرے کے وسط میں امریکن طرز کی بنی ہوئی بخارچی میں آگ دہک رہی تھی۔ مجھے پہلی بار توشیکو کے گرم لباس میں سے کسی پرفیوم کی خوشبو آئی تو میں نے اس سے پوچھا۔

"توشیکو! تم نے کونسا پرفیوم لگایا ہوا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے شرما سی گئی۔ کہنے لگی۔

"سر! یہ میری چھوٹی بہن می ہوکو کا پرفیوم ہے۔ میں آفس آنے لگی تو اس نے میری جرسی پر لگا دیا۔"

میں نے کہا۔

"بڑا اچھا پرفیوم ہے۔ اپنی بہن سے اس کا نام ضرور معلوم کرنا۔"

"تھینک یو سر! اوکے سر!"

دوسرے دن وہ دفتر آئی تو میرے قریب اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"سر میں نے اپنی بہن سے پرفیوم کا نام معلوم کر لیا ہے۔"

اور اس نے مجھے پرفیوم کا جاپانی نام بتایا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں نے کہا کہ اسے کاغذ پر رومن لفظوں میں لکھ دو۔ اس نے چھوٹے سے زرد کاغذ پر پرفیوم کا نام رومن الفاظ میں لکھ کر بڑے ادب سے اٹھ کر میرے آگے رکھ دیا اور ایک بار پھر جھک کر مجھے آداب کرتی ہوئی اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا

کرتے ہوئے کہا۔

"توشیکو! اب تم آفس میں ہماری ساتھی ہو۔ تم بار بار جھک کر سلام کرنے کا تکلف نہ کیا کرو۔"

اس نے اپنی دھیمی نسوانی آواز میں کہا۔

"سر! یہ ہمارا کلچر ہے۔ یہ ہمارے خون میں شامل ہے۔ سر! آئی ایم سوری۔"

توشیکو دفتر میں اونی ٹوپی اتار کر بیٹھتی تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ ہلکا بادامی تھا اور وہ بالکل ہموار اور سیدھے تھے۔ ان میں کسی قسم کا پیچ و تاب نہیں تھا۔ کانوں میں اس نے کبھی سفید موتی پہنے ہوتے تھے اور کبھی ہلکے کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پتھر چمک رہے ہوتے تھے۔ اس کا زرد چہرہ ہمیشہ میک اپ کے بغیر ہوتا تھا۔ جاپانی خزانچی دوسرے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ کسی وقت میجر شاہ زمان کے کمرے کی طرف آتا تو توشیکو اس کو دیکھ کر کرسی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتی' جھک کر سلام کرتی۔ جاپانی خزانچی بھی جھک کر اسے سلام کرتا۔ جاپانی زبان میں دونوں ایک آدھ بات کرتے' خزانچی میجر کے کمرے میں چلا جاتا اور توشیکو دوبارہ اپنا کام کرنے لگتی۔ جاپانی زبان کا ایک لفظ بھی کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ توشیکو مجھے انگریزی بولتی بڑی اچھی لگتی تھی۔ بڑی رومانٹک لگتی تھی مگر جاپانی بولتے ہوئے وہ مجھے کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہوتی تھی۔

اس سے اگلے روز توشیکو دفتر آئی تو حسب معمول اپنا پرانا لمبا اور لیڈیز گرم کوٹ اور اونی ٹوپی اتار کر کھونٹی پر لٹکانے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر اپنے کاغذات دیکھنے لگی۔ اس سے پہلے اس نے جھک کر کمرے میں موجود سب کو سلام کیا تھا۔ جو مجھے بے جا تکلف معلوم ہوا تھا مگر توشیکو بلکہ ہر جاپانی اس معاملے میں مجبور تھا۔ ایک ہی آفس کے کاریڈور میں اگر ان کا آپس میں چھ بار آمنا سامنا ہوتا تو چھ کے چھ بار وہ جھک جھک کر ایک دوسرے کو سلام ضرور کرتے۔ پہلے ہمارے سٹاف کے لوگ بھی توشیکو کے سلام کے جواب میں جھک جاتے تھے۔ اب کوئی ایسا نہیں کرتا تھا۔ بس ذرا سا گردن کا اشارہ کر دیتے تھے۔

میں کوئی فیچر لکھنے میں مصروف تھا۔ کیپٹن فاروق میجر کے کمرے میں گیا ہوا تھا۔ توشیکو نے مشین پر کاغذ چڑھایا اور ٹک ٹک کر کے ٹائپ کرنی شروع کر دی۔ اس

نے آدھا صفحہ ٹائپ کیا ہوگا کہ اٹھ کر دیوار کی طرف گئی۔ اپنے کوٹ کی جیب میں سے چھوٹا سا گتے کا پیکٹ نکال کر میرے سامنے رکھا اور جھک کر انگریزی میں کہا۔

"سر! میری چھوٹی بہن نے آپ کے لئے تحفہ بھیجا ہے۔"

میں نے قلم رکھ دیا اور توشیکو کر طرف دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"سر! کھول کر دیکھ لیں۔"

توشیکو کے چہرے پر مخصوص افسردہ سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے پیکٹ کے گرد لپٹا ہوا سنہری کاغذ الگ کیا۔ اندر ایک لمبوتری ڈبی تھی۔ اسے کھولا تو یہ پرفیوم کی شیشی تھی۔ شیشی پر جاپانی کے علاوہ رومن الفاظ میں بھی پرفیوم کا نام لکھا تھا۔ یہ وہی پرفیوم تھا جس کا نام توشیکو نے مجھے لکھوایا تھا اور جس کی خوشبو کو میں نے پسند کیا تھا۔ میں نے توشیکو سے کہا۔

"یہ تکلیف تم نے کیوں کی؟"

اس نے جھک کر مجھے آداب کیا اور بولی۔

"سر! یہ میری بہن نے اپنی خوشی سے آپ کو تحفہ بھیجا ہے۔"

اور وہ ذرا سا جھکی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر ٹک ٹک ٹائپ کرنے میں مصروف ہوگئی۔

مجھے معلوم تھا کہ پرفیوم کی شیشی توشیکو کی بہن نے نہیں بلکہ خود توشیکو نے خرید کر مجھے دی ہے۔ وہ چھ ڈالر کی تھی اور یہ اس زمانے میں جاپان میں بڑی رقم سمجھی جاتی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ توشیکو کو بھی کوئی تحفہ میری طرف سے ضرور ملنا چاہئے۔ ہمیں امریکی فوجی ریڈیو سٹیشن میں بہت سہولتیں میسر تھیں۔ سمندر پار کے الاؤنس کے علاوہ فوجی کینٹین میں سے ہر شے انتہائی سستے داموں مل جاتی تھی۔ جاپان میں چینی، لپٹن چائے، آسٹریلین شہد، چاول، ٹن بلک اور خالص کوکنگ آئل کی شدید قلت تھی۔ ہمیں ہر ہفتے فوجی کینٹین سے راشن ملتا تھا۔ ہم جتنا چاہے سامان خرید سکتے تھے۔ میں نے ہفتے کے روز کینٹین میں سے چینی، چائے، شہد، چاول ٹن بلک اور امریکی کوکنگ آئل وافر مقدار میں خرید کر اس کا بڑا ڈبہ پیک کروا کر کینٹین میں ہی رکھوا دیا۔ تیسرے پہر چار بجے جب توشیکو چھٹی کر کے دفتر سے جانے لگی تو میں نے اسے کہا۔

"تمہاری چھوٹی بہن کے لئے میں نے اک تحفہ خریدا ہے۔ ملٹری کینٹین میں پڑا ہے۔ میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔"

یہ کہہ کر میں توشیکو سے پہلے دفتر سے نکل گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ توشیکو اوکو ہاما شہر کے گنجان علاقے سے روزانہ دو بسیں بدل کر دفتر آتی ہے۔ وہ اتنا بڑا پیکٹ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تھی۔ میں کینٹین کے باہر برآمدے میں ایک طرف سگریٹ سلگائے توشیکو کا انتظار کرنے لگا۔

رات کو برفباری ہوئی تھی۔ اس وقت برف نہیں گر رہی تھی۔ آسمان پر بادل تھے۔ برف سخت ہو چکی تھی۔ امریکی بل ڈوزروں نے نمک ڈال کر سڑک پر سے برف صاف کر دی تھی۔ صرف کناروں پر برف کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سرد اور برفیلی ہوا چل رہی تھی۔ میں نے گرم امریکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ جسم پر جہاں جہاں جیکٹ تھی وہاں وہاں سردی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے توشیکو کو دیکھا۔ وہ اپنا پرس دستانے والے ہاتھوں میں پیٹ کے ساتھ لگائے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے کینٹین کی طرف چلی آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ برآمدے میں آ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔"

میں نے اسے بتا دیا کہ تحفہ وزنی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ بس میں رکھ کر نہیں لے جا سکے گی۔ ریڈیو سٹیشن کے احاطے کے باہر جاتے ہی مجھے خالی ٹیکسی مل گئی۔ میں اسے لے کر کینٹین پر آ گیا۔ ڈرائیور کی مدد سے گروسری کے سامان والا بھاری پیکٹ ٹیکسی میں رکھوایا۔ جس علاقے میں توشیکو کا گھر تھا اس علاقے کا نام مجھے معلوم تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو پانچ ڈالر دے کر کہا کہ وہ میڈم کو اس کے گھر پہنچا دے۔ توشیکو تو میرا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہی تھی۔

"سر! اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی۔ سر آپ نے بڑی زحمت کی۔ سر میں کس طرح شکریہ ادا کروں۔"

وہ یہ کہتی ہوئی اور بار بار جھک کر مجھے سلام کرتی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ گئی اور ٹیکسی چل پڑی۔

اگلے روز اتوار تھی۔ مجھے ریڈیو سٹیشن کے فوجی احاطے میں ہی ایک بارک کا چھوٹا سا کمرہ رہنے کے لئے ملا ہوا تھا۔ اس میں ٹیلی فون بھی لگا تھا۔ اس لئے کہ

میرا تعلق ریڈیو سٹیشن سے تھا اور ہماری کسی بھی وقت وہاں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اتوار کی صبح کو تو شیکو کا فون آیا۔ کہنے لگی۔

"سر! آپ نے اتنی ساری چیزیں دی ہیں۔ میری بہن' میرا باپ' میری ماں آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ سر! میں بھی آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

پیروار کو تو شیکو آئی تو اس نے مجھے ایک چھوٹا سا پیکٹ دیا۔ اس میں ایک ننھی سی جاپانی گڑیا پیک کی ہوئی تھی۔ یہ گڑیا اتنی معصوم اور خوبصورت تھی کہ آج مجھے تک وہ نہیں بھولی۔ میں نے وہ گڑیا اپنے کمرے میں پلنگ کے پاس چھوٹی میز پر سجا کر رکھ دی۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ ایک روز تو شیکو نے چھٹی کے بعد مجھ سے کہا۔

"سر! میری ماماں ڈیڈی نے اس اتوار کو گھر پر بلایا ہے۔ سر وہ چاہتے ہیں کہ اتوار کی شام کو آپ چائے ہمارے ساتھ پئیں۔"

میں خود کسی جاپانی گھر میں چائے پینے کا خواہشمند تھا۔ میں نے جاپان میں چائے نوشی کی بڑی تعریف اور بڑی عجیب عجیب باتیں سن رکھی تھیں کہ جاپانی چائے نوشی کو ایک عبادت سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا۔

"میں ضرور آؤں گا۔ مجھے اپنے گھر کا ایڈریس بتا دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

اگر آپ نئے نئے جاپان میں گئے ہوں اور کوئی آپ کو اپنے گھر کا ایڈریس بتائے بلکہ لکھا بھی دے تو آپ سارا شہر چھان ماریں آپ کو وہ گھر نہیں ملے گا۔ جس سے پوچھیں گے وہ جھک جھک کر آداب بجا لائے گا اور آپ کو کسی دوسرے راستے پر ڈال دے گا۔ وہ جان بوجھ کر ایسا نہیں کرے گا مگر زبان نہ سمجھنے کی وجہ سے آپ یقیناً غلط راستے پر پڑ جائیں گے۔ میں جاپان میں اگرچہ نووارد نہیں تھا پھر بھی شہر کے گنجان علاقے میں نہیں گیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میں پہنچ جاؤں گا۔ تو شیکو نے مجھے اتوار کے دن شام چار بجے آنے کو کہا تھا۔ میں ٹھیک تین بجے فوجی کینٹین سے کچھ چیزیں پیک کروا کر ٹیکسی میں سوار ہو کر نکل پڑا۔ ایک گھنٹے کی دربدری کے بعد میں تو شیکو کے محلے میں پہنچ گیا۔ یہ شہر کے مضافات کا علاقہ تھا۔ ایک پہاڑی کے دامن میں بانس ٹین اور لکڑی کے ڈبہ نما مکان بنے ہوئے تھے۔ کچھ مکان پہاڑی کی ڈھلان پر تھے۔ کچھ پہاڑی کے دامن میں چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے درمیان تھے۔ یہاں ایک پرانی خانقاہ تھی۔ تو شیکو نے کہا تھا کہ اس خانقاہ کے پیچھے ان کا مکان ہے۔ میں نے ٹیکسی خانقاہ کے دروازے کی ایک طرف کھڑی کی تو مجھے تو شیکو آتی دکھائی دی۔

اس نے وہی پرانا گرم لیڈیز کوٹ اور اونی ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ اکثر مکانوں کے باہر برف کی ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ تو شیکو نے جھک کر مجھے تین بار آداب کیا اور پوچھا کہ مکان تلاش کرنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔ میں نے کہا۔ بالکل نہیں اب میں شہر کے سارے علاقوں سے واقف ہو گیا ہوں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے لکڑی کی پیٹی گاڑی سے نکال کر باہر رکھ دی۔ تو شیکو نے کہا۔

"یہ آپ نے کیوں تکلیف کی سر؟ اس کی کیا ضرورت تھی؟"

میں ان لوگوں کے لئے بہت سی چیزیں لے گیا تھا۔ ان میں چاول' گھی' چینی' چائے' چاکلیٹ' ٹن فروٹ اور میٹھے دودھ کے ڈبے' سارڈین مچھلی کے ڈبے اور تو شیکو کے والد کے لئے امریکی سگریٹ وغیرہ تھے۔ تو شیکو نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے والد کو امریکی سگریٹ بہت پسند ہیں۔ وہیں سے ایک مزدور مل گیا۔ پیٹی اس کے سر پر رکھوائی اور ہم تو شیکو کے مکان کی طرف چلنے لگے۔ ٹین اور لکڑی کی چھتوں والے ڈربہ نما مکانوں کے درمیان ایک تنگ سا رستہ تو شیکو کے مکان کو جاتا تھا۔ ان کا مکان بھی ویسا ہی تھا جیسے وہاں دوسرے مکان تھے۔ تو شیکو کی بوڑھی ماں اور اس کا باپ دونوں دروازے پر کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے تین بار جھک کر آداب کیا۔ اندر دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ بانس کی دیواریں تھیں۔ فرش لکڑی کا تھا جس کے تختے صاف تھے مگر بوسیدہ ہو رہے تھے۔ کونے میں بانس کی تیلیوں والی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ دیوار کے ساتھ بستر لحاف وغیرہ تہہ کئے ہوئے تھے۔ کمرے کے درمیان میں تھوڑی سی جگہ کھود کر انگیٹھی بنائی ہوئی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ ایک لمبی چوکی اور چھ سات گدیاں آمنے سامنے پڑی تھیں۔ جوتے میں نے وہاں کے رواج کے مطابق کمرے کے باہر ہی اتار دیئے تھے۔ میں نے گرم جرابیں پہنی ہوئی تھیں۔ پھر بھی لکڑی کا فرش ٹھنڈا لگ رہا تھا۔ انگیٹھی میں دہکتی ہوئی تھوڑی سی آگ کمرے کی شدید ٹھنڈ کو بڑی مشکل سے گرم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ تو شیکو نے جلدی سے انگیٹھی کے اردگرد گدیاں ڈال دیں۔ وہ لوگ دوزانو ہو کر اور میں آلتی پالتی مار کر آگ کے گرد بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک تو شیکو کی شکل کی مگر عمر میں اس سے ذرا چھوٹی لڑکی اندر آئی۔ جھک کر آداب بجا لائی۔ تو شیکو نے بتایا کہ یہ اس کی چھوٹی بہن می ہو کو ہے۔ جس کو وہ می ہو کہہ کر بلاتے ہیں۔ میں نے پیٹی کھلوا کر انہیں وہ چیزیں پیش کیں جو میں اپنے ساتھ لے گیا

تھا۔ بوڑھے ماں باپ جاپانی زبان میں بار بار سر جھکا کر شکریہ ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ می ہو کو میں نے چاکلیٹ کے دو لمبے پیکٹ دیئے اور انگریزی میں کہا۔

"یہ میں تمہارے لئے لایا ہوں۔"

بہت جلد وہاں گھریلو سی فضا بن گئی۔ توشیکو تو بڑی روانی سے انگریزی بولتی تھی۔ می ہو رک رک کر انگریزی میں اپنا مفہوم ادا کرتی تھی۔ اس کے بوڑھے ماں باپ تو سوائے جاپانی زبان کے اور کوئی زبان نہیں جانتے تھے۔ ان سے کوئی بات کرنی ہوتی تو میں توشیکو کی وساطت سے کرتا تھا۔ ہمارے آگے می ہو نے چھوٹی چھوٹی لکڑی کی چوکیاں رکھ دیں۔ اس کے بعد چھوٹی چھوٹی چینی کی پھولدار پیالیاں لا کر رکھ دیں۔ اس کے بعد وہ چائے کی چینک لائی جس پر بانس کی پتلی پتلی تیلیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ چینک اس نے اپنے بوڑھے باپ کے آگے لا کر رکھ دی۔ بوڑھے جاپانی نے میری طرف دیکھ کر سینے پر ہاتھ باندھ کر تین بار بیٹھے بیٹھے جھک کر آداب کیا اور جاپانی میں کہا۔ توشیکو نے اس کا ترجمہ کر کے کہا۔

"ڈیڈی تم سے چائے پیالوں میں ڈالنے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔"

میں جاپانیوں کی چائے نوشی کی رسومات کے بارے میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ میں نے کہا۔ اجازت ہے۔ بوڑھا بڑے ادب سے اٹھا اور اس نے جھک کر پیالیوں میں چائے ڈالنی شروع کر دی۔ چائے کا رنگ گہرا براؤن تھا۔ اس کے بعد وہ اپنی جگہ پر آ کر اسی طرح دوزانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی بھی اسی انداز میں بالکل ساکت بیٹھی تھی۔ توشیکو نے میرے کان میں آہستہ سے انگریزی میں کہا۔

"جب تک تم اپنی پیالی نہیں اٹھاؤ گے کوئی اپنی پیالی نہیں اٹھائے گا۔"

میں نے اپنی پیالی اٹھا لی۔ می ہو، توشیکو اور ان کے بوڑھے والدین نے بھی اپنی اپنی پیالیاں اٹھا لیں۔ چائے کا ذائقہ کڑوا تھا مگر اس میں ایک خاص قسم کی دھیمی دھیمی خوشبو تھی۔ میں نے چائے کی تعریف کی تو بوڑھے جاپانی نے اپنی بیٹی توشیکو کی طرف دیکھا۔ توشیکو نے اپنی زبان میں اسے کچھ کہا۔ جسے سن کر دونوں بوڑھوں کے چہرے کھل گئے۔ میں توشیکو سے انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔ اس کے بوڑھے والد اور بوڑھی والدہ سے میری آنکھیں چار ہوتیں تو وہ تشکر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جھکا دیتے۔ یہ بڑا ہی تکلیف کی حد تک پر تکلف ماحول تھا۔ میں چائے کی دو پیالیاں پی چکا تو اٹھ کھڑا ہوا۔

"توشیکو! اب میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ بھی جانا ہے۔"

مجھے اٹھتا دیکھ کر توشیکو کے ماں باپ بھی جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب توشیکو کے والد نے امریکی سگرٹوں کا پیکٹ کھول کر ایک سگریٹ سلگا لیا تھا اور جھوم جھوم کر اسے پی رہا تھا اور جاپانی زبان میں بار بار کچھ کہتا جاتا تھا۔ توشیکو نے بتایا کہ ڈیڈی تمہارا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔ یہ لوگ میرے ساتھ مکان کے باہر تک آئے۔ باہر بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ توشیکو میرے ساتھ روڈ تک جانا چاہتی تھی۔ میں نے اسے روک دیا اور اکیلا ہی چل کر مین روڈ پر آگیا۔ یہاں سے ٹیکسی پکڑی اور اپنی فوجی بارک کی طرف روانہ ہوگیا۔

دفتر میں توشیکو کا میرے ساتھ رویہ ایسا ہوگیا کہ ٹائپ کرتے ہوئے کسی وقت میری طرف دیکھ کر افسردہ تبسم کے ساتھ مسکرا دیتی۔ مجھ سے بات کر رہی ہوتی اور اوپر سے کوئی آ جاتا تو چپ ہو جاتی۔ اسے پہلی تنخواہ ملی تو اس نے مجھے ایک جاپانی انڈی پن کا تحفہ دیا۔ اس کے جواب میں میں نے اس کے لئے ایک بڑی خوبصورت لیڈیز جرسی خریدی اور اس کا پیکٹ بنوا کر ڈیوٹی روم میں ڈیوٹی آفیسر کے پاس رکھوا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دفتر سے نکل کر کون سے بس سٹاپ پر آتی ہے۔ میں دس منٹ پہلے دفتر سے نکل کر پیکٹ ہاتھ میں لئے بس سٹاپ پر جا کر کھڑا ہوگیا۔

اس نے مجھے بس سٹاپ پر دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا۔

"سر! کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟"

میں نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"توشیکو! میں یہ چھوٹا سا تحفہ تمہیں دینا چاہتا تھا۔"

اس نے پیکٹ لے لیا اور میں خاموشی سے واپس آگیا۔ ہم بڑی رازداری اور خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔

اوکو ہاما بڑا ماڈرن اور خوبصورت شہر تھا۔ جنگ کے دوران وہاں بمباری
نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ اتنی اہمیت کا صنعتی شہر نہیں تھا۔ اس شہر کی عمارتوں اور
خوبصورتی کو امریکی طیاروں کی بمباریوں نے تباہ نہیں کیا تھا۔ وہاں بڑی مارکیٹیں
تھیں۔ تفریح گاہیں تھیں۔ ریستوران، کلب ہاؤسز، رقص گاہیں، ٹی ہاؤس اور بار تھے
جو راتوں کو جگمگایا کرتے تھے۔ ایسے بار اور ڈانس کلبس بھی تھیں جو ساری ساری
رات کھلی رہتی تھیں۔ ہمارے فوجی ریڈیو سٹیشن سے کچھ فاصلے پر اوکو ہاما کی ایک
جھیل تھی جہاں نائٹ کلب بھی تھا اور ایک ٹی ہاؤس بھی تھا۔ یہ ٹی ہاؤس جھیل کے
کونے میں ایک بڑے رومانٹک اور پرسکون مقام پر واقع تھا۔ میں کبھی کبھی وہاں شام
کے وقت چائے پینے چلا جاتا تھا۔ یہاں جاپانیوں کے خاص روایتی انداز میں گیشا
عورتیں چائے پیش کرتی تھیں لیکن امریکیوں کی آمد کے بعد وہاں فرشی نشستوں کی
جگہ میز کرسیاں ڈال دی گئی تھیں۔ کیونکہ مغرب اور خاص طور پر امریکیوں کے لئے
زیادہ دیر تک گدیوں پر دوزانو ہو کر بیٹھنا بہت وقت طلب کام تھا۔ کرسیوں میزوں
کی وجہ سے وہاں غیر ملکی فوجی جو جاپان کی چائے کا ذوق رکھتے تھے، بھاری تعداد میں
آنے لگے تھے۔

اس ٹی ہاؤس کا نام ٹی ہاؤس ہی تھا۔ جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں یہاں جاپانی
گیشائیں گاہکوں کو چائے پیش کرتی تھیں۔ یہاں جاپانی چائے نوشی کی قدیم روایت سے
صرف اسی قدر انحراف کیا گیا تھا کہ گاہک فرش پر دوزانو ہو کر نہیں بیٹھتے تھے اور
گیشائیں چوکیوں کی بجائے پلاسٹک کی رنگ برنگ میزوں پر چائے پیش کرتی تھیں۔
ایک روز میں نے توشیکو کو ٹی ہاؤس میں چائے پینے کی دعوت دی جو اس
نے ایک شرمیلی اداس مسکراہٹ سے قبول کر لی۔ اس روز دفتر سے مجھے بھی چھٹی
تھی۔ توشیکو دن کے دس بجے جس بس شاپ پر بس سے اتری وہاں میں پہلے سے
موجود تھا۔ آسمان رات ہی سے ابر آلودہ تھا۔ اوکو ہاما کی سڑکیں تو بل ڈوزروں نے

صاف کر دی تھیں مگر فٹ پاتھوں پر برف کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھیں۔ اس برف پر
دو دن سے پیدل چلنے والوں نے ایک راستہ سا بنا دیا تھا۔ ہم برف پوش فٹ پاتھ پر
چلتے ہوئے ٹی ہاؤس کی نیم گرم فضا میں پہنچ گئے۔ دروازے کے اندر ایک گیشا نے
جھک کر ہمارا خیر مقدم کیا۔ اس نے لمبی آستینوں والا کیمونو پہنا ہوا تھا۔ جاپانی عورتیں
جو کیمونو پہنتی ہیں وہ تہہ در تہہ ہوتا ہے اور اس کے اندر جسم بہت دور چلا جاتا
ہے۔ کیمونو کی تہوں کو آپ کھولتے چلے جائیں۔ آپ جسم تک ایک گھنٹے میں پہنچیں
گے۔ ٹی ہاؤس کی فضا میں جاپان کی خانقاہوں میں سلگائی جانے والی اگربتیوں کی بہت
دھیمی سی مہک بسی ہوئی تھی۔ کونوں میں گہرے رنگ کے ریشمی اور کاغذ کے فانوس
روشن تھے۔ جن کی رومانٹک اور مدھم روشنی زیادہ دور تک نہیں جاتی تھی۔ اندر
امریکی اور جاپانی بیٹھے تھے۔ جن میں گیشائیں چائے کی چھوٹی چھوٹی بانس کی تیلیوں والی
چینکیں لئے بڑی شائستگی کے ساتھ بے آواز قدموں سے جھک جھک کر گاہکوں کو
آداب بجا لاتی چل پھر رہی تھیں۔ بڑا خواب ایسا ماحول تھا۔ زیادہ روشنی نہیں تھی۔
میں اس سے پہلے بھی یہاں تین چار مرتبہ چائے پینے آ چکا تھا۔ توشیکو بھی
دو تین دفعہ اپنی سہیلی کے ساتھ یہاں آ چکی تھی۔ ہم ٹی ہاؤس کی گیلری میں دوسری
طرف جھیل کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ کھڑکی کے بند شیشے سے جھیل
پر پھیلی ہوئی دھند اور اس دھند کے پس منظر میں پتلے پتلے خوبصورت درخت سر نکال
کر کھڑے نظر آ رہے تھے۔۔ ہماری میز سے کچھ دور کونے میں دیوار کے ساتھ لگا ہوا
ریشمی فانوس روشن تھا جس کی روشنی ہماری میز تک آتے آتے دھندلے اندھیروں میں
جذب ہو جاتی تھی۔

اس جاپانی ٹی ہاؤس کی فضا میں خانقاہوں والی اداس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
کسی وقت کسی کی میز پر سے آدمیوں کے بولنے کی بہت مدھم آواز آ جاتی تھی جیسے
خانقاہ کے گنبد کے اوپر کہیں کبوتر بول کر چپ ہو گئے ہوں۔ مجھے ٹی ہاؤس کی یہ فضا
ہی یہاں کھینچ کر لے آتی تھی حالانکہ جاپان کی روایتی کڑوی کسیلی چائے مجھے اتنی
زیادہ پسند نہیں تھی۔ توشیکو نے اس روز پرانے لمبے اوور کوٹ کی بجائے نائیلون کی
جرسی اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ ٹی ہاؤس کی گرم فضا میں آ کر اس نے جرسی اتار دی
تھی۔ اونی ٹوپی اور مفلر بھی اس نے اتار دیا تھا۔ دو گیشائیں ہماری میز کے پاس دبے
پاؤں خواب میں نظر آنے والی خوبصورت عورتوں کی طرح آئیں اور جھک کر آداب

بجا لاتے ہوئے ان میں سے ایک نے ہمارے آگے مینو کارڈ رکھ دیا۔ میں نے توشیکو کو بتا دیا تھا کہ ہم چائے پئیں گے۔ وہاں چائے کے علاوہ سمندر کی بعض عجیب و غریب مچھلیوں اور کچھوؤں کا شوربہ بھی ملتا تھا۔ توشیکو نے میز پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے گیشا سے جاپانی میں کچھ کہا۔ وہ مسکرا کر آداب بجا لاتی چلی گئیں۔

تھوڑی ہی دیر بعد ان میں سے ایک گیشا سفید پھولوں کی دو ٹہنیاں لے کر آ گئی۔ ایک پھول بڑے سلیقے سے اس نے میرے آگے بائیں جانب اور دوسرا پھول توشیکو کی بائیں جانب رکھ دیا اور پنکھے سے خود کو ہوا دیتے ہوئے مسکرا کر واپس چلی گئی۔ پھر دوسری گیشا آئی۔ وہ ہمارے آگے چائے کی چھوٹی چھوٹی پھولدار پیالیاں رکھ گئی۔ اس کے بعد دونوں آئیں۔ ایک نے چائے کی بڑی خوبصورت کیتلی اوپر سے اٹھا رکھی تھی۔ دوسری کے پاس سفید پھولوں کی دو ٹہنیاں تھیں۔ جن پر چھوٹے چھوٹے سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ ہماری پیالیوں میں چائے ڈالی گئی۔ پھر ٹہنیوں پر سے ایک ایک پھول توڑ کر ہماری پیالیوں کے سامنے اس طرح رکھ دیئے گئے کہ پھولوں کے چہرے ہماری طرف تھے۔ اس کے بعد ان گیشاؤں نے دھیمی آواز میں عجیب قسم کے ردم Rythem والا کوئی جاپانی گیت گنگنانا شروع کر دیا۔ وہ تین بار ہاتھ جوڑ کر ہماری چائے کی پیالیوں کے آگے جھکیں اور پھر ہاتھ باندھے الٹے قدموں چلتی ٹی ہاؤس کی نیم روشن فضا میں واپس چلی گئیں۔ میں نے توشیکو سے کہا۔

"تم لوگوں نے چائے کو بت پر تکلف بنادیا ہے۔ مجھے ایسے لگ رہا ہے جیسے ان پیالوں میں جو چائے پڑی ہے اس پر جادو کیا گیا ہے۔"

توشیکو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"

ہم چونکہ انگریزی میں بات کر رہے تھے اس لئے وہ آپ کی جگہ مجھ سے تم اور تو کہہ کر مخاطب ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے توشیکو کے مکالمے لکھتے ہوئے میں نے جہاں جہاں اس کی زبان سے آپ کا لفظ استعمال کروایا ہے اسے بھی درست کر لیجئے۔ یہ مجھے اب خیال آیا ہے اس لئے تصحیح کے طور پر لکھ رہا ہوں۔ توشیکو کہہ رہی تھی۔

"میں خود جاپانی ہوں۔ میں اپنی مذہبی رسومات اور روایات کو تقدس کی نگاہ سے دیکھتی ہوں اور ان کا بڑا احترام کرتی ہوں مگر چائے کے معاملے میں یہ روایتی

انداز مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ اس سے چائے سے محبت ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ چائے کی بت پرستی ہے۔ چائے جنگلوں میں چلنے والی بہار کی آزاد ہوا ہے۔ ہم نے اسے خانقاہ کے بند حجرے میں قید کر دیا ہے۔ یہ چائے کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے۔"

توشیکو کی زبان سے چائے کی اس قدر رومانوی سی تعریف سن کر میں خوش بھی ہوا اور کچھ حیران بھی ہوا۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے کبھی اس طرح کی رومانٹک باتیں نہیں کی تھیں۔ کہنے لگی

"اگلی اتوار ہم ایک اور جگہ چل کر چائے پئیں گے۔ تم وہاں چائے کو اپنے اصلی اور نیچرل ماحول میں دیکھ سکو گے۔"

میں نے پوچھا۔

"کیا وہ بھی کوئی جاپانی ٹی ہاؤس ہے؟"

توشیکو نے کہا۔

"وہ ٹی ہاؤس بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ بس تم میرے ساتھ چلنا۔"

مجھے توشیکو کا یہ جملہ کہ تم میرے ساتھ چلنا بڑا اچھا لگا۔ میں نے کہا۔

"توشیکو! میرے لئے یہی خوشی بہت ہے کہ تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی ہو۔"

توشیکو شرما سی گئی۔ ہم اپنی اپنی پیالیاں اٹھا کر خاموشی سے چائے پینے لگے۔ چائے کا ذائقہ کڑوا تھا مگر میں جاپان کی چائے کا عادی ہو گیا تھا۔ چائے سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ توشیکو میرے پاس بیٹھی ہے۔ کھڑکی کا شیشہ باہر کی سردی کی وجہ سے دھندلا ہو رہا تھا۔

توشیکو نے پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

"باہر برف گرنے لگی ہے۔"

اس نے ٹشو پیپر سے شیشے کو اندر کی جانب سے صاف کیا تو مجھے باہر برف کے پھولوں کی پتیوں ایسے ننھے ننھے گالے گرتے نظر آئے۔ توشیکو گرتی برف کو دیکھ کر بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔ کہنے لگی۔

"تھوڑی دیر میں شیشہ پھر دھندلا ہو جائے گا اور گرتی برف نظر آنی بند ہو جائے گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ خاص طور پر جب آدمی چائے پی رہا ہو تو برف گرتی ضرور نظر آنی چاہئے۔ جہاں میں لے جاؤں گی وہاں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں ہمارے

ہماری چائے اور برفباری کے درمیان کوئی شے حائل نہیں ہوگی۔"

اگلی اتوار کو برف تو نہیں گر رہی تھی مگر موسم ابر آلود تھا اور سردی بہت شدید تھی۔ مکانوں کی ڈھلوان چھتوں پر اور سڑک کے کنارے برف جمی ہوئی تھی۔ سڑکوں پر ٹریفک کی آمدورفت بہت کم تھی۔ میں اور توشیکو دوپہر کے بعد بس شاپ پر آکر ملے۔ وہیں سے ایک بس میں سوار ہو کر نیچرل بیوٹی والے ٹی ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ میرا خیال تھا کہ یہ اوپن ائیر قسم کا ٹی ہاؤس ہوگا۔ مجھے یہ خیال بھی تھا کہ وہاں بہت سردی لگے گی کیونکہ ہم کھلی فضا میں بیٹھے ہوں گے مگر وہاں جاکر معلوم ہوا کہ یہ ٹی ہاؤس بانس کے پتلے پتلے اونچے اونچے درختوں کے درمیان ایک گرم پہاڑی چشمے کے پہلو میں واقع تھا۔ لکڑی کے در و دیوار تھے۔ لکڑی کی ڈھلوان چھت تھی جو برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔ سامنے چھوٹے چھوٹے پتھروں والا صحن تھا جس کے درمیان میں گول چبوترے میں ایک سیاہ ٹہنیوں والا پھیلا ہوا درخت تھا۔ توشیکو نے بتایا کہ یہ سیب کا درخت ہے۔ درخت کا رنگ سردی کی وجہ سے سیاہ پڑ چکا تھا اور اسکی ٹہنیوں پر ایک بھی پتا نہیں تھا۔

ٹی ہاؤس ایک لمبوترا کمرہ تھا۔ آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے میں گملے تھے جس میں گل صد برگ نظر آرہے تھے۔ میں انہیں گل صد برگ سمجھ رہا تھا' توشیکو نے کہا۔

"یہ گل صد برگ ہی کی قسم کا ایک پھول ہے جو صرف برفباری کے موسم میں کھلتا ہے۔"

ٹی ہاؤس کے اندر فرش پر چٹائیوں کی بجائے درختوں کے بڑے بڑے مُڈھ کاٹ کر سٹولوں کی طرح رکھے ہوئے تھے۔ میزوں کی جگہ بھی درختوں کے کٹے ہوئے تنے ہی سیدھے پڑے تھے۔ ایک جاپانی جوڑا ایک طرف بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ انہوں نے گرم جیکٹیں اور اونی ٹوپیاں پہنی ہوئی تھیں۔ کیونکہ کمرے کے آمنے سامنے والے دونوں دروازے اور کھڑکیاں کھلی تھیں۔ جن میں سے سرد ہوا اندر آرہی تھی۔ اندر کہیں آگ بھی نہیں جل رہی تھی۔ اندر بھی بڑے بڑے مرتبان نما گملوں میں وہی سردیوں میں کھلنے والے پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ ہم بھی ایک کھڑکی کے پاس کٹے ہوئے تنوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک جاپانی لڑکی گرم جرسی پہنے آگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہمیں جھک کر خوش آمدید کہا۔ توشیکو نے اسے

جاپانی میں کچھ کہا۔ وہ مسکرائی اور جھک کر چلی گئی۔ توشیکو نے کہا۔

"یہاں چائے کے لئے چشمے کا تازہ گرم پانی استعمال ہوتا ہے۔"

جہاں ہم بیٹھے تھے اس کی کھڑکی لمبوتری تھی اور وہاں سے باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ میں نے بھی دستانے پہن رکھے تھے۔ کیونکہ وہاں کافی سردی تھی۔ بانس کے درخت نیچے سے لے کر اوپر تک بالکل سیدھے چلے گئے تھے۔ اوپر جاکر ان کی چھتریاں ایک دوسرے سے مل گئی تھیں۔ توشیکو نے کہا۔

"یہ کورین بانس کے درخت ہیں۔ یہ اوپر جاکر گھنے ہو جاتے ہیں۔ نیچے ان کی جھاڑیاں نہیں بنتیں۔"

گرم چشمے کا پانی تین چار پتھروں کے اوپر سے ہو کر نیچے ایک چھوٹے سے تالاب میں گر رہا تھا۔ اس تالاب میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ یہاں چشمے کے اوپر چیری کے چھوٹے قد کے درختوں کی بے برگ و بار ٹہنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی چھت سی پڑ گئی تھی۔ توشیکو نے کہا۔

"بہار کے دنوں میں جب چیری کے پھول کھلتے ہیں تو یہ منظر بڑا خوبصورت ہو جاتا ہے۔ چاروں طرف فضا میں چیری کے پھولوں کی بڑی دھیمی دھیمی بے معلوم سی خوشبو ہر وقت پھیلی رہتی ہے۔"

جاپانی لڑکی چائے لے کر آگئی۔ بانس کے ایک ٹرے میں چائے کی چینک' دو پیالیاں اور دو سفید پھول رکھے ہوئے تھے۔ ٹرے ہمارے سامنے درخت کے کٹے ہوئے تنے کے میز پر رکھ کر وہ چلی گئی۔ توشیکو نے ایک پھول مجھے دیا اور بولی۔

"یہاں یہ بات مشہور ہے کہ اس پھول کے ساتھ چائے کی شادی ہونے والی ہے اس لئے چائے کے ساتھ یہ پھول ضرور دیا جاتا ہے۔ ٹرے میں خالی چائے کبھی نہیں لے جائی جاتی۔ اسے بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔"

اس نے چائے بنائی۔ چائے کا رنگ طلوع ہوتے سورج کی کرنوں کی طرح سرخی مائل سنہری تھا۔ اس میں سے مجھے بانس کے جنگلوں کی خوشبو آتی محسوس ہوئی۔ میں نے اس کا ایک گھونٹ پیا تو ایسے لگا جیسے باہر کی برف آلود سردی میں ایک گرم سورج میرے جسم کے اندر بھی طلوع ہو گیا ہو۔ میں نے چائے کی تعریف کی۔ توشیکو بڑی خوش ہوئی۔ کہنے لگی۔

"بادل گہرے سرمئی ہو گئے ہیں۔ ہوا بھی رک گئی ہے۔ لگتا ہے برف

گرنے والی ہے۔ اگر برف گرنے لگی تو ہم دوسری پیالی باہر چشمے کے پاس بیٹھ کر گرتی برف میں پییں گے۔ کیا تم برفباری میں میرے ساتھ باہر آ جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔

"میں تمہارے ساتھ بمباری میں بھی باہر آ جاؤں گا۔"

وہ ہنس پڑی۔ ہنسنے سے اس کے رخساروں میں ننھے ننھے سے گڑھے پڑ گئے جنہیں انگریزی میں ڈمپل کہتے ہیں۔ اس سے پہلے وہ میرے سامنے اس طرح کھل کر کبھی نہیں ہنسی تھی۔ یہ خوبصورت ڈمپل میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے اچھے لگے۔ مجھے تو شیکو بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح گلاب کی ٹہنی پر کھلا ہوا سفید پاکیزہ پھول اچھا لگتا ہے۔ تو شیکو کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ باہر برف گرنے لگی۔ پہلے ننھے ننھے سفید ذرے گرنے لگے۔ پھر سفید پھولوں کی چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں گرنا شروع ہو گئیں۔ تو شیکو نے خوش ہو کر کہا۔

"خدا نے میری دعا قبول کر لی۔ برف گرنے لگی ہے۔ اب ہم چائے کی دوسری پیالی چشمے کے پاس بیٹھ کر پییں گے۔"

میں نے کہا۔

"او کے۔"

•

ہم نے چائے کی چینک اور اپنی اپنی پیالی اٹھائی اور ٹی ہاؤس کے کاٹیج سے نکل کر چشمے کے پتھروں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہمارے اوپر چیری کے بے برگ و بار درختوں کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے برف کی بے آواز' بے وزن پنکھڑیاں ہم پر گر رہی تھیں۔

چشمے کا گرم پانی نیلے اور سبز پتھروں پر سے اچھلتا ہوا ایک چھوٹے سے نالے کی شکل میں ایک چوبچے میں گر رہا تھا۔ پانی میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی کافی گرم تھا۔ تو شیکو نے بتایا کہ یہاں کوئی نہاتا نہیں۔ کیونکہ پانی بڑا گرم ہے۔ آگے جا کر جہاں یہ پانی ایک تالاب میں گرتا ہے وہاں لوگ نہانے کے لئے آتے ہیں۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی مگر تو شیکو پر میں ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ ویسے وہاں ماحول بڑا رومانٹک تھا۔ برف گر رہی تھی۔ اور ہم گرم چشمے کے پاس بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ برف کی کوئی پنکھڑی چائے کی پیالی میں گرتی تو گرتے ہی چائے میں حل ہو جاتی۔ ہماری جیکٹوں پر بھی برف جمع ہونے لگی تھی۔ کچھ دیر ہم

وہاں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد اندر آ کر کھڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ اندر کی فضا باہر کے مقابلے میں اب پرسکون اور گرماہٹ والی محسوس ہونے لگی تھی۔ تو شیکو کہہ رہی تھی۔

"تمہیں برف باری میں چشمے کے پاس بیٹھ کر چائے پینا کیسا لگا؟"

میں نے کہا۔ "میں نے بہت انجوائے کیا ہے۔"

تو شیکو کہنے لگی۔

"آپ چائے بنا رہے ہوں اور باہر برف گرنے لگے تو اسے بڑا نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ یہ ساری چائے کی روایت ہمارے ہاں چین سے آئی ہے۔ بلکہ ہمارے آبا و اجداد جب چین کی سرزمین سے نکل کر کوریا اور جاپان کے جزیروں میں آ کر آباد ہو گئے تھے تو دوسری روایات کے علاوہ چائے کی روایت بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہم نے چائے نوشی کو اپنی مذہبی رسومات میں شامل کر لیا ہے۔ چائے تو اپنے باغ کی' اپنے باغ کے جنگل کی آزاد خوشبو ہے۔ ہم نے اسے قید میں ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ مگر خوشبو کو کون قید کر سکتا ہے۔"

تو شیکو نے مجھے دو تین جاپانی نظموں کا ترجمہ کر کے بھی سنایا جن میں شاعر نے چائے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ہمیں چائے کے پاؤں سے مذہبی رسومات کی زنجیریں کاٹ کر اسے آزاد کر دینا چاہیے۔ برف گر رہی تھی جب ہم اس نیچرل ٹی ہاؤس سے نکل کر مین روڈ کی طرف پیدل چل پڑے۔ ہمیں کافی دور جا کر خالی ٹیکسی ملی۔ تو شیکو اپنے محلے کے باہر ہی ٹیکسی سے اتر گئی۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ جھک رہے تھے کہ میں اپنی بارک میں واپس پہنچا۔ اس روز ساری رات برف گرتی رہی۔

وقت گذرتا چلا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ میری اور توشیکو کی دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ یہ دوستی محبت میں بدل گئی۔ ہماری آنکھیں ایک دوسرے کی محبت کا اعتراف کر رہی تھیں، اقرار کر رہی تھیں مگر زبانیں خاموش تھیں۔ سردیوں کا موسم گذر گیا۔ بہار کا موسم آگیا۔ چیری کے پھول کھل گئے۔ ہفتے میں ایک بار ہم دونوں کسی نہ کسی بس شاپ پر ملتے اور پھر کسی پارک میں بیٹھ کر باتیں کرتے یا کسی ریستوران میں بیٹھ کر چائے پیتے۔ ایک روز ہم اسی ٹی ہاؤس میں گئے جہاں ہم نے برفباری میں چشمے کے پاس بیٹھ کر چائے پی تھی۔ چشمے والا چیری کا درخت پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ چیری کے پھول کنول کے پھولوں کی طرح ٹہنیوں پر کھلے ہوئے تھے اور ان پر بھونرے منڈلا رہے تھے۔ فضا میں چیری کے پھولوں کی عجیب سی دھیمی دھیمی طلسمی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک جانب آلوچے اور آڑو کے درخت تھے۔ وہ بھی سفید اور پیازی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ ان کے نیچے بید کی کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہم نے وہاں بیٹھ کر چائے منگوا لی۔ اس روز اس نیچرل ٹی ہاؤس کی فضا واقعی نیچرل لگ رہی تھی۔ ہمارے اوپر ایک جانب آلوچے کا سفید پھولوں سے لدا ہوا درخت تھا اور دوسری جانب آڑو کا درخت تھا جس کی ٹہنیاں ہمارے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔ کوئی چڑیا یا بلبل درخت کی ٹہنی پر آکر بیٹھتی یا بیٹھنے کے بعد اڑ جاتی تو ہم پر پھولوں کی پتیاں گرنے لگتیں۔ ایسے رومانٹک ماحول کا تقاضا تھا کہ میں سوائے محبت کے اور کوئی بات نہ کروں۔ چنانچہ اس روز پہلی بار میں نے توشیکو سے کہا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ اظہار محبت کے وقت میں نے اس کا چھوٹا سا زرد ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ توشیکو نے شرما کر ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور چیری کے درخت کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

"توشیکو! تم نے میری بات کا برا تو نہیں مانا؟"

توشیکو نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چیری کے درخت کی طرف دیکھتی رہی۔

ایک بلبل آڑو کے درخت کی ٹہنی پر سے اڑا تو ٹہنی پر سے سفید پھولوں کی پتیاں ہم پر گریں۔ میں نے توشیکو سے کہا۔

"اگر تمہیں میری بات بری لگی ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

توشیکو نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر نظریں جھکا کر پیالیوں میں چائے ڈالتے ہوئے کہا۔

"نو سر۔ نو۔"

توشیکو نے مجھے اجازت دے دی تھی۔ میں اپنی روایتی گرم جوشی کے ساتھ اس سے محبت کی باتیں کرنے لگا۔ یہاں تک کہ میری انگریزی ختم ہو گئی۔ انگریزی پیچھے رہ گئی اور محبت آگے نکل گئی۔ میں بھی اپنی محبت کے ساتھ آگے نکل گیا اور میں نے توشیکو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ہونٹوں کے ساتھ لگا لیا۔ یہ کوئی اپنا ملک نہیں تھا کہ لڑکی کے ساتھ رنگ رلیاں مناتا پکڑا جاتا۔ جاپانی معاشرے میں اس قسم کی باتوں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ اس بات کو بڑا رومانٹک تصور کیا جاتا تھا کہ ایک نوجوان لڑکا اپنی نوجوان محبوبہ سے اظہار محبت کرتے ہوئے اسکا ہاتھ چوم لے۔ توشیکو کا ننھا سا زرد ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دفتر کی باتیں شروع کر دیں۔ میں نے توشیکو سے بالکل نہیں پوچھا تھا اور نہ یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے یا نہیں؟ میں نے کبھی کسی گیندے گلاب یا موتیے کے پھول کو چومنے کے بعد اس سے یہ نہیں پوچھا تھا اور نہ پوچھنے کی ضرورت محسوس کی تھی کہ جس طرح میں اس سے محبت کرتا ہوں کیا وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے؟ میں ساری ساری رات صبح کو طلوع ہونے والی سورج کی پہلی کرن کی محبت میں آہیں بھرتا ہوں اور جب مشرقی افق پر سورج کی پہلی کرن نمودار ہو کر میری طرف مسکرا کر دیکھتی ہے تو میں آنکھیں بند کر کے اسے چوم لیتا ہوں مگر اس کرن سے کبھی نہیں پوچھا کہ کیا وہ بھی مجھ سے اسی گرمجوشی سے محبت کرتی ہے؟ محبت بدلے میں کچھ نہیں طلب کرتی۔ یہ گمنام جنگلوں میں کھلنے والے پھول کی طرح ہے جو اس بات سے بے نیاز ہو کر اپنے بھرپور نقش و نگار کے ساتھ کھلتا ہے کہ کوئی اسے دیکھنے والا ہے یا نہیں۔

ہم نے ایک دوسرے کو محبت بھرے رقعے لکھنے شروع کر دیئے۔ میں نے توشیکو کو پہلا محبت بھرا رقعہ لکھا اور تہہ کر کے سب کی نظریں بچا کر اس کے پرس

میں ڈال دیا۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد تو شیکو ایک فائل اٹھا کر میرے پاس آئی اور فائل کھول کر مجھ سے کچھ پوچھنے لگی۔ اس دوران اس نے فائل میں سے زرد رنگ کا تہہ کیا ہوا چھوٹا سا خط میری طرف کھسکا دیا۔ خط کے اوپر چیری کے پھول کا ہاتھ سے خاکہ سا بنا ہوا تھا۔ نیچے انگریزی میں کسی جاپانی شاعر کی نظم کے چار مصرعے ترجمہ کر کے لکھے ہوئے تھے۔

"برفباری نے مجھے روک لیا ہے۔
میرے شہر کی فصیل نظروں سے اوجھل ہے۔
مجھے اس پھول کی تلاش ہے۔
جو برفباری میں کھلتا ہے۔"

نہ اوپر نام لکھا تھا اور نہ نیچے تو شیکو نے اپنا نام لکھا تھا۔ دو تین ہفتوں کی اس خفیہ مگر بڑی اہم رومانوی خط و کتابت کے بعد ہم نے خطوں پر ایک دوسرے کا نام لکھنا شروع کر دیا۔ تو شیکو اب زرد رنگ کے بڑے خوبصورت کاغذوں پر خط لکھتی۔ جس روز ہم شہر کے کسی پارک یا کسی ریستوران میں ملتے تو ایک دوسرے کے خطوں کے بارے میں بھی باتیں کرتے۔ ہمارے دن زیادہ خوبصورت اور راتیں زیادہ روشن ہو گئیں۔ مجھے آج تک یاد نہیں ہے کہ کبھی تو شیکو نے مجھے یہ کہا ہو کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ پہلے دن کے اظہار محبت کے بعد میں نے بھی اسے کبھی نہیں کہا تھا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ ہماری مثال تو ایسی تھی جیسے دو بچے بارش ہوتی دیکھ کر گلی میں نکل آئے ہوں اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بارش میں دوڑتے چلے جا رہے ہوں۔ بارش! بارش! محبت! محبت! محبت میں سر سے پاؤں تک بھیگ رہے ہیں اور دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ بارش اپنی بارش آپ ہے۔ محبت اپنی خوشی آپ ہے۔ بارش کو بارش سے کون چھین سکتا ہے۔ محبت کو محبت سے کون جدا کر سکتا ہے۔ بارش پہلے آپ بھیگتی ہے پھر سب کو شرابور کر دیتی ہے۔ محبت خود ہی آواز دیتی ہے اور خود ہی اپنی آواز کا جواب دیتی ہے۔ وہ اپنے سوال کا آپ ہی جواب ہے۔

جاپان میں بہار کا موسم بھی گذر گیا۔ پت جھڑ کا موسم شروع ہو گیا۔ سرد ہوائیں چلنے لگیں۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگے۔ پھر بارشیں شروع ہو گئیں۔ میں اور تو شیکو کسی ریستوران یا کافی ہاؤس میں اس کی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر

باہر بارش کا منظر دیکھتے۔ ابھی برف گرنی شروع نہیں ہوئی تھی کہ اچانک تو شیکو بیمار پڑ گئی۔ میں اس کی خبر لینے اس کے گھر گیا۔ وہ چٹائی پر کمبل اوڑھے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ماں باپ اور چھوٹی بہن بھی اس کے پاس بیٹھے تھے۔ معلوم ہوا کہ تو شیکو کے گلے میں تکلیف ہے جس کی وجہ سے اس کی آواز بند ہو گئی ہے۔ میں اس کے لئے پھولوں کا گلدستہ اور گیٹ ویل کا بڑا خوبصورت کارڈ اور اس کے باپ کے لئے امریکی سگریٹوں کا کارٹن ساتھ لے کر گیا تھا۔

تو شیکو دو تین دن کے اندر کمزور ہو گئی تھی۔ چہرہ پہلے سے زیادہ زرد پڑ گیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ چہرے پر ہلکا سا افسردہ تبسم نمودار ہوا اور پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے تو شیکو کی بہن سے کہا کہ ہم اسے فوجی ہسپتال میں داخل کرائیں گے۔ وہاں اس کا علاج بھی صحیح طریقے سے ہو گا اور سارے ٹیسٹ وغیرہ بھی ہوں گے۔ اگرچہ تو شیکو ہمارے فوجی ریڈیو کی باقاعدہ ملازم نہیں تھی اور کنٹریکٹ پر ملازم تھی اور اسے اتنی زیادہ طبی سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں لیکن میرے اور کیپٹن فاروق اور میجر شاہ زمان کے اصرار پر ریڈیو سٹیشن کے امریکی انچارج نے تو شیکو کے لیے امریکی میرین کے ہسپتال میں علاج کی تمام سہولتوں کی اجازت دے دی۔

تو شیکو کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ تو شیکو کے گلے کا نرخرہ ختم ہو چکا ہے۔ اس کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ میں روز شام کو اس کا حال پوچھنے پھول لے کر ہسپتال آتا۔ تو شیکو مجھے اداس نظروں سے دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر لیتی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ اس کی چھوٹی بہن می ہو اس کے پاس سر جھکائے بیٹھی ہوتی۔ بوڑھے ماں باپ فرش پر بیٹھے اپنی بیٹی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے۔ 1947ء کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ پاکستان کے قیام کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا اور چودہ اگست کو پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا۔ برٹش آرمی کی مسلمان یونٹوں کو کراچی روانہ کرنے کے انتظامات شروع ہو گئے تھے۔ اوکوہاما کا فوجی ریڈیو سٹیشن بھی ختم کیا جا رہا تھا۔ ایک روز ہمیں آرڈر ملا کہ اپنا سامان باندھ کر گیریزن کمانڈر کو رپورٹ کرو۔ میں نے فوجی سٹیشن ویگن پکڑی اور سیدھا تو شیکو کے پاس ہسپتال آ گیا۔ میں نے اسے بالکل نہ بتایا کہ میں جاپان سے جا رہا ہوں۔ اس کی بہن می ہو کو ایک طرف لے جا کر

بتا دیا کہ ہمیں کوچ کے آرڈر مل گئے ہیں اور ہو سکتا ہے آج شام اوکوہاما سے روانہ ہو جائیں۔ لاہور کا ایڈریس لکھا اور ورق الگ کر کے می ہو کو دے کر کہا۔

"مجھے توشیکو کی خیریت کی خبر اس پتے پر خط لکھ کر دینا۔ مجھے اس کی بڑی فکر رہے گی۔"

می ہو کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کاغذ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ میں توشیکو کے بستر کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے بوڑھے ماں باپ سر جھکائے جیسے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ توشیکو کی آنکھیں بند تھیں۔ اس کا چہرہ چیری کے پھول کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ نرس نے جھک کر میرے کان میں کہا۔

"وہ سو رہی ہے۔ اسے جگانا نہیں۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ مجھے دس منٹ میں واپس ریڈیو سٹیشن پہنچنا تھا جہاں سے ہمارے کارکنوں کو اوکوہاما کے فوجی گیریزن میں جا کر گیریزن کمانڈر کو رپورٹ کرنی تھی۔ میں نے توشیکو کا چھوٹا سا زرد ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے چوما اور تیزی سے وارڈ سے باہر نکل گیا۔ توشیکو کا ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ جیسے برفباری میں آلوچے کے درخت کی ٹہنیاں ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ وہاں سے سٹیشن ویگن میں بیٹھ کر ملٹری گیریزن پہنچا تو معلوم ہوا کہ میجر شاہ زمان، کیپٹن فاروق اور اردو سروس کے دوسرے مسلمان فوجی کارکنوں کو لے کر ایک ٹرانسپورٹ طیارہ کلکتے روانہ ہو چکا ہے۔ دوسرا طیارہ ایک گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ وہیں فوجی ایرپورٹ پر بیٹھا رہا۔ خیال توشیکو کی طرف تھا۔ خدا جانے وہ کس حالت میں ہو گی۔ ایک گھنٹے بعد دوسرا فوجی ٹرانسپورٹ طیارہ رن وے پر آکر لگ گیا۔ میرے ساتھ پنجاب یونٹ کے کچھ مسلمان فوجی بھی تھے۔ طیارے کو سنگاپور سے ہو کر کلکتے اور وہاں سے دلی جانا تھا۔ ہمیں دلی ہیڈ کوارٹر میں رپورٹ کرنی تھی۔ طیارہ ٹیک آف کر گیا۔

مجھے یاد نہیں یہ پرواز کتنے گھنٹوں کی تھی۔ جولائی کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں یہ بھری برسات کا زمانہ ہوتا ہے۔ کلکتے تک طیارہ بادلوں اور بارش میں پرواز کرتا رہا۔ کلکتے میں بھی بادل چھائے ہوئے تھے اور رات کو بڑی بارش ہوئی تھی۔ سڑکیں گیلی تھیں۔ ائیرپورٹ پر ایک گھنٹہ رکنا پڑا۔ اس کے بعد دلی کی طرف پرواز کر گئے۔ دلی میں دھوپ نکلی ہوئی تھی اور موسم حبس آلود تھا۔ ایک دن پہلے دلی میں بھی موسلادھار بارش ہوئی تھی۔ میرے ساتھ پنجاب یونٹ کے دس

رہ عہدے دار بھی تھے۔

ہم نے دلی کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں جا کر رپورٹ کی تو معلوم ہوا کہ وہاں ب بھارت کی فوجی ہائی کمانڈ کا راج ہے۔ مرہٹہ، گورکھا اور جاٹ رجمنٹوں کے ہندو جی ہمیں گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ابھی بھارت کے آزاد ہونے اور پاکستان لی آزاد مملکت کے قیام میں ایک مہینہ باقی تھا مگر عملی طور پر بھارت میں ہندو کانگرس کا راج قائم ہو گیا ہوا تھا۔ جگہ جگہ ترنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ دلی میں فسادات ثروع ہو چکے تھے اور مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے مکانوں و آگ لگائی جا رہی تھی۔ شہر کے گنجان محلوں میں سے مسلمان جانیں بچا کر جو دلی ے پرانے قلعے میں پہنچ گئے تھے وہی زندہ بچے تھے باقیوں کو ہندوؤں اور سکھوں نے ہید کر دیا تھا۔ یہ ساری رپورٹیں ہمیں فوجی ہیڈ کوارٹر میں ملیں۔ معلوم ہوا کہ ہمیں وسرے مسلمان یونٹوں کے ساتھ بمبئی سے بحری جہاز کے ذریعے کراچی پہنچایا جائے ا مگر یہ جہاز ایک ماہ بعد بمبئی سے روانہ ہو گا۔

میں جلدی سے جلدی امرتسر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے پاس پہنچنا اہتا تھا۔ کیونکہ پنجاب میں بھی حالات انتہائی نازک صورت اختیار کر چکے تھے۔ میں نے فوجی ہیڈ کوارٹر کی بارک میں ہی ایک مسلمان لانگری سے معلوم کر لیا تھا کہ دلی ے مشرقی پنجاب کی طرف ریل گاڑیاں چل رہی ہیں۔ اس نے بتایا کہ انبالے تک تو لوئی خطرہ نہیں ہے مگر اس کے آگے گاڑیوں پر ہندو سکھوں کے جتھے حملے کر رہے ں۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بار بار امرتسر میں مقیم اپنے گھر والوں کا یال آتا کہ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ امرتسر میں ر طرف آگ لگی ہوئی ہے۔ آخر میں نے ٹرین کے ذریعے امرتسر جانے کا فیصلہ کر یا۔ کمانڈنگ آفیسر کو رپورٹ کرنے کی اب ضرورت نہیں تھی۔ ایک طرح سے ہم سلمان فوجی فوج سے ریلیز ہو چکے تھے۔ میں نے کسی کو کچھ نہ بتایا۔ ایک فوجی ٹرک کی ہندو کرنل کا سامان لے کر ریلوے سٹیشن جا رہا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر دلی کے ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔

ریلوے سٹیشن پر وہ پہلے والی رونق نہیں تھی۔ ہر طرف ایک ویرانی سی رس رہی تھی۔ سٹیشن پر جگہ جگہ ترنگے جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ ہندو کانگریسیوں کا یک جلوس بھارت ماتا کی جے۔ ہندوستان زندہ باد۔ پاکستان مردہ باد کے نعرے لگا

سٹیشن کے سامنے سے گذرنے لگا۔ میں خاکی وردی میں تھا۔ کاندھے کے ساتھ خاکی تھیلا لٹک رہا تھا۔ میں دوسری طرف سے ہوتا ہوا سٹیشن کی لابی میں آگیا۔

انکوائری سے معلوم ہوا کہ کلکتے سے ایک میل ٹرین آرہی ہے جو لاہور جائے گی۔ میں نے دلی سے امرتسر تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور پلیٹ فارم پر آکر ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔ پلیٹ فارم پر کئی سکھ اپنے بال بچوں اور سامان کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ تحصیل حافظ آباد' راولپنڈی اور جہلم کے علاقے کے شرنارتھی ہیں۔ان کی وجہ سے پلیٹ فارم کی فضا بڑی کشیدہ تھی۔ ان میں ہندو شرنارتھی بھی تھے۔ یہ لوگ دلی کے ہندوؤں اور سکھوں کو جو ان سے ملنے آئے ہوئے تھے' ہندو سکھوں کے قتل کی جھوٹی سچی باتیں سنا رہے تھے۔ مجھے ایک مسلمان قلی نے بتایا کہ خوف کے مارے سٹیشن پر کوئی مسلمان نہیں آتا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھنے کی بجائے سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم میں چلا جاؤں۔ چنانچہ میں پلیٹ فارم سے اٹھ کر سیکنڈ کلاس ویٹنگ روم میں آگیا۔ یہاں ایک بوڑھا انگریز پہلے سے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ایک سکھ فیملی بھی تھی۔ میں بید کے بنچ پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا اور ایک اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ اخبار ہندو مسلم فسادات کی خبروں سے بھرا ہوا تھا۔ پنجاب میں حالات زیادہ خراب تھے۔ امرتسر میں ہر طرف آگ لگنے اور قتل عام کی خبر بھی تھی۔ اس کو پڑھ کر میں بہت پریشان ہو گیا۔ دل یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اڑ کر امرتسر پہنچ جاؤں۔

کافی دیر بعد پلیٹ فارم میں کسی ٹرین کے داخل ہونے کا شور سنائی دیا۔ معلوم ہوا لاہور جانے والی گاڑی آگئی ہے۔ میں ویٹنگ روم سے باہر نکل آیا۔ ٹرین میں پہلے ہی سے کافی رش تھا۔ میں تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں کسی نہ کسی طرح سوار ہو گیا۔ ٹرین دلی سٹیشن پر کافی دیر تک رکی رہی۔ ڈبے میں رش کی وجہ سے کافی گرمی اور حبس تھا۔ مسافروں میں سکھ بھی تھے اور ہندو بھی تھے جو اپنی دھوتیوں اور تنگ پاجاموں سے ہی پہچانے جاتے تھے۔ آخر ٹرین دلی سٹیشن سے چل پڑی۔ میں ڈبے میں دروازے کے پاس ایک صندوق پر بیٹھا تھا۔ ٹرین چلی تو اندر ٹھنڈی ہوا آنے لگی۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹرین نے دلی شہر سے نکلتے ہی سپیڈ پکڑ لی۔ کھیتوں میں کسان ہل چلاتے دکھائی دے رہے تھے۔

یہاں حالات نارمل محسوس ہو رہے تھے۔ ٹرین میرٹھ پہنچی تو یہاں مسلمان

عورتوں' مردوں اور بچوں کا ایک ہجوم پہلے سے بیٹھا تھا۔ یہ میرٹھ شہر کے مسلمان تھے جو جانیں بچا کر میرٹھ کے دوسرے شہروں کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ایسا ہی ہجوم میں نے انبالہ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر دیکھا۔ مسلمان برقعہ پوش خواتین اپنے بچوں اور مردوں کے ساتھ جگہ جگہ سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔

ٹرین انبالے سے چل کر مشرقی پنجاب میں داخل ہوئی تو دونوں جانب کھیتوں میں ویرانی برس رہی تھی۔ کسی جگہ کوئی کسان کام کرتا یا ہل چلاتا نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ فاصلے پر ایک گاؤں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ جیسے جیسے ٹرین آگے بڑھتی گئی حالات زیادہ سنگین شکل اختیار کرتے گئے۔ ریلوے لائن کے ساتھ جتنے گاؤں نظر آئے ان میں یا تو آگ لگی ہوئی تھی یا ویران پڑے تھے۔ صرف سکھ کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔

لدھیانے پہنچ کر ٹرین دیر تک رکی رہی۔ پلیٹ فارم پر سکھ ہی سکھ پھر رہے تھے۔ وہ جھانک جھانک کر ڈبوں میں دیکھتے اور پھر آگے چل دیتے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے ٹرین کے ذریعے امرتسر پہنچنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ میری جان لے سکتا ہے۔ میں دل میں کلمہ شریف پڑھنے لگا کہ یااللہ مجھے خیریت سے امرتسر پہنچا دے۔

ٹرین لدھیانہ شہر کے درمیان سے ہو کر گزرتی تھی۔ ڈبے کی کھڑکی میں سے جو تین چار سڑکیں نظر آئیں وہ ویران پڑی تھیں اور کہیں کہیں پولیس کے سپاہی کھڑے تھے۔ کسی نے کہا۔ "یہاں بھی کرفیو لگا ہوا ہے۔"

ہر طرف وحشت برس رہی تھی۔ شہر میں کہیں کہیں دھواں اٹھ رہا تھا۔ جالندھر آگیا۔ یہاں پلیٹ فارم پر پولیس کے سپاہی موجود تھے۔ سکھ ایک طرف کھڑے کرپانیں اور تلواریں لہراتے ہوئے پاکستان مردہ باد اور ست سری اکال کے نعرے لگا رہے تھے۔ جالندھر سے امرتسر چالیس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ میں دعائیں مانگنے لگا' یاخدا یہ راستہ خیریت سے کٹ جائے۔ میں کسی طرح زندہ سلامت گھر پہنچ جاؤں۔

جالندھر سٹیشن پر ٹرین دو تین منٹ ہی ٹھہری اور چل پڑی۔ جالندھر اور کرتارپورے کے درمیان ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ دور تک کٹی ہوئی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ سب لوگ ان لاشوں کو دیکھ کر سہم گئے۔ کئی نے کھڑکیاں بند کر دیں ایک دھوتی پوش ہندو نے کہا۔

"ان مسلمانوں کو پاکستان بنانے کی سزا مل رہی ہے ماراج۔"

میں دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی نے دروازے کی کھڑکی بند نہ کی بلکہ کئی مسافر وہاں سے گردنیں باہر نکال کر لاشوں کو دیکھنے لگے۔ ان میں عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔ بچوں کی لاشیں بھی تھیں۔ سامان جھاڑیوں اور سڑک پر جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ مسلمان مہاجرین کا قافلہ تھا جو پاکستان کی طرف جا رہا تھا کہ اسے ہندو سکھوں کے جتھے نے راستے میں ہی قتل کر دیا۔ مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کی لاشیں دیکھ کر میں خوف زدہ ہو گیا۔ ڈرائیور نے یہاں گاڑی کی رفتار تیز کر دی تھی۔ ڈبے میں سکھ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے مسافر یقیناً ہندو ہی تھے۔ کیونکہ وہ پاکستان کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ اندر سے میں سخت ڈرا ہوا تھا۔ ٹرین نے دو تین چھوٹے چھوٹے سٹیشن چھوڑ دیئے۔ پھر اس کی رفتار آہستہ ہونے لگی۔ میں ڈبے میں بیٹھے ہوئے ہندو سکھ مسافروں کو بھی سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور باہر بھی دیکھ لیتا تھا۔ امرتسر شہر کے باہر کا علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ امرتسر آ رہا تھا۔ میرا شہر آ رہا تھا۔ مجھے اپنے شہر کے کھیت اور کھیتوں کے ٹیوب ویل اور ریل کے پھاٹک دیکھ کر حوصلہ ہونے لگا۔ میری بائیں جانب امرتسر کے مشہور علاقے شریف پورہ کی آبادی شروع ہو گئی۔ یہ ساری کی ساری امرتسری مسلمانوں کی آبادی تھی۔ میں نے مکانوں کی چھتوں پر کچھ نوجوانوں کو ہاکیاں اور ڈنڈے لہراتے دیکھا تو محسوس ہوا کہ میں اپنے گھر میں آ گیا ہوں۔ اب کوئی ہندو یا سکھ مجھے قتل کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔

ٹرین شریف پورے والا ریلوے پھاٹک پار کر کے عید گاہ والی دیوار کے پاس رک گئی۔ آگے سگنل ڈاؤن نہیں تھا۔ ایک دم مجھے خیال آیا کہ امرتسر پر خطرہ ہو گا مجھے یہیں اتر جانا چاہیے۔ دروازے کے آگے رکھے ہوئے بھاری صندوق کی وجہ سے دروازہ نہیں کھل سکتا تھا۔ میں نے کھڑکی میں سے پہلے اپنا تھیلا نیچے پھینکا۔ پھر خود نیچے چھلانگ لگا دی۔ تھیلا اٹھا کر کاندھے سے لٹکایا اور عید گاہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ واپس ریلوے پھاٹک کی طرف چلنے لگا۔ یہ رام باغ یا کمپنی باغ والا ریلوے پھاٹک تھا۔ ٹرین گذر جانے کے بعد پھاٹک کھول دیا گیا تھا مگر یہاں نہ کوئی سائیکل تانگہ نظر آ رہا تھا نہ کوئی آدمی ہی تھا۔

اوپر سگنل کے کیبن میں سے کسی نے مجھے آواز دے کر کہا۔

"اوئے منڈیا۔ نٹھ کے جا۔ کرفیو لگن والا ای۔"

اس سگنل والے نے مجھے خبردار کیا تھا کہ جہاں بھی جانا ہے بھاگ کر جاؤ۔ شہر میں کرفیو لگنے والا ہے۔ اس کے باوجود مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اپنے شہر میں آ کر میرا سارا خوف دور ہو گیا تھا اور میں پھر سے دلیر ہو گیا تھا۔ وہاں سے ہمارا محلہ زیادہ دور نہیں تھا۔ درمیان میں کمپنی باغ والے پھاٹک سے لے کر رام باغ کے پولیس سٹیشن تک صرف ایک سڑک ہی تھی۔ میری بائیں جانب امرتسر کے مشہور سکھ ڈاکٹر کا آنکھوں کا ہسپتال تھا۔ دائیں جانب عید گاہ کا چھوٹا سا دروازہ تھا۔ میں تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ آگے جی ٹی روڈ آ گئی۔ پھر گھاس منڈی تھی۔ سڑکیں ویران پڑی تھیں۔ دو تین آدمی ضرور نظر آئے جو دوڑ کر چلتے ہوئے ادھر ادھر غائب ہو گئے۔ ایک فوجی جیپ تیزی سے میرے قریب سے گذر گئی۔ جیپ میں لوہے کے ہیلمٹوں والے فوجی رائفلیں لیے بیٹھے تھے۔ میری وردی بھی خاکی تھی اور تھیلا بھی خاکی تھا۔ شاید انہوں نے مجھے بھی فوجی سمجھا تھا۔ گھاس منڈی کی ساری دکانیں بند تھیں۔ رینی کے سیڑھیوں والے پل کی طرف درختوں کے پیچھے آسمان کی طرف دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں جلی ہوئی لکڑیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ رام باغ پولیس سٹیشن کے باہر تین چار سکھ سپاہی کھڑے تھے۔ ایک فوجی بھی چوک کے وسط میں رائفل لئے ٹہل رہا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ انہوں نے میری طرف دیکھا فوجی نے ہاتھ سے مجھے جلدی نکل جانے کا اشارہ کیا۔

یہ میرا محلہ تھا۔ اتنے میں کرفیو لگنے کا سائرن بج اٹھا۔ میں دوڑ کر رام باغ والے پرانے قلعے کی دیوار کے ساتھ ہوتا ہوا اس گلی میں داخل ہو گیا جو آگے جا کر ارے بازار میں نکل آتی تھی۔ یہ سارا محلہ مسلمانوں کا تھا۔ لوگ ٹولیوں کی شکل میں ادھر ادھر کھڑے یا چارپائیوں پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آدمی نے مجھے پہچان لیا اور کہا۔

"تم سیلون سے کب آئے؟"

میں نے کہا۔ "چچا! ابھی آ رہا ہوں۔"

ان لوگوں نے مجھے گھیر لیا اور پوچھنے لگے۔ ریل سے آ رہے ہو یا لاری سے؟ جالندھر لدھیانہ میں کیا صورتحال ہے؟ جب میں نے انہیں بتایا کہ جالندھر اور کرتارپورہ کے درمیان میں بنی ریلوے لائن کے ساتھ مسلمان عورتوں، بچوں اور

مردوں کی کٹی ہوئی بے شمار لاشیں دیکھی ہیں تو سب کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ایک نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ ایک ایک مسلمان کے خون کا بدلہ لیں گے۔"

میں گلیوں میں سے گذرتا ہوا کپی گلی میں داخل ہو گیا اور پھر اپنے بازار میں پہنچ گیا۔ میرے گھر والوں نے مجھے دیکھا تو مجھ سے باری باری لپٹنے لگے۔ والد صاحب نے مجھے گھور کر کہا۔

"تم اس سے پہلے نہیں آ سکتے تھے؟ راستے میں تمہیں کچھ ہو جاتا تو کون ذمے دار تھا؟"

امرتسر شہر جل رہا تھا۔ ہماری گلی میں ہندو سکھوں کے چھ سات مکان تھے۔ وہ مکان خالی کر کے ہندو سکھوں کے محلوں میں چلے گئے تھے۔ اسی طرح ہندو سکھوں کے محلوں میں جو مسلمان رہتے تھے وہ جانیں بچا کر مسلمانوں کے محلوں میں آ گئے تھے۔ کوئی مسلمان غلطی سے اگر غیر مسلموں کے محلے میں چلا جاتا تو قتل ہو جاتا۔ کوئی ہندو سکھ مسلمانوں کے محلے میں آ جاتا تو مارا جاتا۔ شہر میں مکان جل رہے تھے۔ رات کو تھری ناٹ تھری رائفلوں اور بندوق کے دھماکوں کی آوازیں آتیں۔ جس روز میں تیسرے پہر امرتسر پہنچا اس روز صبح نو بجے تک کا کرفیو لگ گیا۔ صبح نو بجے کرفیو کھلا تو لوگ سودا سلف خریدنے گھروں سے نکل پڑے۔ ہال بازار کی دکانیں بھی کھل گئیں۔ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ ہال بازار میں جا رہا تھا کہ میوہ منڈی کے چوک میں ایک غیر مسلم قتل ہو گیا۔ وہ اپنے محلے سے ٹوکری لے کر میوہ منڈی سودا خریدنے آیا تھا۔ وہاں شور مچ گیا۔ لوگ ادھر ادھر گلیوں میں بھاگ اٹھے۔ پولیس کی سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم بھی بھاگ کر اپنی گلی میں آ گئے۔ اسی وقت شہر کے اس علاقے میں دوبارہ کرفیو نافذ کر دیا گیا۔

جیسے جیسے چودہ اگست 1947ء کا دن قریب آ رہا تھا فسادات کی آگ زیادہ تیزی سے بھڑکنے لگی تھی۔ مشرقی پنجاب سے مسلمان مہاجرین کے قافلے پاکستان کی طرف چلے آ رہے تھے۔ راستے میں جگہ جگہ ان پر سکھوں اور ہندوؤں کے جتھے حملہ کر کے نہتے مسلمانوں کا بے دریغ قتل عام کرتے۔ عورتوں کی بے حرمتی کی جاتی۔ شیر خوار بچوں کو ماؤں کی گودیوں سے چھین کر درختوں کے ساتھ کیل ٹھونک کر لٹکا دیا جاتا۔ محلے کی گلیوں پر لوہے کے دروازے چڑھا دیئے گئے تھے۔ ساری رات

بندوقیں رائفلیں چلتی رہتیں۔ نعروں کی آوازیں آتی رہتیں۔ دن میں تھوڑی دیر کے لیے کرفیو کھلتا اور پھر لگ جاتا۔ ہم لوگ اپنے محلے کی گلیوں میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ امرتسر کے مسلمانوں کو یقین تھا کہ امرتسر، گورداسپور کا علاقہ پاکستان میں شامل ہو گا لیکن عین وقت پر یہ علاقہ ہندو اور انگریز کی سازش کے نتیجے میں ہندوستان کو دے دیا گیا۔ اس کے بعد گورداسپور اور پٹھانکوٹ کے اضلاع کے مسلمانوں کے بھی پاؤں اکھڑ گئے۔ ادھر سے بھی لٹے پٹے مسلمانوں کے قافلے خاک اور خون میں ڈوبے ہوئے اپنی منزل پاکستان کی طرف چل پڑے۔ اس دوران پٹیالہ، نابھہ اور مشرقی پنجاب کی دوسری سکھ ریاستوں میں مسلمانوں کا جس بے دردی سے خون بہایا گیا اس کی مثال شاید ہی تاریخ میں مل سکے ہمارے اپنے شہر امرتسر کے ہندو اکثریتی محلے میں مسلمانوں کے دس بارہ گھر تھے۔ ہندوؤں نے ان گھروں پر حملہ کر دیا۔ مردوں نے لاٹھیوں اور ڈنڈوں سے مقابلہ کیا اور ایک ایک کر کے اپنے مکانوں کے سامنے شہید ہو گئے۔ اس محلے میں ایک کنواں تھا۔ بارہ کے بارہ مکانوں کی مسلمان عورتوں نے ان کنوؤں میں چھلانگیں لگا دیں اور شہید ہو گئیں۔

چودہ اگست 1947ء کے روز پاکستان بن گیا۔ ہندوستان آزاد ہو گیا ----- اور شہر میں ڈوگرہ فوج ہندو غنڈوں کے ساتھ مل کر مسلمان محلوں پر حملہ آور ہوئی۔ جب تک شہر میں فوج ہندو سکھوں کے ساتھ نہیں تھی امرتسر کے مسلمان بڑی دلیری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کرتے رہے تھے اور کسی ہندو سکھ کو مسلمانوں کے محلے پر حملہ کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی مگر اب مشین گنوں اور دستی بموں سے لیس ڈوگرہ فوج ان کے ساتھ تھی۔ فوج آگے آگے ہوتی۔ ہندو غنڈے پیچھے پیچھے لاٹھیاں تلواریں لئے آ رہے ہوتے۔ فوجی دستی بم مار کر گلی کا آہنی دروازہ اڑا دیتے اور مسلمانوں پر مشین گنوں کا فائر کھول دیتے۔ امرتسر کے مسلمان اپنی دونالی بندوقوں اور لاٹھیوں سے ڈوگرہ فوج کی مشین گنوں اور دستی بموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ شریف پورے کو مہاجر کیمپ بنا دیا گیا۔ اس کے باہر بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے مورچے سنبھال لئے۔ ہماری گلی میں آس پاس کی تمام گلیوں کے مسلمان کنبے آ گئے تھے اور اس انتظار میں تھے کہ بلوچ رجمنٹ اور مسلم لیگ کے ٹرک آ کر انہیں پاکستان لے جائیں گے۔ اکا دکا ٹرک آتے مگر گلی میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو ٹرکوں میں سوار کرا دیا جاتا۔ ابھی تین چار ٹرک

ہی آئے ہوں گے کہ ایک روز ڈوگرہ فوج نے ہماری گلی پر بھی دھاوا بول دیا۔

دن کا وقت تھا کہ گلی کے دروازے کی طرف اوپر تلے دو تین دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے اتنے زبردست تھے کہ دکانوں کے چھجوں میں چھپ کر بیٹھے ہوئے کبوتر پھڑپھڑا کر اڑ گئے۔ فوج نے دستی بم مار کر گلی کا دروازہ اڑا دیا۔ گلی میں چیخ و پکار مچ گئی۔ لوگوں نے اپنا اپنا سامان چھوڑ کر گلی کے دوسرے دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ دوسرے دروازے پر سکھوں کے قلعے برج پھولا سنگھ کی طرف سے گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ اسی دروازے سے گذرتے ہوئے ہماری گلی کے کئی آدمی شہید ہو گئے۔ غلام محمد شال مرچنٹ کا جوان بیٹا موسیٰ اپنے بچے کو گودی میں اٹھائے دروازے سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے اور اس کے شیر خوار بیٹے کو گولیوں نے چھلنی کر دیا۔ دونوں باپ بیٹا شہید ہو گئے۔ ان کی لاشیں بھی وہیں سڑک پر پڑی رہ گئیں۔ لوگ محلے کے بڑے دروازے کی طرف دوڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے دوڑا۔ ادھر ڈوگرہ فوجی فائرنگ کر رہے تھے۔ یہاں سے جس کا جدھر کو منہ اٹھا، دوڑ پڑا۔ میں مشن سکول کی اونچی دیوار کے ساتھ بھاگتا ہوا بازار پار کر کے روڑاں والی مسجد میں آ گیا۔ یہاں مسجد کے صحن میں امام مسجد اور کچھ دوسرے مسلمانوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ میں مسجد کی چھت پر چڑھ کر چھپ گیا۔ چاروں طرف گولیاں چل رہی تھیں۔ گلی میں مسلمانوں کے مکان جل رہے تھے۔ ہندو اور سکھ بلوائی مکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ کچھ لوگ مسجد کی طرف آئے۔ کسی نے کہا۔

"اس کو آگ کیوں نہیں لگاتے۔ یہ مسجد کیوں چھوڑ دی ہے۔"

اس کے ساتھ ہی مسجد کے صحن میں دو تین پٹرول بم آ کر پھٹے۔ میں چھت پر سے دوسرے مکان پر کود گیا۔ تین چار مکانوں کی چھتوں پر سے ہوتا ہوا گلی رنگ ریزاں کے مکان کی چھت پر پہنچ گیا۔ اس گلی کے سارے مسلمان مکان خالی کر کے کیمپ میں جا چکے تھے۔ گلی میں ہندو سکھوں کے مکان لوٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں پھنس گیا تھا۔ کیونکہ اس کے آگے ہندوؤں سکھوں کے محلے شروع ہو جاتے تھے۔ آگے بھی موت تھی۔ ایک روز پہلے ہمارے گھر کی سب عورتیں محلے کی دوسری عورتوں کے ساتھ شریف پورہ مہاجر کیمپ میں پہنچا دی گئی تھیں۔ مرد نہیں گئے تھے۔ سوچنے لگا میں بھی ان کے ساتھ ہی چلا جاتا تو اچھا تھا۔ میں مکانوں کی چھتیں پھلانگتا بکر واناں کے بازار والے ایک خالی مکان کی چھت پر آ کر منڈیر کے پاس بیٹھ

گیا۔ نیچے بازار میں ہندو اور سکھ بچے کھچے مسلمانوں کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ میں نے جھرنے میں سے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ میں اس انتظار میں وہیں چھپ کر بیٹھا رہا کہ یہ لوگ یہاں سے چلے جائیں تو میں نیچے اتر کر قبرستان کی طرف سے ہوتے ہوئے شریف پورہ کیمپ پہنچنے کی کوشش کروں۔ اسی انتظار میں شام ہو گئی۔ پھر رات کا اندھیرا چھا گیا۔ بازار میں ذرا خاموشی ہوئی تو میں نے چھت کی منڈیر پر سے جھانک کر بازار میں دیکھا۔ بازار خالی پڑا تھا۔ مجھے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ میں مکان کی سیڑھیاں اتر کر دوسری منزل میں آیا تو وہاں ٹوٹا پھوٹا سامان بکھرا پڑا تھا۔ غنڈے گھر کا سارا قیمتی سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ میں پہلی منزل میں آ گیا۔ یہاں نلکا لگا تھا۔ میں نے نلکا کھول کر پانی پیا اور ڈیوڑھی میں سے ہوتا ہوا بازار میں آ گیا۔ کہیں کہیں بجلی کے کھمبے پر بلب روشن تھے۔

بازار شروع سے آخر تک سنسان پڑا تھا۔ میں اس محلے کی ساری گلیوں سے واقف تھا۔ چپکے سے اس گلی کی طرف چلنے لگا جو دوسری طرف دروازہ کھی منڈی والے قبرستان کی جانب نکل جاتی تھی۔ گلی میں ٹوٹے ہوئے صندوق اور چیتھڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سارا محلہ مسلمانوں کا تھا۔ ہندو سکھوں نے مکانوں کو لوٹ لیا تھا۔ خدا جانے یہاں کتنے مسلمان شہید ہوئے تھے اور کتنی خواتین اغوا ہوئی تھیں۔ میں خالی مکانوں کے ساتھ ساتھ چلتا دوسرے دروازے پر آیا تو فضا فائر کی آواز سے گونج اٹھی۔ یہ تھری ناٹ تھری رائفل کا دھماکہ تھا۔ میں حسن شاہ صاحب کے مکان کے تھڑے پر چڑھ کر اندھیرے میں چھپ گیا۔

سامنے سڑک خالی پڑی تھی۔ ایک طرف سکھوں کا قلعہ تھا اور دوسری طرف کھال کے پار قبرستان کو راستہ جاتا تھا۔ مجھے کھال کے پل پر سے ہو کر قبرستان کی طرف جانا تھا۔ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور کھال کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ کھال زیادہ دور نہیں تھا۔ بیچ میں ایک ہی سڑک تھی۔ کھال کے پل سے میں نیچے کچی سڑک پر آ گیا۔ یہاں سے قبرستان شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں ہم عید شب برات پر اپنے گھر والوں کے ساتھ قبروں پر چراغ جلانے اور اگربتیاں سلگانے آیا کرتے تھے۔ اب ان قبروں کا کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ رات کے اندھیرے میں قبرستان پہلے سے زیادہ ویران معلوم ہو رہا تھا۔ راستہ مجھے آتا تھا۔ آگے امرودوں کا باغ آ گیا۔ اس باغ میں ہم اسکول سے بھاگ کر امرود توڑنے آیا کرتے تھے۔ باغ میں

کچے پکے امرودوں کی بڑی افسردہ خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ امرودوں کے باغ کی دوسری طرف پھر قبرستان آ جاتا تھا۔ اس کے آگے جی ٹی روڈ تھی جس کو پار کر کے مجھے لوکاٹوں کے باغ میں سے ہوتے ہوئے شریف پورے کے مہاجر کیمپ میں داخل ہونا تھا۔ امرودوں کا باغ ختم ہو گیا۔ سامنے اندھیرے میں قبروں کی اونچی نیچی ڈھیریاں دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔

امرودوں کے باغ سے نکل کر میں نے پیچھے امرتسر شہر کی طرف نگاہ ڈالی۔ دور آسمان پر سرخی جھلک رہی تھی۔ مسلمانوں کے مکان جل رہے تھے۔ میں قبروں کے درمیان چل رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر جی ٹی روڈ کی ٹاہلیوں کے درختوں کے سائے سے دکھائی دیئے۔ جی ٹی روڈ اور قبرستان کے درمیان ایک کھال تھا جو خشک پڑا تھا۔ میں اس میں سے ہو کر اوپر جی ٹی روڈ پر نکلا تو ایک رعب دار آوز آئی۔

"کون ہو تم؟ یہیں کھڑے رہو۔"

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

مجھے رات کے اندھیرے میں ایک آدمی نظر آیا جس نے دھوتی اور بنیان پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چھرا تھا۔ خوف سے میرے ہونٹ خشک ہو گئے۔ میں کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگا تو اس نے ذرا قریب آ کر پوچھا۔

"مسلمان ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ ہندو غنڈہ ہے۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں تو یہ مجھے قتل کر دے گا۔ میں اگر بھاگا تو بھی یہ مجھ پر پیچھے سے کم از کم چھرے کا ایک وار ضرور کر دے گا۔ میں اس کا منہ تکنے لگا۔ اتنے میں جی ٹی روڈ کی دوسری طرف کھیتوں سے ست سری اکال اور بجرنگ بلی کے نعروں کی آواز آئی۔ اس آدمی نے اس طرف دیکھا اور غصے میں بولا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ مسلمان ہو تو میرے ساتھ بھاگو۔ سکھ تمہیں مار ڈالیں گے۔"

یہ کہہ کر اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور مجھے ساتھ لے کر سڑک پر ٹاہلی کے درختوں کی طرف بھاگا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہا تھا۔ اس نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا۔ وہ مجھ سے آگے آگے دوڑ رہا تھا۔ درختوں سے نکل کر ہم جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے کھلی جگہ پر آ گئے جہاں آمنے سامنے کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ عیسائیوں کے کوارٹر ہیں۔ وہ ایک کوارٹر کی طرف بھاگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے کوارٹر کا دروازہ کھول کر مجھ سے کہا۔

"اندر چارپائی کے نیچے چھپ جاؤ۔ خبردار آواز نہ نکالنا۔"

کوارٹر کے اندر اندھیرا اور حبس تھا۔ میں اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چارپائی کے پاس آیا اور اس کے نیچے گھس کر لیٹ گیا۔ میرا سانس پھول گیا تھا اور جسم پسینے میں شرابور تھا۔ سکھوں اور ہندوؤں کے نعروں کی آواز اسی جانب قریب آ

رہی تھی۔ میرا محسن مسیحی بھائی کوارٹر بند کر کے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ شخص کر بچین ہے۔ معلوم نہیں وہ چھرا لے کر سڑک پر اندھیرے میں کیوں کھڑا تھا۔ نعرے بند ہو گئے۔ باہر کچھ فاصلے پر آدمیوں کے تیز تیز باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرا دل خوف کے مارے تیز تیز دھڑک رہا تھا۔ ان آوازوں میں مجھے کبھی کبھی اس آدمی کی آواز بھی سنائی دیتی تھی جو مجھے یہاں لایا تھا۔ پھر یہ ساری آوازیں دور ہونے لگیں۔ نعروں کی آوازیں بھی دور جا کر غائب ہو گئیں۔

اس کے کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد کوارٹر کا دروازہ کھلا اور اسی مسیحی بھائی کی آواز آئی۔

"اندر ہو منڈیا؟"

میں نے کہا۔

"ہاں جی۔"

"باہر نکل آ"۔

میں چارپائی کے نیچے سے نکل آیا۔ اس آدمی نے موم بتی روشن کر دی۔ یہ شخص پچاس پچپن برس کا گہرے سانولے رنگ کا آدمی تھا۔ سر کے بال خشخشی تھے۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس نے مجھے چارپائی پر بیٹھنے کو کہا اور خود فرش پر بیٹھ گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور بولا۔

"یہ بتاؤ کہ تم رات کے وقت موت کے منہ میں اس طرف کیسے آ گئے تھے؟ غنڈوں کو شک تھا کہ میں نے مسلمان عورتوں کو چھپایا ہوا ہے۔ ان میں میرا ایک واقف تھا۔ بڑی مشکل سے انہیں یقین دلایا کہ میرے گھر میں کوئی مسلمان نہیں ہے۔"

میں نے اسے کہا کہ میں اپنی گلی سے نکل کر شریف پورے کیمپ کی طرف دوسرے لوگوں کے ساتھ بھاگا تھا کہ ڈوگرہ فوج نے گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر بازار بکرواناں کے ایک مکان میں گھس گیا۔ اس کے بعد کی ساری روداد میں نے اسے سنا دی۔ وہ سانس بھر کر کہنے لگا۔

"بڑا قتل عام ہوا ہے مسلمانوں کا۔ بڑی لاشیں پڑی ہیں مسلمانوں کی۔"

وہ ایک لمحے کے لئے چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔

"میرا نام عنایت مسیح ہے۔ جب سے امرتسر میں ڈوگرہ ملٹری داخل ہوئی ہے۔ میں رات کو چھرا لے کر جی ٹی روڈ پر نکل جاتا ہوں۔ کوئی بھولا بھٹکا مسلمان مل جائے تو اسے شریف پورے کیمپ میں پہنچا دیتا ہوں۔ فکر نہ کرو میں تمہیں بھی کیمپ میں پہنچا دوں گا۔ اگر میں وہاں نہ پہنچتا تو ان ظالموں نے تمہاری بوٹی بوٹی کر دینی تھی۔"

میں نے عنایت مسیح کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔

"شکریہ کس بات کا کاکا؟ یہ تو ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ مصیبت کے وقت دوسرے انسان کی مدد کرے۔"

میں نے کہا۔

"میں اب خود ہی شریف پورے چلا جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے یہاں سے تھوڑی دور تحصیل پورے کی جگی ہے۔ پھر تحصیل پورہ ہے۔ میں اسکی گلیوں میں سے ہو کر شریف پورے پہنچ جاؤں گا۔"

وہ کہنے لگا۔

"شاید تمہیں پتہ نہیں کہ تحصیل پورے میں جو چھ سات ہندوؤں کے مکان تھے وہ تو ہندو خالی کر کے بھاگ گئے ہیں مگر وہاں سکھ چھپے ہوئے ہیں۔ تم جیسے ہی تحصیل پورے میں داخل ہو گے وہ تمہیں قتل کر ڈالیں گے۔ کل انہوں نے دو مسلمان باپ بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔ دونوں بے چارے چائی ونڈ دروازے سے نکل کر شریف پورے کیمپ جا رہے تھے اور مارے گئے ابھی تم تھوڑا انتظار کرو۔ منہ اندھیرے تمہیں یہاں سے نکال کر خود شریف پورے لے جاؤں گا۔"

میں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کسقدر دلیر اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہے۔ دوسرے انسان کو بچانے کی خاطر اس نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال رکھی ہے۔ میں نے کہا۔

"جیسے آپ کہتے ہیں ویسے ہی کروں گا۔"

اس نے مجھے کونے میں رکھے ہوئے گھڑے میں سے ٹھنڈا پانی پلایا اور یہ کہہ کر باہر چلا گیا کہ میں تحصیل پورے کا ایک چکر لگا کر آتا ہوں۔ تم کوارٹر سے باہر مت نکلنا۔ وہ چلا گیا پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔

"میرے ساتھ آ جاؤ۔"

ہم رات کے اندھیرے میں کوارٹر سے نکلے اور تحصیل پورے والی جھی کی طرف چل پڑے۔ یہ راستہ میرا بھی دیکھا ہوا تھا۔ ہم بیری والی کوٹھڑی کے آگے سے گزرے۔ پھر تحصیل پورے میں داخل ہو گئے۔ تحصیل پورے کی گلیوں میں سناٹا اور اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہماری بائیں جانب لوکاٹوں کے باغ تھے۔ اس کے آگے ریلوے لائن آ جاتی تھی۔ جو جالندھر کی طرف جاتی تھی۔ وہیں سے ریل کی ایک پٹڑی بٹالہ گورداسپور کی طرف نکل جاتی تھی۔ عنایت مسیح مجھے مکانوں کے بالکل ساتھ ساتھ چلا رہا تھا۔ ہمیں ایک مکان میں سے دو تین آدمیوں کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ عنایت مسیح جھک کر دبے پاؤں چلنے لگا۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ تحصیل پورے کی دوسری گلی ویران تھی۔ وہاں آ کر عنایت مسیح نے مجھے بتایا کہ مکان کے اندر ہندو سکھ غنڈے شراب پی رہے تھے۔ ان لوگوں نے شریف پورے کی طرف جاتے کئی مسلمانوں کو قتل کر کے لاشیں گڑھوں میں پھینکی ہیں۔ جہاں سے شریف پورہ شروع ہوتا تھا وہاں بلوچ رجمنٹ کے جوانوں نے ایک مورچہ بنایا ہوا تھا۔ اندھیرے میں انہوں نے ہمیں دیکھ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

"کون ہو تم؟"

عنایت مسیح نے کہا۔

"ایک مسلمان کو کیمپ میں لایا ہوں۔"

شریف پورہ کیمپ میں پہنچ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ عنایت مسیح بولا۔

"اب یہاں سے باہر مت نکلنا۔ مسلم لیگ کے ٹرک آئیں گے وہ تمہیں بھی دوسرے مسلمانوں کے ساتھ پاکستان پہنچا دیں گے۔"

میرے پاس اس نیک دل مسیحی بھائی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ نہیں تھے۔ اگر کچھ الفاظ تھے بھی تو عنایت مسیح کے اعلیٰ ترین انسانی جذبے کے آگے وہ ہیچ معلوم ہو رہے تھے۔ میں کچھ کہنے لگا تو عنایت بولا۔

"کاکا! کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

اتنا کہہ کر عنایت مسیح سگریٹ پیتا تحصیل پورے کی گلیوں کی طرف چل دیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ اندھیرے میں میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو یقین کریں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے نہیں معلوم عنایت مسیح اس وقت کہاں ہوگا۔ اگر وہ زندہ ہے تو میں اس کی صحت کی دعا کرتا ہوں۔ اگر انتقال کر گیا ہے تو

اسے میری دعاؤں کی حاجت نہیں رہی۔ اس نے دنیا میں ہی جنت میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔

شریف پورہ کیمپ میں مہاجرین کا ہجوم پڑا تھا۔ چونکہ یہ مسلمانوں کی آبادی والا علاقہ تھا اور مسلمانوں کے مکان تھے اس لئے یہاں کوئی خیمہ وغیرہ نہیں لگا تھا۔ لوگ مکانوں کی چھتوں اور گلیوں میں چارپائیوں اور تخت پوشوں پر دریاں بچھا کر ان پر اپنے اپنے کنبوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مسلم لیگ کے ٹرک آتے تھے تو کچھ مہاجرین ان میں سوار ہو کر پاکستان کی طرف روانہ ہو جاتے۔ مہاجروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ٹرک زیادہ سے زیادہ چار پانچ آتے تھے۔ پھر ریلوے لائن کی جانب خالی مال گاڑی کے ڈبے آ کر لگنے لگے۔ ان میں دو ایک مال گاڑیاں مہاجرین کو لے کر لاہور کی طرف چل دیتی تھیں۔ میں بھی ایک مال گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ڈبے کی ایک چھت خراب تھی۔ گاڑی کے سارے ڈبے مسلمان مہاجرین سے بھرے ہوئے تھے۔ جن ڈبوں کی چھت تھی ان چھتوں پر بھی لوگ تھوڑا بہت سامان اور اپنے بال بچے لیکر بیٹھ گئے تھے۔ ٹرین آہستہ آہستہ امرتسر سٹیشن کی طرف چلنے لگی۔ شریف پورے کے مکانوں کی دیواروں والا علاقہ گذر گیا۔ پھر کمپنی باغ والا پھاٹک آگیا۔ میں نے حسرت بھری نظروں سے کمپنی باغ کی طرف دیکھا۔ دور سے دن کی روشنی میں مجھے کمپنی باغ کا پرانی طرز کا محرابی دروازہ دکھائی دیا۔ دائیں بائیں اونچے اونچے درخت بھی نظر آ رہے تھے۔ ان درختوں کے سایوں میں کھیل کود کر میں نے اپنا بچپن گذارا تھا۔ کمپنی باغ میری یادوں کی جنت تھی۔ اس وسیع و عریض باغ کا کوئی درخت ایسا نہیں تھا جس پر میری محبتوں کے نام نہ لکھے ہوئے ہوں۔ آج یہ محبتیں' ان محبتوں کے سارے نام مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے تھے۔ کمپنی باغ کے یہ درخت بھی دور سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہو گا۔ وہ ہوا میں اپنی شاخوں کو آہستہ آہستہ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہہ رہے تھے۔ انہیں میری خوشبو آ رہی تھی۔ مجھے ان کی خوشبو آ رہی تھی۔ محبت کی صرف خوشبو ہی ہوتی ہے۔ محبت کا کوئی جسم نہیں ہوتا۔

مال گاڑی عید گاہ والی دیوار کے قریب سے گذرتی ہوئی امرتسر سٹیشن کی ریلوے لائن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے لوگوں کے ٹرنکوں کے اوپر بیٹھے بیٹھے عید گاہ کے صحن اور جامن کے درختوں پر نگاہ ڈالی۔ درمیان میں بنا ہوا سبز پانی والا

تالاب نظر نہیں آرہا تھا۔ اس تالاب میں زرد سنہری اور سرخ مچھلیاں تیرتی رہتی تھیں۔ عید کے روز میں اپنے والد صاحب کے ساتھ یہاں عید کی نماز پڑھنے آیا کرتا تھا۔ عید گاہ کے قریب سے گاڑی گذری تو ایک لمحے کے لئے مجھے عید گاہ کے جامن اور انار کے درختوں کی خوشبو محسوس ہوئی۔ پھر یہ خوشبو آہستہ آہستہ پیچھے رہ گئی۔

"الوداع! میری عید گاہ کے انار کے درختو!"

"جامن کے درختو!"

"سبز تالاب میں تیرنے والی مچھلیو!"

"عید کے دن عید کی نماز پڑھنے والے مسلمانو!"

"امرتسر تم سے جدا ہو رہا ہے۔"

"تمہارا غرناطہ تم سے جدا ہو رہا ہے۔"

"اب الحمرا کے باغ ویران ہو جائیں گے تم اپنے سارے رنگ' ساری خوشبوئیں اپنے ساتھ لے کر پاکستان جا رہے ہو۔"

"الوداع! میری عید گاہ کے انار کے درختو!"

"جامن کے درختو!"

مال گاڑی ریلوے لائن میں سے گذر رہی تھی۔ اس کی رفتار ہلکی تھی۔ پھر امرتسر کا سٹیشن آگیا۔ مال گاڑی رکی نہیں۔ اسے دوسری سائیڈ سے آگے گذار دیا گیا۔ امرتسر سٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہندو سکھ چل پھر رہے تھے۔ مال گاڑی امرتسر سٹیشن کو پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ وہ علاقہ قریب آ رہا تھا جہاں سکھوں کا بڑا مقدس گوردوارہ ہے۔ ابھی گوردوارہ دور تھا کہ مجھے ریلوے لائن کے ساتھ جھاڑیوں میں ایک کٹی ہوئی لاش نظر آئی۔ لاش اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ اس کی کمر کندھے سے لے کر پیٹھ تک پھٹی ہوئی تھی۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس لاش کو دیکھا۔ اس کے بعد ایک اور لاش نظر آئی۔ اس کے بعد جھاڑیوں کے درمیان اکٹھی تین لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک لاش کا سر غائب تھا۔ لوگ سہم کر کلمہ شریف پڑھنے لگے۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کی لاشیں تھیں جنہیں ہندو سکھ غنڈوں نے قتل کر دیا تھا۔

سٹیشن تک ہم نے مسلمانوں کی بے شمار لاشوں کو بے گور و کفن جھاڑیوں میں اور ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ زمین پر پڑے دیکھا۔ ان میں بچوں اور عورتوں کی لاشیں بھی تھیں۔

بغیر چھت والے مال گاڑی کے ڈبے میں مسلمان مہاجرین سہمے ہوئے بیٹھے تھے۔ اس جگہ مسلمانوں کا کوئی قافلہ کٹ گیا تھا۔ سامان جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔

یہاں مال گاڑی کی رفتار بہت دھیمی ہو گئی۔ سٹیشن پر گاڑی رک گئی۔ سب بہت خوف زدہ تھے۔ سکھ پلیٹ فارم پر دور کھڑے کرپانیں لہراتے ہوئے مسلمانوں کو گالیاں دے رہے تھے اور پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اس مال گاڑی کے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے مسلح جوان بھی تھے جو اس گاڑی کی حفاظت پر مامور تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر بھی ان دنوں ہندو سکھ غنڈوں پر بلوچ رجمنٹ کی ایسی دہشت بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی ہندو یا سکھ گاڑی کے قریب آنے کی جرات نہیں کر رہا تھا۔ گاڑی یہاں سوچی سمجھی سکیم کے تحت کھڑی کی گئی تھی کہ جیسے گاڑی کھڑی ہو گی ہندو سکھ غنڈے اس پر حملہ کر دیں گے۔ بلوچ رجمنٹ کے جوان گاڑی کے اگلے ڈبوں سے لے کر پچھلے ڈبوں تک دوڑ دوڑ کر مسلمانوں کو حوصلہ دے رہے تھے کہ فکر نہ کرو۔ جب تک ہم زندہ ہیں تمہیں کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ انہوں نے ایک دو بار ہوائی فائر بھی کئے جس سے ڈر کر سکھ ہندو غنڈے پلیٹ فارم سے بھاگ گئے۔ آخر گاڑی چل پڑی ـــــ اسکے بعد خاصہ آیا۔ اس کے بعد ٹرین کسی جگہ نہ رکی اور چلتی چلی گئی۔ پھر اٹاری سے بھی گذر گئی۔ اب واہگہ قریب تھا۔ واہگہ سے پاکستان کی سرزمین شروع ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی واہگہ پر گاڑی رکی فضا "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے گونجنے لگی۔

پہلی بار پاکستان کا سبز ہلالی پرچم لہراتے دیکھا تو ایسے محسوس ہوا جیسے مردہ بدن میں پھر سے جان پڑ گئی ہو۔ ابھی یہ صرف سبز پرچم ہی تھا جو مسلم لیگ کا نشان تھا۔ یہاں کھانے پینے اور طبی امداد کا پورا انتظام تھا۔ میں مال گاڑی سے اتر کر واہگہ سٹیشن سے باہر سڑک پر آگیا۔ یہاں فوج اور مسلم لیگ کے اور دوسری نجی ٹرانسپورٹ کے ٹرک کھڑے تھے۔ لوگ ان میں سوار ہونے لگے۔ یہ ٹرک پہلے سیدھا لاہور سٹیشن کے باہر جو عارضی ریفیوجی کیمپ بنا ہوا تھا پہنچتے۔ مسلم لیگ کے رضاکار ہر ایک مہاجر سے پوچھتے کہ آپ والٹن کیمپ میں جائیں گے یا اپنے کسی رشتے دار کے ہاں جائیں گے۔ میں ٹرک سے اتر کر سیدھا وسن پورے اپنی بڑی ہمشیرہ کے مکان کی طرف چل پڑا۔ وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہماری فیملی کے سبھی لوگ پاکستان آ چکے ہیں صرف چھوٹا بھائی ابھی تک نہیں پہنچا۔ سب لوگ اس کے لئے پریشان

تھے۔ میں دن میں سٹیشن والے کیمپ کے دو تین چکر لگاتا کہ شاید بھائی آ گیا ہو۔ یہ
پندرہ سولہ اگست کے دن تھے۔ ایک دن میں لاہور سٹیشن کے پلیٹ فارم پر پھر رہا تھا
کہ فیروز پور کی طرف سے ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے ایک بھی مسافر باہر نہ
نکلا۔ اس کی بجائے مسلم لیگ کے رضا کار اور کچھ سفید کوٹوں والے ڈاکٹر لوگ
گاڑی کی طرف دوڑے۔ میں بھی ان کے پیچھے پیچھے گاڑی کے پاس آ گیا۔ دیکھا کہ
ڈبوں میں خون جما ہوا تھا۔ ہر ڈبہ لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی لاشیں تھیں
جو پاکستان پہنچنے کے لئے اپنا گھر بار چھوڑ کر فیروز پور زیرہ اور موگا اور دوسرے
دیہات سے گاڑی میں سوار ہوئے تھے کہ پاکستان پہنچ جائیں گے مگر راستے میں ہندو
سکھوں کے ایک بہت بڑے جتھے نے گاڑی پر حملہ کر دیا۔ جوان عورتوں کو اغواء کر
لیا گیا۔ بچوں بوڑھوں اور نہتے جوانوں کو کرپانوں تلواروں اور خنجروں سے کاٹ ڈالا
گیا۔

ڈبوں میں سے کٹی ہوئی لاشوں کو نکال کر سامان لادنے والی لوہے کی بڑی
بڑی ٹرالیوں پر ڈالا جانے لگا۔ لاشوں سے بھری ہوئی ٹرالیاں خدا جانے کس طرف
چل پڑیں۔ پلیٹ فارم پر دہشت، غصے اور خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ایک نوجوان نے
چیخ کر کہا۔

"ہم اپنے ایک ایک شہید کا پورا بدلہ لیں گے۔"

اسی شام کاموکی پر ہندو سکھ شرنارتھیوں سے بھری ہوئی مال گاڑی کو روک
کر حساب چکا دیا گیا۔ فیروز پور سے آنے والی کٹی ہوئی گاڑی کے ڈبوں کا خون پانی
کے بڑے بڑے پائپوں سے دھویا جانے لگا۔ میں ایک دھوئے ہوئے ڈبے میں داخل
ہوا تو مجھے ایک سیٹ کے نیچے لکڑی کے فرش پر کالے رنگ کا ایک انڈی پین پڑا ہوا
نظر آیا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا اور ڈر کر وہیں پھینک دیا۔ جسے میں انڈی پین
سمجھ رہا تھا وہ کسی انسان کا کٹا ہوا انگوٹھا تھا۔ جب سکھ اور ہندو غنڈے تلواریں
لہراتے اس ڈبے میں داخل ہوئے ہوں گے اور انہوں نے مسلمانوں عورتوں بچوں،
جوانوں اور بوڑھوں کو تلواروں سے کاٹنا شروع کیا ہو گا تو اس آدمی نے جس کا کٹا
ہوا انگوٹھا ڈبے میں پڑا رہ گیا تھا تلوار سے بچنے کے لئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا ہو گا اور
تلوار نے اس کے انگوٹھے کو کلائی تک کاٹ کر الگ کر دیا ہو گا۔ یہ گمنام شہید کون تھا
جس نے اپنی جان پاکستان پر قربان کر دی؟ کون اس کا سراغ لگائے؟ وہاں تو ہزاروں

عورتیں بچے جوان اور بوڑھے ٹرین میں شہید ہو گئے تھے۔ انہیں اس بے دردی سے
تلواروں برچھوں اور کرپانوں سے کاٹا گیا تھا کہ ٹرالی میں لدی ہوئی ایک بھی لاش کا
چہرہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ کسی لاش کا بازو سلامت نہیں تھا۔ ہمارے ان آبا و اجداد کو
ان سکھوں اور ہندوؤں نے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جن کی انڈین فلمیں اور
فحش ڈانس ہم زی اور ایل چینل پر بڑے شوق سے بال بچوں کے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے
ہیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ کیونکہ یہ کہنے کی نہیں سوچنے کی باتیں
ہیں۔ ہم نے اپنے اس دشمن کی شناخت کھو دی ہے جو ہمارا نام و نشان تک صفحہ ہستی
سے مٹانے کا انتظام کر رہا ہے۔ جس نے پاکستان کے وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں
کیا۔ میں پاکستان کی نئی نسل کو پاکستان پر قربان ہو جانے والے اپنے شہیدوں کی کٹی
ہوئی لاشیں اس لئے دکھا رہا ہوں کہ میں ان کا عینی شاہد ہوں۔ میں یہ لاشیں اپنی
زندگی کے آخری سانس تک آپ کو دکھاتا رہوں گا۔ اس لئے کہ میری غیرت ابھی
مری نہیں۔ اس لئے کہ میں نے اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ میں پھولوں، دریاؤں،
جنگلوں، بارشوں، ستاروں اور گنگناتے جھرنوں اور چائے کی خوشبوؤں اور محبتوں کا
ادیب ہوں ----- لیکن میں نے اپنے دشمن کو پہچان لیا ہے۔ اپنے وطن پاکستان کی
سرحدوں کی حرمت کو پہچان لیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اگر پاکستان نہیں تو پھر میں
بھی نہیں۔ میرے دریا بھی نہیں، میرے جنگل اور میری بارشیں بھی نہیں۔ پاکستان
میری غیرت ہے اور محبتیں کرنے والے بڑے غیرت مند لوگ ہوتے ہیں۔ میں نے
اپنے کسی افسانے، کسی کتاب میں کبھی کوئی شعر نہیں لکھا مگر اس وقت مجھے علامہ اقبال
کا ایک شعر بے اختیار یاد آ گیا ہے۔

غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاج سر دارا

ایک روز میں چھوٹے بھائی کا پتہ کرنے لاہور سٹیشن پر آیا تو وہیں پھرتے
پھراتے شام ہو گئی۔ دوپہر کے وقت والٹن کے مہاجر کیمپ سے بھی میں ہو آیا تھا،
جہاں آج کل لاہور کی جدید فیشن ایبل ڈیفنس کی عالی شان کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔
وہیں قریب ہی اگست 1947ء میں والٹن کا مہاجر کیمپ ہوا کرتا تھا۔ مشرقی پنجاب سے

لٹے پٹے مسلمان اسی کیمپ میں آتے تھے۔ ان کے پاؤں پیدل چل چل کے پھٹے ہوئے ہوتے تھے۔ چہروں پر گرد جمی ہوتی تھی۔ ویران آنکھیں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے ماں باپ بھائیوں اور اغواء شدہ بہنوں اور بیٹیوں کے غم میں رو رو کر سوجی ہوئی ہوتی تھیں۔ جسم نڈھال اور شکستہ ہوتے تھے اور اپنے بچھڑے ہوؤں کی یاد میں کیمپ کے کونوں میں کٹے ہوئے درختوں کی طرح پڑے ہوتے تھے۔ سینکڑوں مہاجرین ان کیمپوں میں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ والٹن کیمپ میں میرا دن میں ایک بار ضرور جانا ہوتا۔ میں ان لٹے پٹے مہاجرین میں اپنے بھائی کا چہرہ ڈھونڈھتا پھرتا۔ کئی بھائی کئی باپ کئی مائیں اپنے بھائیوں بیٹوں کے چہرے تلاش کرتی پھرتی تھیں۔ یہ وہ انمول قیمت تھی جو ہم اپنے آزاد وطن پاکستان کے لئے ادا کر رہے تھے۔ یہ وہ خستہ حال لوگ تھے جنہوں نے اپنے جگر گوشے ہندو سکھوں کے ہاتھوں کٹوا کر وطن پاک کے لئے بے مثال قربانیاں دی تھیں اور ہمیں اسی قابل بنایا تھا کہ ہم آزاد اسلامی مملکت کی آزاد فضاؤں میں آزادی اور خودمختاری سے اپنے بچوں کی مستقبل تعمیر کر سکیں۔

شام ہونے سے پہلے میں لاہور سٹیشن پر واپس آ گیا۔ وہاں ایک واقف کار مل گیا۔ اس نے بتایا کہ میرا چھوٹا بھائی شریف پورہ کیمپ میں پہنچ چکا ہے۔ اس نے میرے بھائی کو اپنی آنکھوں سے کیمپ میں دیکھا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور سٹیشن کے سامنے چائے کی دکان میں چائے پینے کے لئے بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں لاہور سٹیشن کے سامنے چائے کی دکانیں ہوتی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہوتے تھے جہاں مسافر کھانا کھاتے۔ رات کو ان دکانوں کے اوپر چارپائیاں بچھا دی جاتی تھیں۔ دو آنے کرایہ دے کر مسافر چارپائی پر سو کر رات بسر کر سکتا تھا۔ چائے کی دکان میں مجھے میری عمر کا ایک نو عمر لڑکا مل گیا۔ اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ کونے میں بیٹھا تھا۔ میں اس کے قریب لوہے کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ کہنے لگا۔

"ہم نکودر سے قافلے کے ساتھ چلے تھے۔ راستے میں سکھوں نے حملہ کر دیا۔ میرے ماں باپ اور دو بڑے بھائی سکھوں نے قتل کر دیئے۔ میری چھوٹی بہن خوف کے مارے ایک طرف کو اٹھ دوڑی۔ میں دوسری طرف بھاگ گیا۔ میں کسی نہ کسی طرح جان بچا کر پاکستان پہنچ گیا۔ آج چھ روز سے جگہ جگہ اپنی چھوٹی بہن کو

تلاش کر رہا ہوں کہ شاید وہ کسی دوسرے قافلے کے ساتھ پاکستان پہنچ گئی ہو مگر وہ کہیں نہیں مل رہی۔ خدا جانے پاکستان پہنچی بھی ہے یا نہیں۔ خدا سے ڈر ڈر کر دعائیں مانگتا ہوں کہ کہیں اسے کوئی سکھ نہ اٹھا کر لے گیا ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ رو رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"وہ مر گئی ہو تو اچھا ہے۔ اگر پاکستان نہیں پہنچ سکی تو مر گئی ہو تو اچھا ہے۔ کاش مجھے اس قافلے کا کوئی آدمی آ کر بتا دے کہ میری بہن سکینہ مر گئی تھی۔ انسے سکھوں نے قتل کر ڈالا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی لاشیں دیکھی ہے۔"

اس کے بعد میری نکودر ضلع کے اس نوجوان سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ خدا جانے اس کی بہن والٹن کیمپ میں پہنچی بھی تھی یا نہیں۔ اب تو اس بات کو اتنے برس گزر گئے ہیں۔ کئی زمانے بیت گئے ہیں۔ خدا جانے وہ نو عمر خوش شکل دیہاتی نوجوان زندہ بھی ہوگا یا اپنی بہن کو تلاش کرتے کرتے اس کی یاد میں روتے روتے مر گیا ہوگا۔

اگست 1947ء کا زمانہ تھا۔ مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے مہاجرین کے قافلے چلے آ رہے تھے۔ کوئی کسی طرف نکل جاتا۔ کوئی کسی طرف نکل جاتا۔ سب کچھ لٹ لٹا گیا تھا۔ صرف اسی بات کی خوشی تھی کہ ایک ایسی سرزمین میں پہنچ گئے ہیں جہاں ان کی زندگیاں، ان کی عزتیں محفوظ ہو گئی ہیں۔ سب کچھ لٹ گیا۔ گھر جل گئے۔ بہن بھائی بچھڑ گئے۔ ماں باپ شہید ہو گئے۔ لیکن اپنا ایک آزاد ملک قائم ہو گیا ہے۔ پاکستان بن گیا ہے۔ یہاں نئی زندگی شروع کریں گے۔ اپنے بچوں کا بغیر کسی خوف و خطر کے سنہری مستقبل تعمیر کریں گے اور اپنے دین اسلام کے مطابق آزادی اور عزت سے زندگی بسر کریں گے۔ قربانی بڑی تھی تو اس کا انعام بھی بہت بڑا تھا۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے قربانیاں دینی ہی پڑتی ہیں۔

وقت گزرتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ زخم مندمل ہوتے گئے۔ جس کو جہاں سر چھپانے کو ٹھکانہ ملا وہ وہیں رزق حلال کمانے اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں لگ گیا۔ اتنے لوگ ہجرت کر کے آئے مگر سب کے سب وطن پاک کی سکوں پرور آغوش میں سما گئے۔ اس زمانے میں بھی لاہور شہر میں اتنی آبادی اور رش نہیں تھا۔ یہی حال کراچی اور دوسرے شہروں کا تھا۔ لاہور کی مال روڈ پر کہاں اتنا ٹریفک ہوتا تھا۔ اتوار کے روز تو مال روڈ پر خاموشی چھائی رہتی تھی۔ کبھی کبھی کوئی تانگہ یا سائیکل سوار گزرتا تھا۔ نہ رکشے تھے۔ نہ ویگنیں تھیں۔ نہ سکوٹر تھے نہ ہی اتنی موٹریں اور بسیں تھیں۔ صرف ایک بس کرشن نگر سے چھاؤنی تک چلا کرتی تھی۔ لاہور میں مال روڈ پر پاک ٹی ہاؤس بن گیا تھا اور یہاں اردو کے شاعروں کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ اسی پاک ٹی ہاؤس میں میری پہلی ملاقات ناصر کاظمی اور اشفاق احمد سے ہوئی۔ سارا سارا دن چائے کے دور چلتے۔ رات کو افسانے لکھے جاتے۔ غزلیں لکھی جاتیں۔ یہ زبردست تخلیقی عمل کا دور تھا۔ ہمیں بھی لاہور شہر کے گنجان محلے میں ایک مکان الاٹ ہوا۔ مگر بارشوں میں اس کی چھتیں ٹپکنے لگیں۔ ہم اس متروکہ مکان کو ترک کر

کے مصری شاہ میں آ گئے۔ یہاں ہم نے ایک مکان کرائے پر لے لیا اور بڑی خوبصورت اور پرسکوں زندگی کا آغاز کیا۔ مصری شاہ کے آگے شاد باغ کا علاقہ تھا۔ اس کے آگے کھیت اور پھل دار باغات شروع ہو جاتے تھے جو آگے شالامار باغ سے جا ملتے تھے۔ یہ بڑا سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ آلودگی کا اس زمانے میں نام و نشان تک نہ تھا۔ موٹریں کسی کسی کے پاس ہی تھیں۔ لاریاں بھی چند ایک ہی دوسرے شہروں کو چلتی تھیں۔ صرف تانگے ہوتے تھے یا سائیکل۔ موٹر سائیکلیں بھی شہر میں کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔

میں ہر روز صبح منہ اندھیرے اٹھ کر شاد باغ کے کھیتوں میں سیر کرنے نکل جاتا۔ شبنم سے دھلی ہوئی فضا ہوتی۔ پھولوں اور سبزے کی مہک فضا میں بسی ہوتی۔ شاد باغ میں ایک بہت بڑا کھیت سچے گلابوں کا ہوتا تھا۔ اس کے گرد خاردار باڑھ لگی ہوتی تھی۔ ان گلابوں کی گل قند اور عرق بنتا تھا۔ میں اس کھیت کے کنارے صبح کی تروتازہ فضا میں جا کر کھڑا ہو جاتا اور لمبے لمبے سانس لیتا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے سچے گلاب کی خوشبو مجھے زمین سے اٹھا کر آسمانوں کی طرف لے جا رہی ہے۔ ان گلابوں کی خوشبو اب کہیں نہیں ملتی۔ اس سے آگے آلوچوں، امرودوں اور ناشپاتیوں کے باغ تھے۔ بہار کے موسم میں ان پھل دار درختوں کی ٹہنیاں پھولوں سے لد جاتی تھیں۔ آلوچے کے درختوں کی شاخیں چھڑیوں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی تھیں۔ بہار میں یہ چھڑیاں سفید اور گلابی چھوٹے چھوٹے پھولوں سے بھر جاتی تھیں۔ ناشپاتی کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی پیالیوں کی طرح کے بڑے بڑے نازک سفید پھول کھلتے تھے۔ آلوچے کے پھولوں کے درمیان پتے نہیں ہوتے تھے مگر ناشپاتی کی ٹہنیوں پر پھول بھی ہوتے تھے اور سبز پتے بھی ہوتے تھے۔

ایک روز میں سیر سے واپس آتے ہوئے ناشپاتی کے پھولوں کی دو ٹہنیاں بھی توڑ کر لیتا آیا تھا۔ مجھے یاد ہے جب میں مصری شاہ کے علاقے میں داخل ہوا تو مجھے کھیت میں بیٹھا ایک مالی مل گیا۔ اس نے میرے ہاتھ میں ناشپاتی کے پھولوں کی ٹہنی دیکھی تو کہنے لگا۔

"بابو جی! آپ ایک سیر ناشپاتیاں لے جا رہے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے پھل دار درختوں پر سے ٹہنیاں توڑنی بند کر دی تھیں۔ صرف سفید یا پیازی گلاب کے دو چار پھول ہی توڑ کر گھر لے جاتا تھا۔ ہمارا

گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پیچھے باورچی خانہ اور چھوٹا سا صحن تھا جس کے آدھے حصے پر انگور کی بیل نے سایہ کر رکھا تھا۔ ایک خاص موسم میں اس بیل میں سبز انگور کے خوشے لٹکنے لگتے جس کو ہمارے دادا جان تھیلیوں سے ڈھانپ دیتے تاکہ انہیں چڑیاں نہ کھا جائیں۔ جب انگور خوب پک جاتے تو میں میرا چھوٹا بھائی اور بہنیں ان انگوروں کے خوشے بڑی احتیاط سے اتار کر بڑے طشت میں جمع کرتے۔ انہیں بڑے پیار سے دھویا جاتا۔ پھر ان میں سے ہمسایوں کا حصہ ان کے گھروں میں پہنچایا جاتا۔ اس روز ہمارے گھر میں ڈھولک بجتی۔

چھوٹا بھائی ڈھولک بجا لیتا تھا۔

وہ گا بھی لیتا تھا۔ میں بھی اچھا گا لیتا تھا۔ شام کو سماوار میں سبز چائے پکنے لگتی۔ بھائی ڈھولک لے کر بیٹھ جاتا۔ گلاب کے پھولوں والا گلدان کمرے میں لا کر کارنس پر رکھ دیا جاتا۔ دو چار اگربتیاں سلگا لی جاتیں۔ دادا جان کمرے کے باہر بوریا بچھا کر فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ ڈھولک بجنے لگتی۔ ہم دونوں بھائی پنجابی کے لوک گیت گاتے۔ ڈھولک دھیمے دھیمے بجائی جاتی۔ گایا بھی دھیمے سروں میں جاتا کہ ہمسایوں کے سکون میں خلل نہ پڑے۔ جب سماوار میں سبز چائے ابلنے لگتی اور فضا میں اس کی خوشبو پھیل جاتی تو والدہ اور بہنیں باقر خانی اور کھنڈ قلچوں کا چھوٹا سا ٹرے لے کر آ جاتیں۔ گلابی رنگ کی سبز چائے پیالیوں میں ڈالی جاتی۔ دادا جان کو باہر چائے کی خوشبو آتی تو وہ وہیں سے خوش ہو کر بولتے۔

"بھئی میں چائے کی دو پیالیاں پیوں گا۔"

دادا جان انگور کی بیل کے نیچے بوریا بچھا کر بیٹھے رہتے۔ ان کے بوڑھے چہرے پر ہر وقت مسکراہٹ رہتی تھی۔ وہیں بیٹھ کر وہ سبز چائے میں قلچے ڈبو کر کھاتے اور قلچے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے خوب گول کر کے چڑیوں کو ڈالتے۔ چڑیاں ان کو چگنے کے لئے نیچے آتیں تو دادا جان بالکل ساکت ہو جاتے۔ ذرا سی بھی حرکت نہ کرتے کہ چڑیاں ڈر کر نہ اڑ جائیں۔ سردیوں میں وہ سر پر اونی ٹوپی پہن لیتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی چڑیا ان کی ٹوپی پر آ کر بیٹھ جاتی تو اس وقت ان کی حالت دیکھنے والی ہوتی تھی۔ بچوں کی طرح خوش ہوتے۔ کوئی انہیں بلاتا تو چھوٹی سی زبان نکال کر بلانے سے منع کر دیتے کہ مجھے نہ بلاؤ۔ میں بولا تو چڑیا اڑ جائے گی۔

یہ چھوٹی چھوٹی خوشیوں والے بڑے حسین اور قیمتی شب و روز تھے۔ اس

زمانے کی سادہ اور معصوم خوشیاں، میں کبھی نہیں بھلا سکوں گا۔ یہ یادیں میری زندگی کا سرمایہ ہیں۔

شام کو کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس کی محفلیں گرم ہوتیں۔ پاکستان کے وہ شاعر اور ادیب جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا وہ بیٹھ کر ایک دوسرے سے ادب و شاعری پر باتیں کرتے۔ ایک دوسرے کو اپنی تازہ غزلیں نظمیں سناتے۔ ناصر کاظمی کو کرشن نگر میں مکان الاٹ ہوا تھا۔ وہ ان کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ سیاہ بال، سیاہ موتیوں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں۔ بڑی مزے کی باتیں کرتا تھا۔ ایک روز ٹی ہاؤس میں آ کر کہنے لگا۔

"میں نے رات تازہ غزل لکھی ہے۔ وہاں کونے میں بیٹھتے ہیں۔"

ٹی ہاؤس کے کونے والی میز پر ہم بیٹھ گئے۔ چائے آ گئی اور ناصر کاظمی نے مجھے اپنی تازہ غزل سنائی۔ وہ غزل تھی۔

گرفتہ دل ہیں بہت آج تیرے دیوانے

وہ بہت کم کسی کو غزل سناتا تھا لیکن میری اس سے بڑی دوستی اور پیار تھا۔ مجھے وہ ضرور سناتا تھا۔ میرے علاوہ اپنے چند ایک دوسرے دوستوں کو بھی سناتا تھا۔ ایک رات پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے بارہ بج گئے۔ ٹی ہاؤس بند ہونے لگا تو ناصر کاظمی بولا۔

"چلو سٹیشن پر چلتے ہیں۔ وہاں ساری رات چائے ملتی ہے۔"

ہم مال روڈ سے پیدل ہی سٹیشن پر آ گئے۔ وہاں چائے پی اور مال روڈ کی طرف پیدل چل پڑے۔ گرمیوں کی رات تھی۔ رات کے شاید دو بج چکے تھے۔ جب ہم میکلوڈ روڈ سے مال روڈ پر بڑے ڈاک خانے کے سامنے آئے تو بڑے ڈاک خانے کی عمارت کے گنبد کے پیچھے سے زرد اور سرخ رنگ کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ بڑا اداس چاند تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے۔ ناصر کاظمی نے چاند کو دیکھ کر کہا۔

"میں نے ایک بار چاند کو دیکھ کر ایک شعر کہا تھا۔"

پھر اس نے مجھے شعر سنایا۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

ابن انشاء بھی ان دنوں لاہور میں ہی تھا۔ ابھی کراچی میں اس نے مستقل

رہائش اختیار نہیں کی تھی۔ میری اس کی بڑی یاری دوستی تھی۔ وہ مجھے کہا کرتا۔

"میں بھی تمہاری طرح رومان پسند ہوں۔ یہ لوگ مجھے صرف ترقی پسند ہی سمجھتے ہیں۔"

ہم دونوں کبھی کبھی لاہور کے گلی کوچوں کی سیر کو نکل جاتے۔ خوب آوارہ گردی کرتے۔ ایک بار ایک گلی سے دوسری گلی میں جا رہے تھے کہ آگے جا کر گلی بند ہو گئی۔ ایک عورت بند گلی کی دیوار کے پاس چولہے پر روٹیاں پکا رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر مرغیاں ایک طرف کو بھاگیں۔ عورت نے سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے کہا۔

"کس سے ملنا ہے۔"

ابن انشاء وہیں رک گیا۔ میں نے کہا۔

"بہن جی! غلام علی زرگر کا یہی مکان ہے۔"

اس نے کہا۔

"نہیں۔ یہاں کوئی غلام علی نہیں رہتا۔"

اور ہم معذرت کر کے تیزی کے ساتھ وہاں سے واپس مڑ گئے۔

میں ابھی تک مشرقی پاکستان نہیں گیا تھا۔ مغربی بنگال میں کافی آوارہ گردیاں کر چکا تھا مگر ڈھاکہ باریسال اور چٹا گانگ کاکسز بازار ابھی تک نہیں دیکھے تھے۔ میں نے کچھ پیسے جمع کئے اور ایک روز کراچی سے طیارے میں بیٹھ کر مشرقی پاکستان کی طرف پرواز کر گیا۔ ڈھاکے میں میرا ایک دوست نوادرات کا کاروبار کرتا تھا۔ میں اس کے پاس جا کر ٹھہرا۔ وہ میرے ساتھ مشرقی پاکستان کی سیاحت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ میں اکیلا جاؤں گا۔ وہ کہنے لگا۔ تم اس علاقے میں بالکل اجنبی ہو۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو کیا کرو گے۔ میں نے کہا۔

"اس علاقے کے جنگل درخت اور دریا میرے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ وہ سب میرے دوست ہیں۔ مجھے جانتے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔"

اور میں مشرقی پاکستان کی سیاحت کو اکیلا نکل کھڑا ہوا۔ ڈھاکہ کے کملا پور ریلوے سٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر چٹاگانگ گیا۔ وہاں سے واپس آ کر سلہٹ کی طرف نکل گیا۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں ہوتا تھا۔ پتلون بش شرٹ تھی۔ پاؤں میں جوتے تھے۔ جیب میں سگریٹ اور کچھ روپے ہوتے تھے۔ جہاں کپڑے ذرا میلے

ہوتے وہیں کسی لانڈری میں دھلا لیتا۔ اگر جنگل میں ہوتا تو کسی ندی کنارے بیٹھ کر خود اپنے کپڑے دھو لیتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میرا خیال ہے شاید برہمن باڑیہ کا سٹیشن تھا' تیسرے پہر کا وقت تھا۔ میں پلیٹ فارم کے بیچ پر بیٹھا کسی آگے جانے والی گاڑی کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک بنگالی سے سٹیشن پر ہی واقفیت ہو گئی تھی۔ وہ نوجوان لڑکا تھا۔ ہم آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک پسنجر ٹرین آ کر رکی۔ یہ میری ٹرین نہیں تھی۔ مجھے دوسری ٹرین پکڑنی تھی۔ ڈبوں میں سے مسافر اترنے لگے۔

ایک ڈبے میں سے گیروے کپڑوں والے بنگالی جوگی نما آدمی باہر نکلے۔ کسی کے پاس اکتارا تھا۔ کسی نے ڈھولک اٹھائی ہوئی تھی۔ ایک نے لپٹا ہوا بستر اٹھایا ہوا تھا۔ ایک کے پاس پانی کی صراحی تھی۔ آخر میں ایک جوگن اتری۔ اس نے بھی گیروے رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ماتھے پر سرخ بندیا تھی۔ چہرے کا رنگ چمپئی تھا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں طلسمی خمار سا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ پلیٹ فارم پر جس کی نظر اس پر پڑی وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں نے بھی اسے دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ واقعی اس کے حسن میں ایک عجیب شعلے ایسی چمک دمک تھی۔ اس کے حسن نے پلیٹ فارم پر جیسے آگ سی لگا دی۔

میرا بنگالی ساتھی بھی اسے دیکھنے لگا۔ بولا۔

"ایسی حسین بیراگن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔"

وہ عورت بیراگن تھی۔ بنگال میں ایسی منڈلی کو بیراگیوں کی منڈلی کہا جاتا تھا اور اس منڈلی میں گانے ناچنے والی عورتوں کو بیراگن کہا جاتا تھا۔ بیراگن اپنی منڈلی کے آدمیوں کے درمیان بڑی شاہانہ چال کے ساتھ چلتی پلیٹ فارم کے گیٹ کی طرف بڑھی۔ میں نے اپنے بنگالی ساتھی سے پوچھا۔

"یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟"

وہ بولا۔

"یہاں قریب ہی گاؤں کے زمیندار کے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ میرا خیال ہے یہ لوگ زمیندار کے ہاں جا رہے ہیں۔ وہاں آج رات کو گانا بجانا ہوگا۔"

یقین کریں اس بیراگن نے میرے اندر خوبصورتی اور کائنات کے حسن کو پیار کرنے والے جذبے کو بیدار کر دیا تھا۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ جہاں یہ

بیراگن جائے گی میں بھی وہیں جاؤں گا۔ اس وقت تک بیراگیوں کی ٹولی سٹیشن سے باہر نکل چکی تھی۔ میں چپکے سے اٹھا اور میں بھی سٹیشن کے گیٹ سے باہر آگیا۔

سامنے ناریل کے درختوں کے نیچے ایک سجی سجائی بیل گاڑی کھڑی تھی۔ شاید یہ اسی زمیندار نے بھیجی تھی جس کے بیٹے کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ بیراگن اکتارا ہاتھ میں لئے ایک طرف کھڑی تھی۔ بیراگن کے ساتھی بیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ بیراگن بھی بیل گاڑی میں بیٹھ گئی۔ بیل گاڑی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں کیسے پیچھے رہ سکتا تھا۔ میں بھی کچھ فاصلہ ڈال کر بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ بیل گاڑی کچھ دور تک پکی سڑک پر چلتی رہی۔ پھر ایک کچے راستے پر اتر گئی۔ دونوں جانب دھان کے کھیت تھے۔ ان کھیتوں میں کہیں کہیں تاڑ کے اونچے اور چھوٹی چھوٹی چھتریوں والے درختوں کے جھنڈ تھے۔ کھیتوں میں کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ بنگالی کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ جس ریلوے سٹیشن سے میں بیراگیوں کے پیچھے چلا تھا اس کی آبادی کے مکان آہستہ آہستہ دور ہوتے گئے۔ بیل گاڑی مختلف راستوں سے گزر رہی تھی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد کھیتوں اور ناریل کے درختوں کے درمیان دور ایک گاؤں کے آثار دکھائی دیئے۔ یہ وہی گاؤں تھا جہاں یہ منڈلی جا رہی تھی۔

سورج مغرب کی طرف کافی نیچے ہو گیا تھا۔ شام کے دھندلے سائے آہستہ آہستہ بڑھنے لگے تھے۔ گاؤں کے باہر کچھ لوگ کھڑے دور سے آتی بیل گاڑی کو دیکھ رہے تھے۔ یہ زمیندار کے آدمی تھے۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے بیراگیوں کا استقبال کیا۔ میں گاؤں کے باہر ایک جگہ درختوں کے پاس بیٹھ گیا۔ چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ بیراگی اور بیراگن گاؤں کے مکانوں کی طرف چلے گئے۔ میں اس وقت تک بیراگن کو دیکھتا رہا جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد میں اٹھ کر گاؤں کی طرف چل پڑا۔ پرانے حویلی نما ڈھلانی چھتوں والے مکان تھے۔ جگہ جگہ پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب بنے ہوئے تھے۔ بانس گاڑ کر ان پر جال پھیلائے ہوئے تھے۔ بچے شور مچاتے کھیل رہے تھے۔ ایک مکان کے باہر رنگ برنگی جھنڈیاں لگی تھیں۔ تخت پر دو تین آدمی بیٹھے پراتوں میں رس گلے بنا رہے تھے۔ ایک طرف آگ پر کڑھاؤ رکھا ہوا تھا۔ مکان کے اندر سے عورتوں اور بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیراگن اپنی منڈلی کے ساتھ اسی مکان میں گئی تھی۔ مکان کے پہلو میں کھلی

جگہ تھی جہاں تمبو قناتیں لگی ہوئی تھیں۔ جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ زمین پر دریاں بچھی تھیں۔ ایک جانب تخت کیسری رنگ کی چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ تین چار گاؤ تکیے لگے تھے۔ دو آدمی بجلی کی تاروں کا گچھا کھول رہے تھے۔ ایک آدمی بانس کے اوپر بجلی کے بلب لگا رہا تھا۔ بیراگیوں کی منڈلی نے اسی جگہ رات کو گانے بجانے کی محفل سجانی تھی۔ میری جیب میں کچھ روپے تھے۔ سگریٹ کا پیکٹ تھا۔ ماچس تھی۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ اس کے سوا مجھے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ بیراگن کا خوبصورت چہرہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے اس کے درشن کرنے کے لئے رات کا انتظار کرنا تھا۔ میں گاؤں کی پچھلی جانب آ گیا۔ یہاں ایک طرف بڑے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ ان درختوں میں کبھی کبھی کوئل کے بولنے کی آواز آ جاتی تھی۔ مشرقی پاکستان میں برسات کا موسم گزر چکا تھا۔ شام کا دھندلکا آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا تھا۔ درختوں کے درمیان ایک چھوٹی سی نہر بہہ رہی تھی۔ میں نہر کے کنارے بیٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ پانی پیا اور سگریٹ سلگا لیا۔ دل و دماغ پر بیراگن کا خیال چھایا ہوا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اتنی حسین عورت ان بیراگیوں میں کہاں سے آ گئی۔ وہ عورت کے حسن کی مکمل تصویر تھی۔ کسی وقت دل میں یہ خیال بھی آتا کہ آخر میں کیا سوچ کر اس بیراگن کے پیچھے آ گیا ہوں۔ میں تو اس بیراگن کی زبان بھی نہیں جانتا۔ اس سے کس زبان میں بات کروں گا؟ کیا بات کروں گا؟ میرے دل نے کہا۔ حسن کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ یہ خاموش زبان ہوتی ہے۔ اس زبان میں کوئی لفظ نہیں بولا جاتا۔ صرف ایک نظر دیکھنے سے ساری بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔

ندی کا پانی بڑی خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ درختوں پر خاموشی کا طلسم چھایا ہوا تھا۔ کوئل کے بولنے کی آواز اب نہیں آ رہی تھی۔ شاید وہ کسی طرف پرواز کر گئی تھی۔ جب شام کا اندھیرا چھا گیا تو میں اٹھ کر گاؤں کی طرف آ گیا۔ یہاں جس جگہ تمبو قناتیں لگی تھیں وہاں سے تھوڑے فاصلے پر ناریل کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ بجلی کے بلب روشن ہو گئے تھے۔ میں کافی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ لوگ آنا شروع ہو گئے۔ یہ گاؤں کے دیہاتی تھے۔ وہ دریوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے اور ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد کھانا تقسیم کیا جانے لگا۔ ایک آدمی میرے پاس بھی چاول اور رس گلوں کی تھالیاں رکھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے بنگلہ

زبان میں کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہ آیا۔

مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے چاول کھائے اور بیراگن کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ رات گہری ہو رہی تھی۔ لوگ کھانا وغیرہ کھا چکے تھے اور کوئی ناریل پی رہا تھا تو کوئی دری پر ہی لیٹ گیا تھا۔ میرا خیال ہے آدھی رات گزر چکی تھی کہ لوگوں میں کچھ ہلچل سی مچ گئی۔ جو دیہاتی دریوں پر لیٹے ہوئے تھے وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جو بیٹھے ہوئے تھے وہ سیدھے ہو گئے۔ اتنے میں چار آدمی ایک پالکی اٹھا کر قناتوں کے اندر آ گئے۔ پالکی میں سے ایک عورت بچے کو گودی میں اٹھائے باہر نکلی اور تخت پر جہاں گاؤ تکیے لگے تھے بیٹھ گئی۔ بچے کی عمر تین چار سال کی ہوگی۔ اس نے بڑا زرق برق لباس پہنا ہوا تھا۔ سر پر جھلمل کرتی ٹوپی تھی۔ عورت شاید اس کی ماں تھی۔ اس نے بھی بڑی بھڑکیلی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ان کی کچھ رشتے دار عورتیں بھی آ کر تخت پر بیٹھ گئیں۔ آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں شروع ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ راگ رنگ کی محفل شروع ہونے والی ہے۔

اب بیراگن بھی باہر آ جائے گی۔

گاؤں سے کچھ اور لوگ بھی آکر دریوں پر گانا سننے کے لئے بیٹھ گئے تھے۔ اس دوران گاؤں کا زمیندار بھی اپنے ملازموں کے ساتھ سفید کرتا پاجامہ پہنے، کاندھے پر شال رکھے ہاتھوں میں گیندے کے ہار لئے آکر تخت پر اپنی بیوی اور بچوں کے درمیان بیٹھ گیا۔ اس نے بچے کو گود میں بٹھا لیا اور اپنے ملازم سے کوئی بات کی۔ ملازم مکان کی طرف دوڑ پڑا۔

تھوڑی دیر بعد بیراگیوں کی منڈلی آتی دکھائی دی۔ بیراگن سب سے آگے آگے تھی۔ اس نے کیسری رنگ کی سادہ ساڑھی پہن رکھی تھی۔ لمبے بال شانوں پر کھلے تھے۔ پاؤں ننگے تھے۔ ہاتھ میں اکتارا تھا۔ گلے میں گیندوں کا ہار تھا۔ کلائیوں میں موتیے کے گجرے تھے۔ ماتھے پر سرخ بندیا چمک رہی تھی۔ وہ قناتوں کے نیچے بجلی کی روشنی میں آئی تو مجھے ایسے لگا جیسے حسن کی دیوی آسمانوں سے اتر کر انسانوں میں آ گئی ہے۔ بیراگی تخت کے سامنے کافی جگہ چھوڑ کر نصف دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔ بیراگن بھی ان کے پاس بیٹھ گئی - وہ بار بار اپنے بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کر لیتی۔ ہارمونیم کے ساتھ ڈھولک کو سر کیا جانے لگا۔ میں بھی ایک طرف ہو کر دری پر بیٹھ گیا۔

میں ایسی جگہ بیٹھا تھا جہاں سے مجھے بیراگن کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ کتارے کو ہارمونیم کے ساتھ سر کر رہی تھی۔ انگلی سے اکتارے کے تار کو رک رک کر چھیڑتی۔ اس میں سے آواز نکلتی تو سر جھکا کر اسے ہارمونیم کے اسی سر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی۔ سر کو جھکانے سے اس کے لمبے سیاہ بال جو ریشم کی طرح چمک رہے تھے اس کے رخسار کے آگے آ جاتے۔ ایسے لگتا جیسے چاند ادلوں میں چھپ گیا ہو۔ میں عالم مدہوشی میں بیراگن کے حسن کا نظارہ کر رہا تھا۔ مجھے خیال آنے لگا کہ قدرت نے عورت کو اتنا خوبصورت کیوں بنایا ہے؟ اگر خوبصورت ایا تھا تو پھر بدصورت عورتیں دنیا میں کیوں پیدا کیں؟ جب سارے ساز سر ہو گئے تو نڈلی کے ایک بیراگی نے دھیمی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

آہستہ آہستہ اس کی آواز بلند ہوتی گئی۔ اس کی آواز کے ساتھ ڈھولک بھی بج رہی تھی۔ ایک آدمی آہستہ آہستہ مجیرے بجا رہا تھا۔ لے قائم ہو گئی تو سارے بیراگی ساتھ گانے لگے۔ بیراگن ابھی تک اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اپنی چھپنی انگلی کے ناخن سے اکتارا بجا رہی تھی۔ اکتارا بجاتے ہوئے لے کے ساتھ اس کا سر بھی ہل رہا تھا۔ جب لے سم پر آتی تو بیراگن ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اپنے سر کو پیچھے کر لیتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے کھلے ہوئے بال اچھل کر ایک طرف کو لہرا جاتے۔ میں ایک عجیب کیفیت میں گم حیرت زدہ آنکھوں سے بیراگن کو دیکھ رہا تھا۔

اب ایک بیراگی اکتارا لے کر اٹھا اور گیت کی لے کے ساتھ لوگوں کے درمیان آہستہ آہستہ رقص کرنے لگا۔ میں بیراگن کو دیکھ رہا تھا۔ بیراگن اپنے پاؤں میں گھنگھرو باندھ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ناچنے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ مجھے رنگون کے دریائے ایراوتی کے ملاحوں کا گیت یاد آگیا۔

"تم نے یہ ناچ کہاں سے سیکھا ہے؟"
"ایراوتی کی لہرو!"
"کیا ان درختوں سے جہاں دریا"
"ایک طرف گھوم جاتا ہے؟"
"ایراوتی میں ہمارے آنسو گرتے رہے ہیں"
"ایراوتی اداس ہے!"

جو بیراگی رقص کر رہا تھا۔ وہ ڈھولک بجانے والے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ گیت بنگالی کا تھا۔ کوئی لوک گیت تھا۔ اس کے سر بڑے اداس اور لمبے لمبے تھے۔ پھر اچانک بیراگن اٹھی۔ اس کے ہاتھ میں اکتارا تھا۔ اس نے لمبے بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا۔ اکتارے والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ سر کو ایک طرف جھکایا اور گھنگھروؤں کی جھنکار میں درمیان میں آکر رقص کرنے لگی۔

وہ ایک عورت کا رقص نہیں تھا۔ وہ جنگل کا رقص تھا۔ دریا کا رقص تھا۔ دریا میں بہنے والے اداس کنول کے پھولوں کا رقص تھا۔ بیراگن گیت کی اداس لے کے ساتھ آہستہ آہستہ ناچ رہی تھی۔ کبھی وہ سر کو جھکا لیتی۔ جیسے کائنات کی عظیم حسن ازلیں کو سلام کر رہی ہو۔ کبھی اس طرح آہستہ سے گھوم جاتی جس طرح جنگل میں پرسکون ندی ناریل کے جھنڈوں سے نکل کر خاموشی سے مولسری کے باغوں کی

طرف گھوم جاتی ہے۔ فضا میں گیندے اور موتیے کے پھولوں کی مہک اڑ رہی تھی۔

اب بیراگن نے بھی گیت کے بول اٹھائے۔ اس کی آواز کوئل کی آواز سے زیادہ سریلی، زیادہ شیریں تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ کسی گم شدہ فردوس کا وحہ پڑھ رہی ہے۔ گیت کی لے تیز ہونے لگی۔ گھنگھروؤں کی جھنکاریں فضا پر چھا گئیں۔ بیراگن بجلی کی طرح تڑپ کر کبھی آگے کو جھکتی کبھی ایک دم پیچھے ہٹ جاتی۔ ہ گردش میں آگئی۔ یہ زمین کی گردش تھی۔ سورج کی گردش تھی۔ روشنی کی ردش تھی۔ رقص کرتے کرتے کسی وقت بیراگن کا چہرہ بجلی کے بلب کی روشنی میں تا تو اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے سفید موتیوں کی طرح چمکنے لگتے۔ بیراگن کا م موسیقی کے سروں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ مادہ غائب ہو رہا تھا۔ مادہ غائب ہو گیا ا۔ صرف توانائی باقی رہ گئی تھی۔ پھول نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا۔ صرف پھول کی وشبو رہ گئی تھی۔ اعضا کا حسن مادے کی نیکی ہے۔ نیکی روح کا نور ہے۔ بیراگن کا سن مجھے روح کے نور کی طرف لے جا رہا تھا۔ میرے جسم کا بوجھ ختم ہو گیا تھا۔ ے نہ اپنے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی نہ سانس کی آواز سنائی دے رہی ی۔ نورانی روشنی کا ایک سیلاب تھا جو بیراگن کے سرچشمہ حسن سے طلوع ہو کر ے اپنے ساتھ بہاتا ہوا ان سرمدی بلندیوں کی طرف لے جا رہا تھا، جن سے بچھڑ کر ں زمین پر دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

روشنی کا رقص جاری تھا۔ یہ رقص کب تک جاری رہا؟ کب بیراگن بالوں پیچھے جھکتی ہوئی اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی؟ گیت کے بول کب فضا میں خاموشی کے ندر میں اتر گئے؟ کچھ معلوم نہیں۔ جب مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ ب مجھے اپنے سانس کی آواز سنائی دینے لگی۔ جب مجھے اپنے دل کی دھڑکن کی آواز نے لگی تو میں نے دیکھا کہ وہاں نہ بیراگن تھی نہ اس کے بیراگی ساتھیوں میں سے ئی تھا۔ محفل ختم ہو چکی تھی۔ دریوں پر جگہ جگہ گیندے اور موتیے کے پھول رے پڑے تھے۔ جہاں بیراگن رقص کرتی رہی تھی وہاں دری پر سلوٹیں پڑی رہ ا تھیں۔ روشنی کی لہریں نکل گئی تھیں۔ اندھیرے کی لکیریں باقی رہ گئی تھیں۔

میں پنڈال میں سے اٹھ کر ایک طرف چل پڑا۔ کہاں جا رہا تھا؟ کس طرف رہا تھا؟ کچھ معلوم نہیں تھا۔ دل بیراگن کی طرف کھنچ رہا تھا لیکن جسم کا بوجھ مجھے ن کی طرف کھینچ رہا تھا۔ سورج سے ملنے کے لئے مجھے روشنی بن کر اپنے جسم سے

نکلنا تھا۔ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ کاش! میری روح کا کوئی جسم نہ ہوتا۔ میں سٹیشن کی طرف بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سٹیشن، شہر، سڑکیں، گلیاں، بازار ----- یہ اندھیرے کی چاردیواریاں تھیں۔ میں ان چاردیواریوں سے نکل کر روشنی کے صحراؤں کی طرف جا رہا تھا۔ بیراگن میری زندگی کے تاریک افق پر سورج بن کر طلوع ہو رہی تھی۔ اس کی سنہری کرنوں نے میری جسم کی تمام وادیوں، گھاٹیوں اور تاریک غاروں کو روشن کر دیا تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے اپنے جسم کے سات پردوں میں چھپی ہوئی روح کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ مجھے میری روح کا سراغ مل گیا تھا۔ میں نے کھل جا سم سم کا راز پا لیا تھا۔ اب میں واپس کیسے جا سکتا تھا۔

میں نے رات کا باقی حصہ وہیں گاؤں کے باہر ایک تالاب کے چبوترے پر لیٹ کر گذار دیا۔ جسے طلسمی خزانے کا راز معلوم ہو جائے اسے نیند کہاں آتی ہے۔ میں بھی باقی رات جاگتا رہا۔ منہ اندھیرے جب پو پھٹ رہی تھی تو میں چبوترے سے اتر کر اس ندی پر آگیا جو گاؤں کے پچھواڑے گھنے درختوں کے درمیان بہتی تھی۔ منہ اندھیرے کی پاکیزہ فضا تھی۔ شبنم گر رہی تھی۔ ہر طرح کے پیڑ پودوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ ندی کے آس پاس پانی میں اگی ہوئی گیلی گھاس کی مہک تھی۔ ابھی سورج نکلنے میں دیر تھی۔ ابھی درختوں میں چڑیوں نے بولنا شروع نہیں کیا تھا۔ ابھی ہر طرف خاموشی، گہری خاموشی اور سلیٹی رنگ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ندی کا پانی بڑے سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ دھندلے شیشے کی طرح لگ رہا تھا۔ اس طرح کی سطح پر جو پتے اور درختوں کی شاخیں تیرتی چلی جا رہی تھیں ان سے معلوم ہوتا تھا کہ ندی بہہ رہی ہے۔ میں نے پانی میں ہاتھ ڈالا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھوئے اور ناریل کے درختوں میں آگیا۔ یہاں زمین پر کچے ناریل ٹوٹ کر گرے ہوئے تھے۔ ایک ناریل کو پتھر سے توڑ کر میں نے اس کا پانی پیا۔ اس کی گری کھائی اور ایک چھوٹی سی بارہ دری کے کھنڈر میں آکر بیٹھ گیا۔ یہ کھنڈر میں نے شام کے وقت بھی دیکھا تھا۔ کسی تاریخی عمارت کی بارہ دری تھی۔ عمارت ڈھے چکی تھی۔ بارہ دری باقی رہ گئی تھی۔ وہ بھی شکستہ ہو رہی تھی۔ تاریخ عمارتوں کی تعمیر کرتی ہے۔ پھر ان کی شکست و ریخت کرتی ہے۔ پھر وہ ڈھے جاتی ہیں اور آخر میں بارشیں، دھوپ، آندھیاں سیلاب اور زلزلے صفحہ ہستی سے ان کا نام و نشان مٹا دیتے ہیں۔ میرے اوپر آسمان پر صبح کاذب کی نیلی نیلی جھلکیاں نمودار ہونے لگی

تھیں۔ درختوں پر پرندے ابھی تک اپنے اپنے گھونسلوں میں بچوں کو پروں میں لپیٹ کر سو رہے تھے۔ اس خاموشی میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔ یہ آواز ایسی تھی جیسے کسی نے پانی میں چھلانگ لگائی ہو۔ مجھے فکر لگا کہ کہیں یہ کوئی جنگلی درندہ نہ ہو اور میری بو پا کر اس طرف نہ آ رہا ہو۔ میں بارہ دری سے اتر کر درختوں کی اوٹ لیتا اس طرح دبے پاؤں چلنے لگا جدھر سے مجھے پانی میں چھلانگ کی آواز آئی تھی۔

میں ایک درخت کی اوٹ میں آگیا۔ یہاں سے مجھے ندی صاف نظر آ رہی تھی۔ رات کے تاریکی میں صبح کاذب کی ہلکی ہلکی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ مجھے ندی میں کوئی جاندار تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ جاندار تیر کر ندی کے دوسرے کنارے کی طرف جاتا اور پھر تیرتا ہوا واپس آ جاتا۔ میں آگے چل کر ایک اور درخت کی اوٹ میں کھڑے ہو کر غور سے دیکھنے لگا۔ یہ جاندار کوئی جانور نہیں تھا۔ یہ کوئی انسان تھا۔ میں نے یہی خیال کیا کہ کوئی دیہاتی صبح صبح ندی پر نہانے آگیا ہے۔ میں واپس مڑنے لگا تھا کہ وہ انسان ندی کے پانی میں کھڑا ہوگیا۔ تب میں اسے دیکھتا رہ گیا۔

یہ بیراگن تھی۔ وہ اپنے لمبے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے نچوڑ رہی تھی۔ اس کا چمپئی بدن بے لباس تھا۔ مجھے ایسے لگا جیسے ندی میں کوئی شعلہ نہا رہا ہے۔ بیراگن کی ساڑھی ندی کے کنارے گھاس پر پڑی تھی۔ وہ پانی میں بیٹھ گئی تھی اور اپنے لمبے بازو پانی کی سطح پر ادھر ادھر چپوؤں کی طرح لہرا رہی تھی۔ پھر وہ اٹھ کر بالوں کو نچوڑتی ہوئی پانی سے نکل کر کنارے پر آئی۔ ایک کپڑے سے اپنے چہرے اور بالوں کا پانی خشک کیا۔ ساڑھی پہنی اور گنگناتی ہوئی گاؤں کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چل پڑی۔ کچھ دور تک وہ مجھے نظر آتی رہی۔ پھر پچھلے پہر کے دھندلکوں میں گم ہو گئی۔

اسی روز بیراگیوں کی منڈلی گاؤں سے سٹیشن کی طرف چل دی۔ میں بھی ان کی بیل گاڑی کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر چلتا سٹیشن پر آگیا۔ یہ لوگ پلیٹ فارم پر آ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ میں بھی پلیٹ فارم پر آکر ان لوگوں سے کے ذرا قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ اس دوران میں نے منڈلی کے ایک آدمی سے باتیں شروع کر دیں۔ یہ لوگ شکستہ ہندوستانی میں بات کر لیتے تھے۔ میں یہاں وہ زبان نہیں لکھوں گا بلکہ اس کا صاف اردو میں ترجمہ کرتا جاؤں گا۔ میں نے اس آدمی سے رات ان کے منڈلی کے گانے بجانے کی بڑی تعریف کی اور اس سے پوچھا کہ وہ اب کہاں گانے

بجانے جا رہے ہیں۔ اس آدمی نے بتایا کہ اب وہ اپنے ڈیرے پر واپس جا رہے ہیں
جو رانگا متی میں دریائے کرنافلی کے کنارے پر واقع ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

"میں لاہور سے بنگال کی سیاحت کے لئے آیا ہوں۔ میں یہاں کے بیراگیوں
پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا تم لوگ مجھے اتنی اجازت دو گے کہ میں کچھ روز
تمہارے قریب رہ کر تمہارے رہن سہن کے طریقوں اور تمہارے رسم و رواج کا
مشاہدہ کر سکوں۔"

وہ بیراگی ہنس پڑا۔ کہنے لگا۔

"اس کی اجازت ہمارے گورو جی ہی دے سکتے ہیں۔ تم ایسا کرو ہمارے
ساتھ چٹا گانگ تک چلو۔ راستے میں گورو جی سے بات کر کے تمہیں اجازت دلوا دوں
گا۔"

بیراگن مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک بوڑھے بیراگی کے پاس بینچ پر بیٹھی اس
سے باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے بیراگی سے باتیں کرتے دو ایک بار سرسری انداز
میں دیکھا تھا۔ میں نے بیراگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ چٹا گانگ تک چلتا ہوں۔ میں گاڑی کا ٹکٹ
لے آؤں۔"

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بابو ہم لوگ تو کبھی ٹکٹ نہیں خریدتے۔"

میں نے ہنس کر کہا۔

"تم بیراگی لوگ ہو۔ تمہیں کرایہ شاید معاف ہو مگر مین بیراگی نہیں ہوں
میں اپنی ٹکٹ لے کر آتا ہوں۔"

باہر آ کر میں نے برہمن باڑیہ سے چٹاگانگ تک تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لیا او
واپس آ کر بیراگی کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔

کافی دیر بعد ٹرین آ گئی۔ میں بھی بیراگیوں کے ساتھ ٹرین میں سوار ہو گیا
ٹرین چٹا گانگ کی طرف روانہ ہو گئی۔ بیراگی چھ سات آدمی تھے۔ ان کا گورو دیو ا
بوڑھا بنگالی تھا۔ جس کا رنگ کالا اور سر گنجا تھا۔ وہ ناریل پی رہا تھا۔ میں بیراگن
تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیکھ لیتا تھا۔ وہ کچھ دیر بوڑھے گورو دیو کے پاس بیٹھی ا
کے پاؤں دباتی رہی۔ پھر اوپر برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی۔ اس نے ڈبے میں بھی

اپنی منڈلی کے ساتھ سوار ہوتے دیکھ لیا تھا۔ برتھ پر چڑھتے وقت بھی اس نے ایک
نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی تھی۔ بیراگن کیا سوچ رہی تھی؟

جس بیراگی نے مجھے گورو دیو سے اجازت دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ اب
گورو دیو کے پاس جا بیٹھا تھا اور میرے بارے میں باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اس کا
اندازہ یوں لگایا کہ بوڑھے بیراگی نے دو ایک بار آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔
ٹرین مشرقی بنگال کے میدانوں، کھیتوں، جنگلوں، دریاؤں اور ندی نالوں پر سے گذرتی
اپنی منزل کی طرف بڑھی چلی جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سٹیشن آتے اور گذر
جاتے۔ کسی بڑے شہر کا سٹیشن آیا۔ یاد نہیں یہ کون سا شہر تھا۔ یہاں ٹرین کافی دیر
رکی رہی۔ بیراگیوں نے یہاں اپنی پوٹلیوں کو کھول کر کھانا وغیرہ کھایا۔ میں نے بھی
سٹیشن پر اتر کر کھانا کھایا۔ چائے پی اور ڈبے میں آ کر بیٹھ گیا۔ اب میرا دوست بیراگی
میری سیٹ کے پاس آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ٹرین چلی تو اس نے مجھے بتایا کہ گورو جی سے
بات ہو گئی ہے۔ انہوں نے تمہیں اپنے ڈیرے پر کچھ دیر تک رہنے کی اجازت دے
دی ہے۔ میں بڑا خوش ہوا۔ میں نے اوپر برتھ کی طرف دیکھا۔ بیراگن ابھی تک سو
رہی تھی۔ چٹاگانگ تک کافی لمبا سفر تھا۔ ٹرین سارا دن ساری رات چلتی رہی۔ اگلے
روز صبح کے وقت ہم چٹاگانگ پہنچے۔ یہاں سے بیراگیوں نے ایک بیل گاڑی لی۔ میں
بھی ان کے ساتھ بیل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میرے دوست بیراگی نے جس کا نام دھنیا
تھا۔ مجھے گورو جی سے ملا دیا تھا۔ جب میں گورو جی کے قریب ہی گاڑی میں بیٹھا تھا۔
بیراگن گوروجی کی دوسری جانب بیٹھی ہوئی تھی۔ گاڑی کے آگے دو بیل جتے ہوئے
تھے۔ چٹاگانگ سے ہمیں اس بیل گاڑی میں ہی رانگا متی کی پہاڑیوں کے دامن میں
دریائے کرنافلی کے قریب واقع ان بیراگیوں کے ڈیرے پر جانا تھا۔

ہم خانہ بدوشوں کی طرح سفر کر رہے تھے۔ دوپہر تک میدانی علاقے میں
سے گذرتے رہے۔ اس کے بعد زمین اونچی نیچی شروع ہو گئی۔ راستے میں ایک جگہ
رک کر بیراگیوں نے کھانا وغیرہ پکایا۔ بیراگن عجیب مشکوک سی نظروں سے مجھے دیکھتی
رہی۔ ابھی تک میری اس کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ
کم باتیں کرنے والی عورت ہے۔ اپنی منڈلی میں بھی کسی سے زیادہ بات نہیں کرتی
تھی۔ گورو جی کی بڑی خدمت کرتی تھی۔ دوپہر کے بعد ہم کھانا کھا کر دوبارہ سفر پر
روانہ ہو گئے۔

اب جنگل شروع ہو گیا۔ میرے دوسرے بیراگی دھنیا نے مجھے بتایا کہ یہ سندربن کے جنگل کا ایک حصہ ہی ہے۔ اسے رانگا متی کا جنگل کہتے ہیں۔ دریائے کرنافلی کے دوسرے کنارے پر سندربن کا بھارت والا حصہ ہے۔ میں نے جب اس خدشے کا اظہار کیا کہ جنگل میں شیر، ہاتھی تو ضرور ہوں گے تو دھنیا کہنے لگا۔

"ضرور ہوتے ہیں مگر وہ سادھو سنیاسیوں اور بیراگیوں کو کچھ نہیں کہتے۔ اسی طرح جو لوگ ناگ دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ انہیں بھی سانپ کچھ نہیں کہتے۔ جنگل میں کوئی سانپ سامنے آ جائے تو وہ راستہ چھوڑ کر دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شیر سے آمنا سامنا ہو جائے تو یا تو وہ خود راستے سے ہٹ جائے گا یا ہلکی سی غراہٹ کے ساتھ ہمیں خبردار کرے گا کہ دوسری طرف سے ہو کر نکل جاؤ۔"

اس کے باوجود مجھے سانپوں اور جنگلی درندوں کا ڈر لگا رہا۔ یہ ضعیف الاعتقاد لوگ ہیں۔ بھلا شیر کو کیا پتہ کہ کون سادھو سنیاسی ہے اور کون بیراگی ہے۔ جنگل میں پہلے تو درخت دور دور تھے۔ پھر قریب آنے لگے۔ اس کے بعد جنگل اتنا گھنا ہو گیا کہ اس میں سے صرف بیل گاڑی کے گذرنے کی ہی جگہ تھی۔ یہ دیودار کے درختوں کا جنگل تھا۔ فضا میں حبس تھا اور دیودار کے درختوں کی بوجھل خوشبو رچی ہوئی تھی۔ کسی وقت ہوا کا بہت ہلکا سا جھونکا آتا تو دلدل اور تالاب کے پانی کی بو آتی۔ ہمیں جنگل میں ہی رات پڑ گئی۔ ایک جگہ بیل گاڑی کھڑی ہو گئی۔ یہاں بانس کی تیلیاں کھڑی کر کے اوپر ترپالیں ڈال کر دو چھوٹے چھوٹے خیمے بنا دیئے گئے۔ ایک خیمہ بیراگن کے آرام کے لئے تھا اور دوسرا خیمہ گورو جی کے لئے بنایا گیا تھا۔ ہم لوگ بیل گاڑی پر ہی پڑ گئے۔ آگ کا الاؤ روشن کر دیا گیا تھا تاکہ جنگلی درندے آگ کو دیکھ کر قریب نہ آئیں۔

منہ اندھیرے بیراگی اٹھ بیٹھے۔ خیمے لپیٹ کر بیل گاڑی میں رکھ دیئے گئے۔ چائے اور چاول پکا کر کھائے گئے۔ بیراگن گورودیو کے پاس بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ یہ بڑی اچھی بات تھی کیونکہ میں کسی بھی عورت کو کھانا کھاتے نہیں دیکھ سکتا اور بیراگن کو تو کھانا کھاتے بالکل ہی نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جنگل میں ایک بار پھر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

آگے پہاڑی جنگل شروع ہو گیا تھا۔ جھاڑیاں، درخت سرکنڈے اور گھاس

کے علاوہ دلدلی زمین تھی۔ فضا میں بہت حبس تھا۔ ہوا کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ تیسرے پہر کہیں گھنے درختوں کا سلسلہ ختم ہوا اور دریائے کرنافلی کا کنارا نظر آیا۔ اس طرف سے مرطوب ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ ایک بیراگی نے بیل گاڑی پر بیٹھے بیٹھے اکتارے پر کوئی بنگلہ لوک گیت چھیڑ دیا۔ بنگلہ گیتوں کی لے بڑی اداس ہوتی ہے۔ یہ اداسی بنگال کی عورتوں کے چہروں سے لے کر وہاں کی ہر شے میں دکھائی دیتی ہے۔ جیسے جیسے دریا قریب آ رہا تھا بیراگی کی آواز بلند ہو رہی تھی۔

دریائے کرنافلی بہت بڑا دریا تھا۔ پاٹ بہت چوڑا تھا۔ دوسرے کنارے کے درخت بہت چھوٹے چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ یہیں ایک ٹیلے کے دامن میں ان بیراگیوں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بیل گاڑی کو دیکھ کر عورتیں، بچے اور مرد جھونپڑیوں سے نکل آئے۔ وہ ہاتھ ہلا کر اور گیت گا کر اپنے ساتھی بیراگیوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ بانس کی چھوٹی بڑی جھونپڑیاں ٹیلے کے دامن میں اور اس کی ڈھلان پر جگہ جگہ دکھائی دے رہی تھیں۔ کسی کسی جھونپڑی کے باہر آگ جل رہی تھی۔ گائے بھینسیں بھی بندھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ یہاں مجھے ایک چھوٹی سی جھونپڑی دے دی گئی۔ گوروجی نے اپنی بنگلہ نما ہندوستانی میں کہا کہ تم جتنے دن چاہو اس جھونپڑی میں رہ سکتے ہو۔

"لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ جنگل میں اکیلے مت جانا۔ تم بیراگی نہیں ہو اور ناگ دیوتا کے پجاری بھی نہیں ہو۔ تمہیں سانپ کاٹ سکتا ہے اور شیر بھالو بھی تم پر حملہ کر سکتا ہے۔"

شام کو میں کھانا کھانے کے بعد اپنی جھونپڑی کے باہر بیٹھ گیا۔ کچھ فاصلے پر کرنافلی دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کی طرف سے بڑی خوشگوار ہوا آ رہی تھی۔ اتنے میں دھینا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔

"پورن ماشی کی رات کو ہم سارے بیراگی مل کر بڑا جشن مناتے ہیں مگر ابھی اس میں دس پندرہ دن رہتے ہیں۔ تب تک تم ہمارے ساتھ ہی رہو گے۔"

میں نے کہا۔

"کیوں نہیں۔ پورن ماشی کا تمہارا جشن ضرور دیکھوں گا۔"

سورج مغرب کی طرف پہاڑیوں کے پیچھے چلا گیا تھا اور ڈھلانوں پر اندھیرا چھا گیا تھا۔ مجھے بیراگن دکھائی دی۔ وہ دریا کی طرف جا رہی تھی۔ دریا کی طرف جو

راستہ جاتا تھا وہاں بانس کے بڑے درخت تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی بیراگن کے پیچھے پیچھے جاؤں مگر دھنیا میرے پاس بیٹھا تھا۔ سورج غروب ہونے کے بعد رات کے سائے تیزی سے بڑھنے لگے۔۔۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد دھنیا اٹھ کر چلا گیا۔

میں جھونپڑی کے آگے بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ میں بیراگن سے ملنے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔ بیراگی لوگ کچھ فاصلے پر جھونپڑیوں کے باہر چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ ایک طرف آگ کا الاؤ روشن تھا۔ ایک بیراگی کے اکتارے پر گانے کی آواز آنے لگی۔ میں خاموشی سے جھونپڑی کے چبوترے سے اتر کر دریا کی طرف چل پڑا۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ درختوں جھاڑیوں کے خاکے نظر آ رہے تھے۔ میں بانس کے جھنڈوں کی طرف جانے کی بجائے دوسری طرف سے ہو کر دریا پر آگیا۔ مجھے یہ ڈر ضرور تھا کہ کسی طرف سے کوئی سانپ یا شیر نہ نکل آئے لیکن دھنیا نے بتایا تھا کہ ادھر بیراگیوں کی آبادی ہے۔ ادھر شیر بھالو کم ہی آتے ہیں۔ میں دریا کے کنارے کنارے اس طرف چلنے لگا جدھر بانس کے جھنڈوں والا راستہ دریا پر آتا تھا۔ بیراگن اسی طرف سے آئی تھی۔ دریا کا پاٹ صاف دکھائی دیتا تھا۔ پانی کا بہاؤ بڑا پر سکون تھا۔ میں درختوں کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ بیراگن کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ بانس کے جھنڈوں میں ایک غار سا بن گیا تھا۔ میں اس طرف گیا ہی تھا کہ مجھے کسی عورت کے گنگنانے کی آواز آئی۔ میں نے چونک کر اس طرح دیکھا جس طرف سے آواز آ رہی تھی۔ یہاں دریا کا کنارا کٹا ہوا تھا اور پانی ایک جگہ تالاب کی شکل میں جمع ہو گیا تھا۔ تالاب پر گھنے درخت جھکے ہوئے تھے۔ ایک جگہ بیراگن بیٹھی نہا رہی تھی۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اس کا سایہ ہی نظر آ رہا تھا۔ پھر مجھے خیال آگیا کہ بیراگن نے مجھے دیکھ لیا تو وہ ضرور برا مانے گی مگر میں اس سے نظریں بھی ہٹانی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ بیراگن تالاب میں کمر تک اتری ہوئی تھی اور دونوں ہاتھوں سے اپنے اوپر پانی ڈال رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ کوئی گیت بھی گنگنا رہی تھی۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ نہانے کے بعد اس نے ساڑھی پہنی۔ بالوں کو جھٹک کر پیچھے کیا اور آہستہ آہستہ بانس کے جھنڈوں کی طرف چل پڑی۔ وہ میرے قریب سے گذری۔ میں ذرا سا پیچھے ہٹا تو ایک پتھر میرے پیر سے لگ کر لڑھک گیا۔ بیراگن وہیں رک گئی۔ اس نے بنگلہ میں کچھ کہا۔ میں درخت کے پیچھے سے نکل کر اس کے

سامنے آگیا۔

"میں ہوں۔"

دریا کے کنارے یہ کھلی جگہ تھی۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے کی شکلیں نظر آ رہی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ ایک دو سیکنڈ بالکل بت بنی میری طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔

"تم میرا پیچھا کس لئے کر رہے ہو؟"

اس نے اپنی بنگلہ ملی ہندوستانی میں یہ جملہ کہا تھا۔ میں اس کے جملے کو یہاں صاف کر کے لکھ رہا ہوں۔ میری حالت اس وقت بالکل ایسی تھی جیسے کسی دریا کی لہروں کی سمندر میں گرتے وقت ہوتی ہے۔ اس وقت دریا کی لہریں دیوانہ وار بہہ رہی ہوتی ہیں اور سمندر سے ملنے کو بے تاب ہوتی ہیں۔ میں اپنے سمندر سے بچھڑی ہوئی لہر تھی۔ میرا سمندر اچانک میری سامنے آگیا تھا۔ میں اس سے ملنے کو بے تاب تھا۔ میں سورج سے بچھڑی ہوئی کرن تھی۔ میرا سورج اچانک میرے سامنے آگیا تھا۔ میں اپنے سورج میں سما جانے کو بے تاب تھا۔ میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ جتنا خالص سورج کا سونا تھا اتنی خالص میری کرن تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر بیراگن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے روشنی بیراگن کا ہاتھ بن کر میرے ہاتھوں میں آگئی ہے۔ بیراگن نے ذرا سی بھی مدافعت یا جھجک کا مظاہرہ نہ کیا۔ اس پر میرے دل کا حال کھلا تھا۔ میں نے کہا۔

"تم جانتی ہو میں تمہارے پیچھے پیچھے یہاں تک کیوں آ گیا ہوں۔ یہ تو رانگا متی کی پہاڑیاں ہیں اور یہ جگہ ہماری زمین پر ہے۔ اگر تم زمین سے نکل کر کسی دوسرے ستارے پر بھی چلی جاتیں تو میں تمہارا پیچھا کرتا وہاں بھی پہنچ جاتا۔ جانتی ہو کیوں؟ تم جانتی ہو۔ تمہارا خاموش چہرہ' تمہاری خاموش نظریں بتا رہی ہیں کہ تم اس کی وجہ جانتی ہو۔ بیراگن! تم نے میرے اندر ایک آگ لگا دی ہے یا شاید اس آگ کو پھر سے روشن کر دیا ہے جو بجھ رہی تھی۔"

بیراگن نے گردن ایک طرف ٹیڑھی کر کے مجھے عجیب پر اسرار انداز سے دیکھا اور میرے ہونٹوں پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھا اور ہاتھ کو پیچھے لے جاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں۔ آؤ ادھر بیٹھ جاتے ہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ہم دریا کے کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ

میں بیٹھ گئے۔ اس نے اپنی گہری آواز میں کہا۔

"تم کو یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ میرا تمہارا ملاپ کبھی نہیں ہو سکے گا۔ تم شہروں کے رہنے والے ہو۔ میں بیراگن ہوں۔ میں شہروں میں جا کر نہیں رہ سکتی۔ تم بیراگی نہیں بن سکتے۔ پھر اس شے کا پیچھا کرنے کا کیا فائدہ جس کو تم کبھی حاصل نہیں کر سکتے؟"

میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ چوم لیا اور کہا۔

"میں بیراگی بن جاؤں گا۔ میں اب بھی بیراگی ہی ہوں۔ صرف بیراگیوں والا لباس نہیں پہنا۔ میں تمہاری خاطر اپنے سارے شہر' اپنا ملک' اپنا گھر' اپنا سب کچھ چھوڑ دوں گا۔"

بیراگن مسکرا رہی تھی۔ ستاروں کی نورانی روشنی میں میں نے اس کے ہونٹوں کے درمیان دانتوں کی جگہ ستاروں کو چمکتے دیکھا۔ اس نے گہرا سانس بھر کر آہستہ سے اپنا ہاتھ میرے ہاتھوں سے کھینچ لیا اور کہا۔

"ہمارے لوگ تمہیں قبول نہیں کریں گے۔ ہم کسی کو بیراگی بنا کر اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا۔

"میں گوروجی کو راضی کر لوں گا۔"

بیراگن اپنے جڑے ہوئے گیلے بالون کو آہستہ آہستہ کھول رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ بھی گوروجی سے میری سفارش کر دے۔ وہ بولی۔

"میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے اپنی منڈلی مین شامل ہوتے نہیں دیکھ سکتیں۔"

بیراگن نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھا کر ستاروں کو دیکھا۔ پھر ایک نگاہ دریا کی پرسکون لہروں کو دیکھا اور میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"تم واپس اپنی دنیا میں چلے جاؤ۔"

یہ کہہ کر اس نے ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں مجھ پر ایک نگاہ ڈالی۔ آہستہ سے اٹھی اور بانسوں کے جھنڈوں میں بنے ہوئے سرنگ نما راستے کی طرف

چل دی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ جب بانس کے درختوں نے اسے اپنے اندر چھپا لیا تو میں بوجھل دل لئے اپنی جھونپڑی کی طرف چلنے لگا۔ دوسرے دن بیراگن نے مجھ سے کوئی بات نہ کی۔ میں اپنے بیراگی دوست دھنیا کے پاس بیٹھا تھا۔ بیراگن میرے قریب سے ہو کر گذری۔ اس نے نگاہ غلط سے بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ میرا دل اداس ہو گیا تھا لیکن میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں بیراگن کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

دن گذر گیا۔ شام کو جھونپڑیوں کے باہر مٹی کے تیل والی لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ میں اپنی جھونپڑی کے آگے چارپائی پر بیٹھا بیراگن کی جھونپڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی جھونپڑی کے باہر بھی لالٹین روشن تھی مگر وہ خود مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ پھر سوائے ایک لالٹین کے باقی ساری لالٹینیں بجھا دی گئیں۔ بیراگیوں کی جھونپڑیوں پر گہری خاموشی چھا گئی۔ دریا کی طرف سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آ رہے تھے۔ آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ دریا پار سندربن کے تاریک جنگل میں سے کسی درندے کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے چارپائی پر لیٹے لیٹے اپنا چہرہ بیراگن کی جھونپڑی کی طرف کیا اور اس امید پر دیکھنے لگا کہ شاید بیراگن کا دیدار ہو جائے لیکن جھونپڑی پر اندھیرا طاری تھا۔ اس کے بعد میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور میں گہری نیند سو گیا۔

جب آنکھ کھلی تو دن کافی نکل آیا تھا۔ سورج رانگا متی کی پہاڑیوں کے اوپر آ گیا تھا۔ میں چارپائی پر اٹھ بیٹھا۔ پھر مجھے ایک تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ جھونپڑیوں کے آگے کوئی بیراگی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کہیں آگ نہیں جل رہی تھی۔ میں چبوترے سے اتر کر جھونپڑیوں کی طرف گیا۔ ایک ایک جھونپڑی کو دیکھا۔ ساری جھونپڑیاں خالی تھیں۔ بیراگیوں کی بھینیں اور گائے بھی وہاں پر نہیں تھی۔ چولہوں میں رات کی جلی ہوئی آگ راکھ بن گئی تھی۔ میں دیوانہ وار بیراگن کی جھونپڑی کی طرف دوڑا۔ بیراگن کی جھونپڑی بھی خالی تھی۔ زمین پر موتیے اور گیندے کے تین چار باسی پھول پڑے تھے۔ میں نے وہ پھول اٹھا لئے۔ ان میں سے بڑی افسردہ خوشبو آ رہی تھی۔

یہ لوگ کہاں چلے گئے ہیں؟

یہی ایک سوال مجھے پریشان کر رہا تھا۔ آسمان پر دیکھتے دیکھتے ایک طرف سے گھٹا امڈ کر آئی اور اس نے سورج کو چھپا لیا۔ وہاں کوئی انسان نہیں تھا جس سے میں

پوچھتا کہ بیراگی کہاں گئے ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبا بانس تھا اور دوسرے ہاتھ میں پلاسٹک کا ڈول تھا۔ جب وہ قریب آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

"یہ بیراگی کہاں گئے ہیں بھائی؟"

اس نے دریا کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

"وہ تو رات کو ہی دریا پار کر کے بھارت چلے گئے تھے۔ تم کہاں سے آئے ہو؟"

میں نے اس سے پوچھا۔

"وہ کب واپس آئیں گے؟"

اس نے کہا۔

"جب بیراگی دریا پار کر کے بھارت چلے جاتے ہیں تو کئی مہینوں تک واپس نہیں آتے"۔

اور یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میرے پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لئے تھے۔ میرے سورج کی سنہری روشنی مجھے تاریک بادلوں میں تنہا چھوڑ کر مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ میں بے اختیار دریا کی طرف چلنے لگا۔ بانس کے جھنڈوں سے نکلا تو کرنافلی دریا سامنے نظر آنے لگا۔ میں دریا کے کنارے آ کر رک گیا اور دوسرے کنارے کے درختوں کو دیکھنے لگا جو سندر بن کے درخت تھے اور جہاں سے بھارت کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ ایک بادبانی کشتی دریا پر تیرتی ہوئی گزر گئی۔ کشتی کا ملاح بڑی اداس لے میں کوئی لوک گیت گا رہا تھا۔ گیت کے بول میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ ملاح کی اداس آواز نے مجھے اور بھی زیادہ اداس کر دیا۔ وہ شمع میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی جس نے مجھے میری منزلوں کا نشان دکھانا تھا۔

بارش شروع ہو گئی تھی۔ میں بارش میں کھڑا رہا۔ میں دریا کے دوسرے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا جس نے میری روشنیوں کو اپنے اندھیروں میں چھپا لیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ لیکن میری آنکھوں سے قطرے گر رہے تھے شاید یہ بارش کے قطرے تھے، شاید یہ میرے آنسو تھے۔

...